بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

کے

علوم و افکار

تالیف

حضرۃ مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ

بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ناشر

مکتبہ حمیدیہ

فاروق گنج گوجرانوالہ پاکستان

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ
کے
علوم و افکار

تالیف

حضرۃ مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ
بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ناشر
مکتبہ حمیدیہ
فاروق گنج گوجرانوالہ پاکستان

طبع دوم

نام کتاب	----	مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے علوم وافکار
مولف	----	حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ
مطبع	----	زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
تعداد	----	پانچ سو
سرورق	----	سیدالخطاطین سید نفیس رقم مدظلہ
کتابت	----	محمد یوسف اعجاز، ادارہ انیس الکتابت گوجرانوالہ
ناشر	----	مکتبہ حمیدیہ، فاروق گنج گوجرانوالہ
قیمت	----	[illegible] روپے
تاریخ طباعت	----	ربیع الاول [illegible]ھ
ملنے کا پتہ	----	مکتبہ حمیدیہ، فاروق گنج گوجرانوالہ

فہرست مضامین

پیش لفظ (طبع دوم)

ازاحقر محمد فیاض خان سواتی مہتمم مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ

حامداً ومصلیاً۔ والد محترم مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ کی تصنیف لطیف ''مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے علوم وافکار'' طبع دوم قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے جسے مکتبہ حمیدیہ، فاروق گنج گوجرانوالہ نے تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، قبل ازیں اس کا پہلا ایڈیشن ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرت العلوم کی طرف سے سن ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا جس پر ملک کے تمام موقر رسائل وجرائد نے تائیدی اور توصیفی تبصرے بھی شائع کئے تھے، اس کتاب کی اشاعت سے امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے بارے میں پھیلائے ہوئے اپنوں اور غیروں کے الزامات، اتہامات اور غلط بیانیوں کا کافی حد تک دفاع ہوا ہے اور بہت سے علماء، طلباء اور عوام الناس کے اذہان مطمئن ہوئے ہیں فالحمدللہ کثیراً علیٰ ذالک۔

سن ۱۹۸۶ء کی بات ہے کہ حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ اور مولانا معراج الحقؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مشکوٰۃ شریف کے اختتام پر منعقدہ ایک تقریب میں مدرسہ نصرت العلوم تشریف لائے، پروفیسر محمد اسلم مرحوم بھی ان کے ہمراہ تھے، تینوں حضرات نے مشکوٰۃ شریف کے آخری سبق کے اختتام پر تقریریں فرمائیں اور رات قیام بھی مدرسہ نصرت العلوم میں ہی فرمایا اگلے دن صبح ان حضرات نے حضرت والد محترم مدظلہ کی طرف سے دعوت ناشتہ کے موقع پر ہمارے گھر دسترخوان پر مولانا سندھیؒ کو گفتگو کا موضوع بنایا، احقر بھی اس دعوت میں مہمانوں کے خادم کی حیثیت سے شریک تھا، اس دوران حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے یہ انکشاف فرمایا کہ ایک موقع پر جبکہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ پر طعن وتشنیع شروع ہوچکی تھی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ سابق ناظم اعلیٰ جمعیت علمائے ہند نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ ''مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے متعلق مجھے یا تجھے کام کرنا چاہیے تھا، ان کے شاگردوں نے ان کی صحیح ترجمانی نہیں کی، ہم ان کے حالات سے باخبر تھے اور ہم ہی ان کی صحیح ترجمانی کرسکتے تھے'' چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ تو وقت کی کمی اور گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے تاحیات یہ کام انجام نہ دے سکے البتہ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے مولانا سندھیؒ پر اعتراضات کا کچھ جائزہ ضرور لیا ہے جس کا تذکرہ اسی کتاب کے آئندہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، لہٰذا یہ کہنا اور لکھنا بالکل بجا ہے کہ مولانا سندھیؒ پر اکثر اعتراضات کے پس منظر میں ان کے شاگرد یا وہ ناقلین اور مرتبین ہیں جنہوں نے ان کی صحیح ترجمانی نہیں کی، ایسے لوگوں نے اپنے افکار ونظریات کو گڈمڈ کرکے مولانا سندھیؒ کی

طرف منسوب کر کے شائع کر دیا ہے جس سے مولانا سندھیؒ جیسی باجروت شخصیت پر ہرایرے غیرے کو دشنام طرازی کا موقع ملا، اس بات کی توثیق آپ اس تحریر سے بھی کر سکتے ہیں کہ جب حضرت مولانا منظور نعمانیؒ سابق مدیر الفرقان لکھنوا پنے رسالے الفرقان کا ''شاہ ولی اللہ نمبر'' شائع کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے سن ۱۹۴۱ء میں مولانا سندھیؒ سے بھی اس میں ایک مضمون لکھنے کی درخواست کی، یہ مولانا سندھیؒ کی حیات کے آخری دور کا واقعہ ہے جس سے اس پراپیگنڈہ کے بادل بھی چھٹ جاتے ہیں کہ العیاذ باللہ مولانا سندھیؒ آخر میں پاگل ہو گئے تھے، ہر ذی شعور انسان جانتا ہے کہ کسی پاگل سے مضامین لکھنے کی درخواست نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ حضرت سندھیؒ نے مولانا منظور نعمانیؒ کو ایک ضخیم مقالہ قلمبند کرایا جو اس وقت ''الفرقان'' میں طبع ہوا بعد ازاں افادیت واہمیت کے پیش نظر وہ مقالہ مستقل کتابی شکل میں بھی شائع ہوا، اس مقالہ کو قلمبند کراتے وقت مولانا سندھیؒ نے اپنی تحریرات کیلئے جو اصول لکھوایا وہ تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے، مولانا سندھیؒ نے لکھوایا۔

''جن دیانت دار اہل علم کو میرے مضمون کے کسی حصہ سے اختلاف ہو وہ مجھ سے مل کر سمجھنے کی کوشش کریں اور ''تحریر بازی'' کے پھیر میں نہ پڑیں، میں اس قسم کی کسی چیز کا جواب تحریر سے نہیں دوں گا نیز مولانا (سندھیؒ) کا اعلان ہے جو بات میں ایسی کہوں جس کو حضرت شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے مستفیضین تا مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے یہاں نہ دکھا سکوں، میں اس کو ہر وقت واپس لینے کیلئے تیار ہوں، میں ان اکابر کے علوم سے باہر نہیں جاتا اگر فرق ہوتا ہے تو صرف تعبیر کا (انتہی بلفظہ) (نگاہ اولین، شاہ ولی اللہ نمبر الفرقان بریلی ص ۳ تا ۴) نیز ایک اور جگہ حضرت سندھیؒ لکھواتے ہیں ----

''بعض ایسے مواقع بھی ملیں گے کہ میری سند مولانا شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے کلام میں ملے گی، شاذ و نادر باتیں ایسی ہوں گی جو خود میرے فکر کا نتیجہ ہیں، میں ایسے موقع پر صراحۃً بتا دیا کرتا ہوں کہ یہ میری سوچی ہوئی بات ہے، اس کا رد و قبول ہر وقت سامع کے اختیار میں ہے۔ (شاہ ولی اللہ نمبر الفرقان بریلی ص ۲۶۲)

قارئین کرام یہ ایسے جاندار اور جامع اصول ہیں کہ مولانا سندھیؒ کی تمام تحریرات کو اس کسوٹی پر، پرکھا جا سکتا ہے جو اس کسوٹی پر پورا اتریں، وہ ان کی تحریرات سمجھی جائیں اور جو اس پر پورا نہ اتریں وہ ان کے افکار و نظریات قطعاً نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے کرم فرماؤں کے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت نصیب فرمائے اور اکابر و اسلاف کے خلاف بدگمانی جیسے گھناؤنے جرم سے ہمیشہ محفوظ رکھے آمین یا الٰہ العالمین۔

احقر محمد فیاض خان سواتی۔ ۱۱ صفر ۱۴۲۳ھ/۲۴ اپریل ۲۰۰۲ء

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اَمّا بعد ۔

یہ مقالہ کوئی مستقل کتاب نہیں جس کو منظم طریق پر اور ترتیب سے لکھا گیا ہو حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے بارے میں بعض لوگوں نے غلط قسم کے تصورات قائم کیے ہیں اور بعض غلط باتیں ان کی طرف منسوب کی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۳ء میں احقر نے جب ان لوگوں کے ان خیالات کو پڑھا تو دل پر بڑا صدمہ ہوا اور اس وقت ترجمان الاسلام میں ایک مختصر سا مضمون احقر نے لکھ کر شائع کرایا۔ اس مضمون میں کچھ عبارتیں مولانا سندھیؒ کی تحریرات سے احقر نے جمع کر دی تھیں۔ اس سے غرض مولانا سندھیؒ کا دفاع تھا۔ اب قریب زمانہ میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا وہ کتابچہ جو انہوں نے مولانا سندھیؒ کے رد میں لکھا تھا۔ اسے دوبارہ شائع کیا گیا اور پھر مولانا سندھیؒ کی تنقیص و تحقیر شروع ہوگئی۔ بعض احباب نے احقر سے ذکر کیا کہ وہ مضمون جو آپ نے مولانا سندھیؒ کے بارے میں لکھا تھا اسے دوبارہ شائع کرنا چاہیے میں نے کہا شائع کر دو، وہ بہت مختصر ہے۔ اس سے مولانا مرحوم کا پوری طرح دفاع نہیں ہوتا۔ اس لیے احقر نے نظر ثانی کر کے مولانا کے بارے میں خود ان کی کتب و تحریرات اور بعض ان کے تلامذہ کی تحریرات سے یا مولانا کی املائی تحریرات سے اخذ کر کے ایک مقالہ بنا دیا۔ اس مقالہ کی اصل بنیاد وہی مضمون ہے جو ہفت روزہ ترجمان الاسلام لاہور جمعہ ۲۲، ۲۹ شعبان ۱۳۹۳ھ بمطابق ۲۱، ۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں اس مضمون کو بعینہٖ پہلے لکھا گیا ہے اور اس کے ساتھ مزید عبارات جمع کر دی گئی

ہیں، نیز عبارات سے بغرض سہولت عنوانات اخذ کر کے لکھ دیے ہیں اور ایک غیر مرتب شکل میں حاضرین کے سامنے پیش ہے۔ اکثر عبارات حضرت سندھیؒ کی ہیں بعض اپنے الفاظ میں ان کی ترجمانی کی گئی اور بعض باتیں دوسری کتب سے جو مولانا سندھیؒ کے بارے میں دیگر حضرات نے تحریر کی ہیں۔ ان کو درج کر دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ مولانا مسعود عالم کے رسالہ کا رد نہیں ہے۔ اس کا مشبع رد مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے اُسی دور میں کر دیا تھا جو "مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے ناقدین" کے نام سے شائع ہوا تھا جو حضرات مولانا مسعود عالم کے کتابچہ کے جواب کے خواہاں ہیں۔ وہ مولانا اکبر آبادیؒ کی کتاب ملاحظہ فرمائیں۔ احقر نے تو صرف مولانا سندھیؒ کے دفاع میں خود حضرت سندھیؒ کی زبان یا تحریر سے جو باتیں علم میں آئیں وہ درج کر دیں اور بعض رجال پر کچھ نقد بھی کیا ہے۔ مولانا کا ذہنی پس منظر اور ان کے افکار و عقائد اور ان کے علمی کارنامے اور ان کے عملی اقدامات کے بارے میں کسی قدر روشنی اس مقالہ سے حاصل ہوگی اور وہ غلط فہمیاں جو لوگ ان کے بارے میں عمداً یا نا فہمی کی بنا پر پھیلاتے ہیں۔ ان میں کمی ہوگی تمام باتوں کے بارے میں پوری تفصیلات کی نہ تو احقر میں ہمت ہے کہ ان کو جمع کیا جائے اور نہ فرصت دوسرے حضرات اگر چاہیں تو اس سلسلے میں پوری تفصیل سے بھی کلام کر سکتے ہیں۔ مولانا سندھیؒ کی دینی، علمی، سیاسی خدمات ایک بڑا وسیع میدان ہے اور اس کے آثار بھی بہت ہیں۔ اہلِ علم بہت سی ان غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں کا پردہ چاک کر سکتے ہیں اور حقیقت حال کو پوری طرح سامنے لا سکتے ہیں۔ احقر نے بہت ہی اجمال سے مولانا سندھیؒ کے دفاع میں یہ چند باتیں ذکر کر دی ہیں اور مولانا کے پروگرام کو بھی اجمالی طور پر ذکر کر دیا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حق پرستوں کے ساتھ رکھے اور انہیں کے ساتھ حشر فرمائے آمین۔ واللہ الموفق والمعین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے چند افکار

یہ باب ہفت روزہ ترجمان اسلام ۲۲، ۲۹ شعبان ۱۳۹۳ھ بمطابق ۲۱، ۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو بعینہٖ شائع ہو چکا ہے۔

اس مضمون کا باعث درحقیقت نوائے وقت ۱۳ دسمبر ۱۹۷۲ء کا پرچہ ہے جس میں کسی نامعلوم شخص نے "ایک وطن دوست کے قلم سے" پروفیسر محمد سرور صاحب کی کتاب "افادات وملفوظات مولینا عبیداللہ سندھیؒ پر ایک نظر" پر تبصرہ کیا ہے پروفیسر محمد سرور کی کتاب میں پیش کردہ پورا مواد مجموعی طور پر صحیح ہے یا غلط، یہ تو الگ بات ہے۔ ہمیں بھی ان کے پیش کردہ افکار سے کلی اتفاق نہیں۔ لیکن تبصرہ نگار نے جس طرح مولینا سندھیؒ پر ظلم ڈھایا ہے۔ اس پر دل بہت افسردہ ہوا۔ کاتب الحروف کو حضرت مولانا سندھیؒ کی زیارت تین بار نصیب ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ لاہور میں اور دو مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں اور ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ کا کچھ بیان بھی سننے کا موقع ملا ہے۔ حضرت مولاناؒ دیوبند تشریف لائے اور حضرت مدنیؒ کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے، جب دارالعلوم دیوبند کی فوقانی منزل جہاں دارالحدیث ہے پہنچے تو حضرت مدنیؒ

اہتمام کی طرف حاضری کے لیے تشریف لے گئے، تو راستہ میں حضرت مولانا سندھیؒ کو طلباء نے روک لیا۔ مولوی عبدالعزیز افغانستانی نے حضرت سندھیؒ سے عرض کیا کہ حضرت ہم کو کچھ نصیحت فرمائیں۔ مولانا یہ بات سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا تمہارے لیے "نصیحت موت ہے موت" پھر کچھ دیر خاموش رہے اور جب غصہ کم ہوا تو تقریر شروع کر دی اور فرمانے لگے کہ اگر دنیا میں زندہ رہنا ہے تو اپنے صحیح مقصد کے لیے قربانی کرنا سیکھو، پھر فرمایا کہ قرآن کریم کے نزول کے زمانہ میں جو لوگ جہاد سے گریز کرتے تھے قرآن نے ان کو منافق کہا ہے اور فرمایا ہے قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ (جمعہ) اور تم لوگ جو قربانی اور موت سے گریز کرتے ہو، کیسے پکے مسلمان ہو! احقر نے حضرت مولانا سندھیؒ کی کتابوں، مقالات اور تحریروں کا جہاں تک دستیاب ہو سکی ہیں، مطالعہ کیا ہے اس لیے خود مولانا سندھی کی کتابوں اور تحریروں سے ان کے چند اہم افکار پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ یہ زیادہ تر خود مولانا کے الفاظ ہی ہیں اور کچھ عربی سے اردو میں ترجمہ کر کے ناظرین کرام کے سامنے پیش کر دیے ہیں، تاکہ ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔ اس تبصرہ نگار نے بزعم خویش ملت اسلامیہ کے ایک عظیم فرزند اور دین اسلام کے جانثار خادم پر کیسے رکیک حملے کیے ہیں اور کس دیدہ دلیری، شوخ چشمی بلکہ بے حیائی سے غلط باتیں منسوب کی ہیں، بلکہ العیاذ باللہ مولانا کو مرتد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تبصرہ نگار نے مولانا کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے اہم باتیں یہ ہیں:۔

۱۔ وہ لاشعوری طور پر اسلام کی اساسی اور فکری نظریات سے باغی ہو گئے اور انہوں نے اپنے دور کی عالمی تحریک کمیونزم اور سوشلزم کو اپنا لیا۔

۲۔ اس تبصرہ نگار نے خالد لطیف گابا کا ذکر کیا ہے کہ وہ اسلام اختیار کرنے کے بعد اپنے مسلمان دوستوں کے طرز عمل سے تنگ آ کر پھر ہندو ہو گیا اور بھارت چلا گیا اور

پھر مولانا سندھیؒ کے متعلق لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی نفسیاتی یا ذہنی کیفیت سے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم بھی دوچار ہوئے ہوں اور وہ اپنے آبائی مذہب سکھ مت کی طرف لوٹنے کی بجائے پکے نیشنلسٹ بن گئے۔

۳۔ مگر مولانا سندھی مرحوم اس نظریہ (وحدۃ الوجود) کو محض اس وجہ سے اپناتے ہیں کہ یہ ہندوؤں کے نظریے ویدانت اور پرانک کے قریب ہے۔

۴۔ اور بالآخر اپنی تسکین دل کے لیے انہوں نے روس کے کمیونزم میں پناہ ڈھونڈی اور کمیونزم کے نظریہ میں توحید کو ملا کر اسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ضامن مانا!

تبصرہ نگار کی تحریر میں یہ بدنما قسم کا الزام سراسر غلط اور بے بنیاد اتہام حضرت مولانا سندھیؒ پر لگایا گیا ہے۔ اس لیے اس کا نوٹس نہ لینا اور اللہ تعالیٰ کے ایک مقبول بندہ کی طرف سے دفاع نہ کرنا افسوسناک ہوگا۔ اس لیے مولانا کے افکار و خیالات پیش کرنا ضروری ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا سندھیؒ کے بعض افکار شاذ بھی ہیں۔ بعض مرجوح قسم کے خیالات بھی ہیں اور بعض باتیں ایسی ہیں کہ مولانا ان پر بے جا سختی بھی کرتے تھے۔ بعض باتیں مصلحت کی خاطر بھی ناگزیر خیال کرتے تھے اور بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کی نسبت ان کی طرف کرنے میں ان کے تلامذہ نے غلطی کی ہے اس کی ذمہ داری حضرت مولانا پر نہیں، بلکہ ان کے ناقلین پر ہے جنہوں نے ان باتوں کو نقل کیا ہے اور شاید سابق لاحق سے قطع نظر کر کے حضرت مولانا سندھیؒ کا مطلب بھی نہیں پا سکے۔ بہرحال خیالات و افکار کا شذوذ تو ہر مجتہد اور محقق میں پایا جاتا ہے لیکن بایں ہمہ مولانا سندھیؒ اپنے مسلک، عقیدہ، اور عمل کے لحاظ سے پکے سچے راسخ العقیدہ اور پُرجوش مسلمان تھے۔ مجسم انقلاب اور نہایت ہی حساس دل رکھنے والے اولوالعزم شخصیت کے مالک تھے، توکل و قناعت کے درجہ عالیہ پر فائز تھے ذاکر شاکر تھے، ان علماء ربانیین میں سے تھے جو ظاہر و باطن کے کمالات سے

متصف ہوتے ہیں، خدا پرست تھے، فکر عالی رکھتے تھے، عالم باعمل تھے، جن کا علم عمیق فہم دقیق اور فکر انیق تھا۔ سیاست و انقلاب کے امام تھے۔ مطالعہ نہایت وسیع تھا ذہانت تو خدا تعالیٰ نے خوب ہی عطا فرمائی تھی، مشرق میں برٹش ایمپائر جن لوگوں سے شدید خائف تھا، ان میں سے ایک تھے، دیوبندی جماعت میں بڑا نمایاں مقام رکھتے تھے تمام زندگی رضائے حق اور اسلام کی سربلندی کی خاطر بسر کی اور اس راستے میں بڑی سے بڑی مصیبت اور تکلیف کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور ان کے قدم اس راستے سے کسی وقت بھی متزلزل نہیں ہوئے۔ مولانا مجاہد اور غازی تھے، انگریز کے دشمن تھے اسلام کے محقق عالم تھے۔ قرآن کے عظیم مفسر تھے، بلکہ ہمارے موجودہ دور میں قرآن کریم کو نئے ماحول میں جس طرح سمجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور جو انداز تفہیم مولانا سندھیؒ کا تھا شاید ہی کوئی دوسرا عالم ان کی برابری کر سکتا ہو، حکمت ولی اللہی کے ماہر امام تھے عمر بھر قرآن کریم اور شاہ ولی اللہؒ کے فلسفے کا مطالعہ جاری رکھا اور اس میں مہارت تامہ حاصل کی مسلمانوں کا زوال اور انحطاط ہر وقت ان کو بے چین رکھتا تھا۔ وہ اپنی تمام توانائیاں اس بات پر صرف کرتے تھے کہ مسلمان از سر نو اسلام کی صحیح تعلیمات کی طرف پلٹ آئیں اور اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے اقوام عالم میں حاصل کر سکیں۔ مولانا اسلام لانے کے بعد سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے جو اپنے وقت کے جنیدؒ تھے اور قادری راشدی طریقہ کے بہت بڑے امام تھے۔ ان سے تربیت اور فیض حاصل کیا، پھر ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند پہنچ کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ جیسے خدا پرست اور عظیم المرتبت عالم دین اور شیخ کامل سے تعلیم حاصل کی پھر گنگوہ پہنچ کر اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور سب سے بڑے فقیہہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے علم حدیث پڑھا اور حکمت ولی اللہی کی خصوصی تعلیم اور سیاسیات اسلامیہ کی تربیت مولانا شیخ الہندؒ سے حاصل کی اور جب تک مولانا ہند میں رہے۔

(۱۹۱۵ء تک) تو حضرت شیخ الہندؒ کی نگرانی میں سیاسیات میں کام کرتے رہے اور علماء کی تعلیم و تربیت اور دیوبندی جماعت کی تنظیم میں مصروف رہے۔ دارالعلوم کی ترقی میں خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے اور انصار الاسلام کی نظامت اور پھر نظارۃ المعارف جیسے وقیع ادارہ کا قیام اور اس کے ذریعے مسلمانوں کی دینی و ملی اور سیاسی خدمت اور دین اسلام کی ترقی اور بقاء و استحکام کے لیے ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف رہے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے خصوصی طور پر انتظام کیا۔ پھر ہندوستان سے باہر جا کر افغانستان کی آزادی کے لیے کام کرنا اور بالآخر اس میں کامیاب ہو جانا اور انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی خوفناک سکیمیں بنانا، یہ سب ایسے کام ہیں، جو تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیں گے۔ اگر روسی اشتراکیوں کے پاس بیٹھ کر مولانا نے اپنی معلومات میں اضافہ کیا یا اشتراکی نظام کے بارے میں معلومات حاصل کیں یا یورپین اقوام سے ملاقاتیں کیں اور ان کے معاشی نظاموں کو سمجھنے کی کوشش کی یا بعض بہتر باتوں کو اپنانے سے گریز نہیں کیا، تو یہ باتیں اگر عیب کی باتیں ہیں تو پھر کہنے والا کوئی بدنصیب اگر یہ کہے کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بھی اپنے دور کے مسلمانوں سے دل برداشتہ ہو کر اپنے آبائی مذہب برہمن ازم کی طرف لوٹ جانے کے بجائے مغرب کے فلاسفروں کے دامن میں پناہ لی اور مغرب کے فلاسفر کے نظریات کو اپنا کر اپنے فارسی اور اردو کلام میں سمو کر مسلمانوں کے حلق سے دو قومی نظریہ کی شکل میں اتارنے کی کوشش کی۔ کیا کوئی عقل مند، دانشور، صاحب علم جس نے اقبال مرحوم کا کلام پڑھا ہو اس بات کو باور کر سکے گا۔ حالانکہ ڈاکٹر مرحوم نے تو مغربی فلاسفروں سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور بہت کچھ متاثر بھی ہوئے ہیں اس سے کہیں عشر عشیر بھی مولانا سندھیؒ اشتراکیوں کے خیالات سے متاثر نہیں ہوئے افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ محبت اور نفرت میں انتہا پسند

واقع ہوتے ہیں، یہ اپنے مخالف کو بالکل دوسری انتہا تک پہنچانے سے قبل کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے بے شک ع

حبك الشيئ يعمي ويصم!

وبغضك الشيئ يعمي ويصم!

اسی طرح نظریہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کو متحدہ قومیت اور دو قومی نظریہ کی شکل میں پیش کرنا انتہائی احمقانہ بات ہے۔ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود تو ارباب تصوف و سلوک اور اصحاب حقائق و معارف کے ہاں صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ شیخ ابن عربیؒ اور دوسرے اکابر اس نظریہ کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ نے اگرچہ وحدۃ الشہود کے نظریہ پر زور دیا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ نے ان دونوں نظریات کو باہم تطبیق دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا ہے کہ یہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے حقیقت کا اختلاف نہیں۔ تبصرہ نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں اسلامی نظام کے عظیم علمبردار شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ جو اولاً سکھوں کے ساتھ اور پھر انگریز اور دیگر اقوام کے ساتھ جہاد و قتال کر کے اسلامی نظام حیات اور نظام خلافت راشدہ کو قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ بھی نظریہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک خالص علمی اور روحانی نظریہ کو سیاسی نظریات میں لا کر وقتی اور ہنگامی رستخیز میں ملوث کر دیا گیا۔ یہ اگر بد دیانتی نہیں تو جہل عظیم ضرور ہے۔ اگر ہندو اس نظریہ کو مانتے ہیں تو اس میں کون سی قباحت ہے۔ کیا علمی اور نظریاتی تصوریاں اقوام میں مشترک نہیں ہوتیں۔ یہ کوئی شریعت کا نظریہ تو نہیں۔ فکری اور عقلی یا تجرباتی نظریات بہت سی اقوام میں مشترک بھی ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ نظریہ وحدۃ الوجود بھی ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے تلامذہ پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں کہ

وہ مولینا کے متعلق غلط بیانی کرنے والوں کو جواب دیتے اور ان کی پوزیشن کو صاف کرتے، لیکن ان لوگوں نے عام طور پر سرد مہری دکھائی ہے۔ اس لیے میں نے مولانا کے یہ افکار ان کی اپنی تحریروں یا املائی تحریروں سے اخذ کرکے ناظرین کرام کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ ناظرین دیکھ کر خود انصاف کریں اور اگر ممکن ہو تو اصل کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ انہیں معلوم ہوگا کہ حضرت مولینا عبید اللہ سندھی کس قسم کے بزرگ تھے۔

افکار

(۱) ہم پر (جو قرآن کریم کو ماننے والے ہیں) قطعی طور پر لازم ہے کہ ہم تمام اقوامِ عالم کے سامنے ثابت کر دیں کہ انسانیت کے ہاتھ میں قرآن کریم سے زیادہ درست اور صحیح کوئی پروگرام نہیں۔ پھر ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی جماعت کو منظم کیا جائے۔ خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہم ان کی کسی اور حیثیت کی طرف نہ دیکھیں، بجز قرآن کریم پر ایمان لانے کے پس ایسی جماعت ہی مخالفین پر غالب آئے گی، لیکن ان کا غلبہ انتقامی شکل میں نہیں ہوگا، بلکہ ہدایت اور ارشاد کے طریق پر ہوگا۔ جیسا کہ والد اپنی اولاد پر غالب ہوتا ہے۔ اب اس نظام کے خلاف جو بھی اُٹھ کھڑا ہوگا۔ وہ فنا کر دینے کے قابل ہوگا۔"

(ترجمہ از الہام الرحمٰن)

۲۔ "ظالم بزدل ہوتے ہیں اور لڑائی میں شجاعت کے ساتھ موصوف وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو عادل ہوں اور قتال فی سبیل اللہ صرف عادل ہی کر سکتا ہے۔ ہم نے یہ بات سمجھی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ جو شخص چاہتا ہے کہ وہ عزیز اور محترم ہو۔ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر ممکن طریق پر سعی اور کوشش کرے ایسی حکومت کی تشکیل میں جس کی بنیاد ایسے قانون پر ہو جس کے بارے میں اس کو یقین ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور یہ سعی یقیناً اس شخص سے ہی ممکن ہوگی۔ جو عدل کو

پسند اور ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور جوامت (جماعت) بھی عدل کے نقطۂ نگاہ سے تشکیل پائے گی، تو ایسے لوگ ہی دنیا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔" (الہام الرحمٰن)

۳۔ میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بے شک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر اُبھرے گا، لیکن خارج میں اس کا ڈھانچہ وہ نہیں رہے گا جو اس وقت ہے۔" (ذاتی ڈائری ص ۳۲)

۴۔ "مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے مسلمانوں کی داء عضال (لاعلاج بیماری) شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کے مطابق دو چیزوں کو قرار دیا ہے (۱) قرآن کریم کی حکمتِ عملی سے روگردانی (۲) دولت و ملت کے تمام اخلاقی اور عملی مفاسد کا مرجع اور مدار اقتصادی عدم توازن کو قرار دیا ہے۔" (حزب ولی اللہ کی اجمالی تاریخ ص ۲۱)

۵۔ "جو امت قرآن کریم کا پروگرام نہیں اپنائے گی۔ وہ کبھی کامیاب نہ ہو گی۔ مسلمان قرآن کی عالمی تنظیمی دعوت کا پروگرام لے کر اُٹھے اور پھر وہ اپنی اس تنظیمی دعوت میں کامیاب ہو گئے اور یہ صرف پچاس سال کی مدت یعنی واقعہ صفین کی تحکیم تک ہوا اب جب کوئی امت اپنی تنظیمی دعوت لے کر اُٹھے گی، تو وہ کبھی بھی کامیاب نہ ہو گی جب تک وہ قرآن کے پروگرام کو نہ اپنائے۔ ہم نے یہ بات تحقیق سے دریافت کی ہے اور موجودہ دور میں عالمی تحریکات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارا ایمان اس بات پر پختہ ہو گیا ہے۔ لوگ بالعموم یہ جانتے ہیں کہ روسی انقلاب فقط ایک اقتصادی انقلاب ہے۔ ادیان اور حیات اخروی سے بحث نہیں کرتا اور ہم ان روسیوں کے پاس بیٹھے ہیں اور ان کے افکار و خیالات ہم نے معلوم کیے ہیں اور ہم نے بتدریج اور آہستہ آہستہ نرمی اور لطافت سے امام ولی اللہؒ کا پروگرام جو انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں پیش کیا۔ ان روسیوں کے سامنے رکھا، تو انہوں نے اسے نہایت ہی مستحسن خیال کیا اور ہم سے پوچھنے لگے کہ کیا کوئی جماعت اس وقت ایسی ہے جو اس پروگرام پر عمل کرتی ہو۔

جب ہم نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے۔ اگر کوئی جماعت اس پروگرام پر عمل کرنے والی ہوتی، تو ہم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور ہم بھی ان میں داخل ہو کر ان کا مذہب اختیار کر لیتے اور یہ بات ہمارے لیے آسانی بنا دیتی۔ ہماری ان مشکلات کو جنہوں نے ہمارے پروگرام کو کسانوں میں نافذ کرنے سے روک رکھا ہے۔

یہ ان روسیوں کی بات کا بلاکم وکاست اور بغیر تحریف کے خلاصہ ہے۔ اس کے بعد مجھے یقین ہوا کہ یہ لوگ ہمارے قرآنی پروگرام کو قبول کرنے کی طرف مجبور رہوں گے۔ اگرچہ ایک زمانہ کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ ہم آج کے دور میں عالمی تحریکوں میں سے کسی تحریک کو ایسا نہیں پاتے کہ وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف اور مناقض ہو۔ جس طرح انقلابی روس کی تحریک قرآنی پروگرام کے مناقض اور مخالف ہے اور باوجود اس کے کہ وہ بھی مجبور اور مضطر ہیں کہ قرآن اور اس کے پروگرام کی طرف رجوع کریں۔ باقی تحریکات کا کیا پوچھنا اور اسی چیز نے میرے ایمان میں زیادتی اور قوت پیدا کر دی ہے کہ ہدایت اور فلاح قرآن کے نزول کے بعد صرف قرآن کریم کے اتباع پر ہی موقوف ہے۔" (الہام الرحمن ص)

۶۔ جب کوئی قوم ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جو نبی کے واسطے سے ملاءِ اعلیٰ کی جانب سے نازل ہوتی ہے اور اس پر عمل کرنے کا پختہ عزم کر لیتی ہے تو ملاءِ سافل کے ملائکہ اپنی جبلت سے مجبور ہوتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کی مدد کریں اور امداد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ملائکہ ان لوگوں کے دلوں میں فتح وکامرانی کے خیالات ڈالتے ہیں اور کفار ومخالفین کے قلوب میں شکست وہزیمت کے خیالات اُٹھاتے رہتے ہیں۔ مؤمنین کے حق میں اللہ تعالیٰ کی تائید ملائکہ کے ذریعے اس وقت ہوتی ہے جب وہ عمل کرنے کا پختہ عزم اور مؤکد ارادہ کر لیتے ہیں، چنانچہ بدر میں اس طرح ہوا تھا اور اُحد میں اس کے برخلاف واقعہ ہوا۔ جب کہ مجاہدین کے دلوں میں ہزیمت اور کمزوری کے خیالات سرایت کر گئے۔ یہ ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے جو ان سے سرزد ہوئی تھیں

اس لیے تائید الٰہی سے اس موقع پر محرومی ہوئی۔ یہ چیز قیادت کی بے تدبیری کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ قیادت تو اُس وقت خدا تعالیٰ کے سب سے بڑے رسول خاتم الانبیاءؐ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس دن بڑے عظیم کام انجام دیے اور لوگوں کے لیے مستقل دستور وقانون بنا دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ آیا شہر سے باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کیا جائے یا شہر کے اندر ہی رہ کر شہر کی دیواروں کی پشت پناہی سے دشمن کے ہجوم کا مقابلہ کیا جائے۔ لوگوں کے خیالات مختلف تھے۔ اکثر نوجوان اور کچھ عمر رسیدہ لوگ (یہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو پیچھے رہ گئے تھے) اس حق میں تھے کہ شہر سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور اس کے حملے کو روکا جائے اور اکثر شیوخ کی رائے تھی کہ شہر کے اندر ہی رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے مبارک ظاہر نہیں کی تھی تاکہ لوگ آزادی کے ساتھ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک شیوخ کی رائے کے موافق تھی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو جانتے تھے کہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں اور ممکن ہے کہ شہر سے باہر نکلنے پر دشمن ان کو حقیر نہ خیال کرنے لگ جائیں لیکن اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اکثریت کی رائے باہر نکلنے کی ہے، تو آپ نے اسی رائے کو اختیار فرمایا اور اپنی پہلی رائے ترک کر دی، کیونکہ اکثریت کی رائے تھی۔ اگر دیکھا جائے تو تمام روئے زمین پر یہ شوریٰ کا بہترین نمونہ اور قانون ہے۔ ہم نے اس سے بہتر کوئی قانون نہیں دیکھا، لیکن افسوس کہ مسلمانوں کا ایسے شوریٰ سے اعراض معروف ہے اور بعد میں مسلمانوں نے اس شورائی نظام کی حفاظت نہ کی۔ اس کے برخلاف استنجاء کے ڈھیلوں کو خوب یاد رکھا اور نتیجتہً اس سے اپنی حکومتوں کی بنیادوں کو متزلزل کیا اور اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اپنی سلطنتوں کے ستون گرا دیے۔ اور پھر مستبد لوگ برسر اقتدار آگئے جس سے اسلام کی اجتماعیت باطل ہو کر رہ گئی، بلکہ

اجتماعیت کو سرے سے ہی انھوں نے گم کر دیا" (الہام الرحمٰن ص ۹۲ ج ۲)

۷۔ خلافت اور رئیس کے باب میں صحیح نظریہ یہ ہے کہ خلافت تین باتوں کی طرف تقسیم ہوتی ہے۔

۱۔ خلافت بغیر جماعت کے قائم نہیں ہو سکتی۔

۲۔ رئیس صرف اس جماعت میں سے ہو سکتا ہے۔

۳۔ رئیس کا انتخاب صرف یہ ہی جماعت کر سکتی ہے۔ براہِ راست عوام اس کا انتخاب نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ چیز بالآخر نزاع و فساد، تنازع و جھگڑا کا رُخ اختیار کر لیتی ہے ہمارے نزدیک اس معاملے کا صحیح رُخ یہ ہے کہ جب امم مسلمہ میں سے کوئی امت یا جماعت ایسے آدمی کو آگے بڑھاتی ہے جو۔

۱۔ کتاب اللہ کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریقوں اور آپ کی سنّت و تعلیمات کو سب سے زیادہ جانتا ہو۔

۳۔ خلفائے راشدین کے حالات کو سب سے زیادہ جانتا ہو۔

۴۔ ضرورت کے وقت مصلحت خاصہ کے مقابلہ میں مصلحت عامہ کو زیادہ ترجیح دینے والا ہو۔ یعنی مصالح خاصہ کو مصالح عامہ کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ قربان کرنے والا ہو، تو ایسا شخص مرکز میں اپنی امت کے لیے نمونہ (نمائندہ) ہوگا اور جب اس قسم کے بہت سے نمائندے مرکز میں جمع ہوں، تو ایک خاصی صالح جماعت مجتمع ہو جائے گی اور اقوام کی اجتماعیت بن جائے گی اور یہ اجتماعیت (جماعت) کتاب اللہ کے اوامر کی تنفیذ کے لیے مسئول ہوگی (یعنی قرآن کریم کے قوانین جاری کرنا اس جماعت کی ذمہ داری ہوگی) اور جو قوم ایسی نمائندہ جماعت نہ بنا سکی تو اس کی ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں، خواہ وہ اپنی ماضی

کی تاریخ کے پیشِ نظر یدرم سلطان بود کہنے والی ہو یا اپنی باطل آرزوؤں میں مگن ہو
جب ہم نے کتاب اللہ میں غور کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے
خلفاء کے حالات میں غور کیا تو ہمیں یہ بات معلوم ہوئی "اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ
مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ" (توبہ)
اس مرکزی جماعت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ہمیں معلوم ہوا کہ درحقیقت یہی
جماعت تھی جس نے قرآن حکیم کے اوامر قوموں پر نافذ کیے اور اپنی کوششوں میں
کامیاب ہو گئے۔ یہی لوگ خلفاء اللہ فی الارض ہیں۔ یہی جماعت جب اپنے
درمیان کسی کو اپنے رئیس کے منصب پر منتخب کرتی ہے تو اس کو خلیفہ کہتے ہیں جب
ایک خلیفہ فوت ہو جاتا ہے تو یہی جماعت دوسرے رئیس کو اس منصب کے لیے منتخب
کر لیتی ہے۔ امت کے افراد کو اس کے انتخاب میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ ہاں امت یہ کر
سکتی ہے کہ کسی نمائندہ کو منتخب کر کے اس مرکزی جماعت کا رکن بنا لے۔ چنانچہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم تو مدۃ الحیات خلیفۃ الخلفاء تھے، لیکن آپ کے بعد اس جماعت
نے حضرت صدیق رض، عمر فاروق رض، عثمان غنی رض کو اسی طرح منتخب کیا۔ خلیفہ کا نصب وعزل اسی
جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ اب اگر امم اسلامیہ میں سے کوئی امت چاہتی ہے کہ کتاب اللہ
کے اوامر کا نفاذ ہو سکے تو ایسی مرکزی جماعت اسی طریق پر تشکیل دے۔ ہم دیکھتے
ہیں کہ ہندوستانی (پاکستانی) افغانی تورانی عربی یہ سب لوگ شرعی سلطنت کو پسند کرتے
ہیں، لیکن ایسی حکومت کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ باوجودیکہ اوامر قرآنیہ کی تنفیذ آج بھی کوشش
کر لے پر امم مسلمہ سے ممکن ہے۔ اگر سعی وکوشش ہی نہ کی جائے تو پھر کس طرح ممکن ہو سکتا
ہے کہ یہ اوامر نافذ ہوں۔ درحقیقت ان اوامر کی تنفیذ کے راستہ میں رکاوٹ اور مایوسی
اور کوشش نہ کرنا یہ مستبد سلاطین اور فاجر قسم کے ملوک وامراء اور ان کے معاون لوگ
اور عیش پسند علماء کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔" (الہام الرحمٰن ج ۱ ص ۳)

ربٰو: "قرآن کریم میں خلافت الٰہیہ کے قیام سے مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک ایسی قوت پیدا کی جائے۔ جس سے اموال اور حکمت (علم و دانش) دونوں کو لوگوں میں صرف کیا جائے اور پھیلایا جائے۔ اب سودی لین دین اس کے بالکل منافی اور مناقض ہے۔ قرآن کریم کی قائم کی ہوئی خلافت میں ربٰو کا تامل کس طرح جائز ہو سکتا ہے ؟ اس کا جواز تو ایسا ہی ہے جیسا کہ نور ظلمت کا اجتماع۔ ربٰو (سود) سودخواروں کے نفوس میں ایک خاص قسم کی خباثت پیدا کر دیتا ہے جس سے یہ ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اگر یہ خرچ کرتے ہیں تو ان کے سامنے اس کا "اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً" (آلِ عمران ۱۳۰) نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سود کی وجہ سے اقتصادیات میں جو فساد اور اخلاق فاضلہ کی تباہی اور بربادی اور فطرت انسانیہ میں بگاڑ اور لوگوں پر اقتصادی طور پر ضیق و تنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قدر ظاہر باتیں ہیں جن کے بیان کی ضرورت نہیں اسی لیے قرآن عظیم نے سود کو روئے زمین سے مٹانے کا اعلان کیا ہے اور انسانیت کو اس کے لینے دینے والوں کے شر اور ظلم سے چھڑانے کا اعلان کیا ہے۔ سب سے پہلے مواعظ حسنہ کے ذریعے سودی کاروبار سے منع کیا ہے اگر اس سے باز نہ آئیں اور متنبہ نہ ہوں تو پھر ان کے خلاف سخت لڑائی کا اعلان کیا ہے اور ایسے لوگوں کو سطح ارضی سے مٹانے کا چیلنج کیا ہے اور قرآن میں اس کی اساسی تعلیم بڑے محکم طریق پر دی گئی ہے۔ ربٰو سے منع کیا گیا ہے۔ سود خواروں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے، لیکن پوری طرح رشد و ہدایت کے واضح ہونے کے بعد اور اس کی مضرتوں کی پوری طرح کھول کر بیان کر دینے کے بعد یقیناً یہ رشد و ہدایت کے منافی اور خلاف ہے اب اس کے خلاف جنگ یا کارروائی کرنا اکراہ نہیں ہوگا، بلکہ عین انصاف کا تقاضا ہوگا اس طرح ایسی بڑی بڑی حکومتوں کو مٹانا اور منہدم کرنا ہے جو اس لیے منظم کی جاتی ہیں کہ سودی کاروبار کے ذریعے اموال کمائیں۔ ان کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے

اعلان جنگ ہے، لیکن یہ کام جب ہی ہو گا۔ جب کہ مسلمانوں کی انقلابی قوت موجود ہو گی جو عالم میں ایسا کرے گی۔ اب جو آدمی مسلمانوں کو ایسی قوت پر جمع نہیں ہونے دیتا جو اس کی حکمت پر عمل پیرا ہوں تو ایسا آدمی یا بزدل ہو گا جس کو انسانیت کے کسی درجہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا یا جاہل ہو گا، جس کو قرآن کریم کی تعلیم اور حکمت کا علم نہ ہو گا اور نہ اس نے قرآن میں کبھی تدبر کیا ہو گا یا سخت مخالف ہو گا جو قرآنی تعلیمات کی مخالفت کرتا ہے۔ بہرحال جو بزدل اور کمزور ہو گا اس کو ہم کہیں گے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جائے اور جو جاہل ہو گا، اس کو ہم تعلیم دیں گے اور اس کی پوری طرح ان باتوں کی طرف رہنمائی کریں گے۔ جس میں اس کے لیے خیر اور بہتری ہو گی اور جو معاند اور مخالف ہو گا اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے۔ خواہ وہ سلطان ہو جو لوگوں پر تسلط جمائے ہوئے ہے یا دینی رہنما ہو۔" (الہام الرحمٰن ص ج ۱)

"میں مطمئن ہوں کہ اسلام کا احیاء نشاۃِ ثانیہ میں دو اصولوں پر ہو گا۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور جو آدمی ہماری اس بات پر متفق ہو، وہ ہماری جماعت کا فرد ہو گا۔ یہی ایک کلمہ تمام امور کے لیے کفایت کرنے والا ہے۔

(۲) سود (ربوا) کی قطعی حرمت اور اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ اس کو روکنا اور سود کھانے والوں کے خلاف اعلان جنگ کرنا، مسلمان ان دونوں اصولوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔" (الہام الرحمٰن ج۱)

(۹) "جب مسلمان تمام قوموں میں سے ظلم اور جہالت دور کرنے کا پکا ارادہ کر لیں اور اس پر اپنی جان کی بازی لگا دیں تو وہ ضرور غالب آئیں گے۔ یہی انقلاب ہے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد کرے گا اور ان کی انقلابی جماعت چاہے وہ چھوٹی ہی ہو، بہت بڑی ارتجاعی طاقت پر غالب آ جائے گی۔ کیونکہ اس انقلاب کی بنیاد علم، عقل اور عدل پر ہے۔ یہ انقلاب سب لوگوں کو اپنے ساتھ ملائے گا۔ وَيُثَبِّتْ

اَقْدَامَکُمْ" (تمہارے پاؤں مضبوطی سے گاڑھ دے گا) جب تک کوئی چیز سوسائٹی کے صرف عقل مند طبقے میں رہتی ہے اور عوام میں نہیں آتی، وہ پائیدار نہیں ہوتی، لیکن جب وہ عوام میں گھر لیتی ہے وہ پائیدار اور مضبوط ہو جاتی ہے"۔ (قرآنی انقلاب اور جنگ ص۱۵)

(۱۰) "ہمارے زمانے میں جب وہ مکمل نظام موجود نہیں جس کے بل بوتے پر جہاد کی تحریک ملک میں جاری کی جا سکے۔ جہاد کا ایسا نظام پیدا کرنے کی تیاری کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود جہاد پس اب ہر ایک عالم و عامی کا فرض ہے کہ وہ قرآن حکیم کو غالب کرنے کے لیے لادینیت کی ہر شکل کے خلاف انقلاب لانے کی پوری پوری کوشش کرے اور اگر اس میں اسے مال و جان کا نقصان برداشت کرنا پڑے تو برداشت کرے"

(جنگ انقلاب ص۸۱)

(۱۱) "کہ دنیا سے ظلم کو دور کیا جائے۔ چاہے کسی شکل میں ہو اور اسے دور کر کے قرآن حکیم کی حکومت پیدا کی جائے۔ مثلاً ہمارے زمانے میں معاشی ظلم انتہا کو پہنچ چکا ہے اور یہاں عدم توازن کی وجہ سے عام لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اکثر لوگ غذا نہ ملنے یا ناقص غذا ملنے کی وجہ سے مر رہے ہیں اور صحیح تعلیم نہ ہونے کے سبب سے اپنے انسانی فرائض ادا نہیں کر رہے، اور نہ ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ انہیں اس حالت سے نکال کر ایسے حالات پیدا کرنا کہ وہ فکر معاش سے نجات پا کر اللہ کی یاد میں لگ سکیں، ہر اس شخص کا فرض ہے جو قرآن حکیم کی تعلیم کو مانتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ جان اور مال کی قربانی کے بغیر نہیں ہو سکتا"۔ (جنگ انقلاب ص۸۲)

(۱۲) "ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پہلی عمومی جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں حصہ لے کر بعض باتیں تجربے سے جان چکے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے دینی علوم اور ارشاد و احسان بہترین عملوں میں سے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان عملوں سے کسی حالت یا کسی شکل میں کافروں کی مدد نہ ہوتی ہو، نہیں تو اللہ تعالیٰ ان نیک عملوں کو بھی بیکار

اور بے اثر کر دیتا ہے۔ مگر اگر کوئی صوفی اپنے مریدوں کو اللہ اللہ کرنے میں اتنا لگائے رکھتا ہے کہ وہ انہیں قرآن حکیم کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے تیار نہیں کر سکتا اور اس طرح کافروں کو فائدہ پہنچتا ہے تو ان نیک عملوں کے فائدہ مند ہونے میں شبہ ہے۔" (انقلاب جنگ صہ ۸۶)

(۱۳) "اگر تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور قرآن حکیم کو غالب کرنے کی تحریک میں جان و مال سے کوشش نہ کی تو کوئی دوسری جماعت اس کام کے لیے تیار ہو جائے گی جو مال بھی خرچ کرے گی اور جان بھی لڑائے گی۔ وہ تم جیسی سست اور کاہل اور جان و مال سے دریغ کرنے والی جماعت نہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کا انٹرنیشنل نظام بہت بڑی قربانی کا طالب ہے۔ اس راہ میں بہت خطرے ہیں، لیکن آخر کار بین الاقوامی غلبہ اور عزت ہے۔ اللہ کے فضل سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کی ہوئی جماعت نے جان اور مال سے کسی جگہ بھی دریغ نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جماعت کل قومی انقلاب کا مرکز بن گئی اور وہ انقلاب حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد جب عربوں نے اس بین الاقوامی تحریک کو قومی بنا لیا اور رفتہ رفتہ جان و مال سے دریغ کرنے لگے تو عجمی قومیں غالب آ گئیں۔ قرآن کی سرمایہ شکن طاقت بہر کیف غالب رہنی چاہیے۔ جب اس کی سرمایہ شکنی میں فرق آئے گا اور سرمایہ پرستی پیدا ہوگی ضرور انقلاب آئے گا اور کوئی نہ کوئی سرمایہ شکن طاقت اوپر آ جائے گی، لیکن قرآنی انقلاب وہ ہے جس میں سرمایہ شکنی کے ساتھ خدا پرستی شامل رہے گی۔"

(جنگ انقلاب صہ ۹۷)

(۱۴) "مسلمانوں کی جماعت میں جو ایک عظیم الشان بین الاقوامی انقلاب کی داعی ہے، شامل ہونا اللہ تعالیٰ کے کمزور بندوں کی خدمت کر کے خدا تعالیٰ کے ہاں سرخروئی حاصل کرنا، بہت بڑی رحمت ہے۔" (جنگ انقلاب صہ ۷۹)

(۱۵) "جہنمیوں سے جب ناکامیوں کے اسباب پوچھے جائیں گے، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یعنی انسانی بھلائی کے اس پروگرام پر عمل نہ کرتے تھے جو اتحاد فکر اجتماعیت اور مساوات وغیرہ بیسیوں بھلائیاں سکھاتا ہے اور جس کا انتہائی معراج اللہ کے ساتھ تعلق ہے۔ یاد رہے کہ انسان کے قلب میں خدا شناسی کی جو قوت چھپی ہوئی ہے جب اسے نماز ترقی دیتی ہے، تو انسان کے اندر ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا وہ اس آئینے میں خدا کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تجلی جو اسے اپنے قلب میں نظر آتی ہے۔ انسان کبیر امام نوع انسانی کے قلب کی تجلی کا پرتو ہوتی ہے۔ یہاں تک ترقی کر جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان انسانیت کے تقاضوں کو خدا کا حکم سمجھنے لگ جاتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کے کمزور اور مسکین بندوں کا چاکر (خدمت گزار) سمجھنے لگ جاتا ہے، جسے کسی دوسرے بندے کے حقوق چھیننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اب وہ ہر وقت خدمت انسانیت کے لیے تیار رہتا ہے اور اسے خدا کی عبادت کا جزو جانتا ہے۔" (دستور انقلاب ص۲۰۴)

(۱۶) "اس وقت یورپ میں امپیریلزم (IMPERIALISM) کے ردِّ عمل کے طور پر جو غلط سیاست اور غلط مذہبیت کی پیداوار تھا۔ کمیونزم (COMMUISM) پیدا ہو چکا ہے۔ اس میں خدا کا انکار لازم ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے انکار کی وجہ ہی سے وہ بھی امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا پہلا قدم استعماریت ____ (COLOMALISM) ہے جس کا لازمی نتیجہ امپیریلزم ہوگا۔ اسے اس دوسری بڑی جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں امپیریلسٹ طاقتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑا جس کی وجہ سے اسے اپنا کمنٹرن (CUMINTERN) یعنی بین الاقوامی نظام توڑ کر ان سرمایہ دار طاقتوں کے ساتھ مصالحت (COMPROMIS) کرنی پڑی۔ نام نہاد کمیونزم میں جس قدر مسکین نوازی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مسکین نوازی امام ولی اللہؒ کے فلسفے میں ہے اور اس میں مزدور اور کاشت کار کے حقوق کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، لیکن اس کی بنیاد خدا کے صحیح اور

صاف تصور پر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک کارکن اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زندہ تصور کے ساتھ گزارتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے سامنے ہے یا کم از کم یہ کہ خدا تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ تصور بھی ایک زندہ اور پائیدار شکل میں اپنے سامنے رکھتا ہے کہ اگر اس نے کم تولا یا کسی کے حق کو نا جائز طور پر پاؤں تلے روندا تو وہ دنیا میں بھی سزا پائے گا۔ اور مرنے کے بعد بھی اسے خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے عملوں کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ امام ولی اللہؒ صاحب کی حکمت اسے یہ بھی سکھاتی ہے کہ قرآن حکیم پر عمل کرنے والے کارکن کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے اپنے عمل کا بدلہ لینا ضروری نہیں، انسان بے شک اس لیے پیدا ہوا ہے کہ دنیا میں قرآن حکیم کی حکومت بین الاقوامی درجہ پر چلائے، لیکن وہ اس حکومت کے ذریعے سے اپنے لیے یا اپنے خاندان کے لیے کوئی فائدہ حاصل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ قرآن حکیم کی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی حکومتیں بے نظیر ثابت ہوئیں اور آج تک دنیا ان کی مثال پیدا نہیں کر سکی، اب اس دور میں بھی امیر المومنین سید احمد شہیدؒ (۱۸۳۱ء - ۱۷۸۶ء) اور ان کے ساتھیوں نے انہی اصولوں پر اس نمونے کی حکومت پیدا کر کے ایک دفعہ پھر دکھا دی اور ثابت کر دیا کہ اس قسم کی حکومت پیدا کرنا ہر زمانے میں ممکن ہے۔ قرآن حکیم ماننے والوں کے لیے اس میں بہت بڑی عبرت اور ذمہ داری ہے۔" (عنوان انقلاب ص ۵۹)

(۱۷) "جو لوگ ہمت اور طاقت کے باوجود جہاد میں حصہ نہیں لیں گے۔ انہیں دوسری قوم کی غلامی کے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا اور جو لوگ اس عذاب غلامی میں مبتلا ہونے کے باوجود اس سے بچنے کی پوری کوشش نہ کریں گے، انہیں اس میں مبتلا رکھا جائے گا۔"

(عنوان انقلاب ص ۹۷)

(۱۸) "مشاورت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن اسلامی حکومتوں کو شوریٰ سے خالی کر کے مطلق العنان انسان جاہل حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنا دیا گیا۔ وہ مسلمانوں کی

امانت (سرکاری خزانے) سے اپنی شہوت پرستیوں پر روپیہ صرف کرتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی مصلحت کے مقابلے میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں اس قسم کی غلطیوں کا خمیازہ مسلمانوں کو صرف اس غلط تفسیر کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔ ورنہ ہر ایک مسلمان ایک حاکم کے اوپر ننگی تلوار ہے اور وہ حاکم کیوں قانون الٰہی کی اطاعت نہیں کرتا؟ اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنا پر ہم سے اطاعت کا طلب گار ہوتا ہے۔ یہ طاقت مسلمانوں میں پھر سے پیدا ہو سکتی ہے اور اس سے ان کی جماعتی زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے۔" (عنوان انقلاب صہ: ۱۲۶)

(۱۹) "واقعہ یہ ہے کہ جس دن سے مسلمانوں نے موت قبول کرنے کا یہ فکر چھوڑا ہے اسی دن سے ان کی حکومتیں برباد ہونے لگی ہیں۔ اب ہم اس حالت کو دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری زندگی ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہے۔" (عنوان انقلاب صہ ۱۰۲)

(۲۰) "آسمان کی بادشاہی تو فرشتوں کے ذریعے سے ہے۔ زمین کی بادشاہی اس جماعت کے ذریعے سے قائم ہوگی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو زمین میں چلائیں گے۔ یہ انقلاب حضرت عثمانؓ کی شہادت تک رہا۔ اس وقت حجاز میں خدا کی بادشاہی قائم تھی۔ قرآن کا قانون تھا اور اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت تھی وہ اپنے آپ کو قانون کا مالک نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ اپنے آپ کو خدا کا نائب سمجھ کر اس کے حکموں کو بجا لاتی تھی اور ان پر عمل کراتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خدا کا نائب (خلیفۃ اللہ) بن کر اپنے ساتھیوں کو جو خدا کے قانون کی عزت اور وقار قائم کرنے میں آپ کے شریک تھے، اپنے ذریعے سے خدا کا نائب (خلیفۃ اللہ) بنا دیا۔" (عنوان انقلاب صہ۸)

(۲۱) "قانون کی پابندی کا انتظام ایک جماعت کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور وہ حکومت کرنے والی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ قانون کا انتظام کرنے والی جماعت کا فرض ہے کہ وہ امانت دار ہو، اور اپنا فرض ادا کرنے والی ہو۔ صحیح طور پر قانون کی پابندی

کرنے والی جماعت کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ قانون کی تعلیم عام لوگوں کو اس طرح دینا شروع کرے، جیسے باپ اپنی اولاد کو پڑھاتا ہے۔ پھر قانون کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دینا بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ وہ مخالف جماعتیں یا تو اس پارٹی کے اندر ہوں گی یا باہر، جو اندر ہوں گی۔ انہیں قانون توڑنے کی سزا دینے کا نام تعزیر ہے اور جو باہر ہوں گے، ان سے جنگ کرنی پڑے گی۔ تعزیر اور جنگ دونوں میں جتنی قوت استعمال کرنی ضروری ہے۔ اتنی ہی استعمال کرنی چاہیے۔ یہ قانون چلانے والی پارٹی عام لوگوں سے فقط قانون کی پابندی کرائے گی اور ان کی طرح خود بھی اس قانون کی پابندی کرے گی۔ وہ ان سے اپنی خواہشوں کی پیروی نہیں کرائے گی، کیونکہ یہ ظلم ہے۔ قانون کی صحیح پابندی کے لیے عربی زبان میں اصطلاحی لفظ تکلیف بولا جاتا ہے۔ (ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ تمہید باب)

(۲۲) "میں نے حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ۴ شوال ۱۳۳۳ھ کو ہندوستان چھوڑا اور حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ کی خواہش پر اوائل ۱۳۵۸ھ میں واپس آیا۔ اس عرصہ میں ایسے حالات سے دوچار ہوتا رہا ہوں کہ کبھی موت کے منہ میں جا کر بچ نکلا اور کبھی غلبۂ یاس کے بُرے اثرات سے بچنے کے لیے ایسی جماعتوں سے متحد ہو کر کام سوچتا رہا، جن سے بحالت اطمینان شاید معمولی طور پر ملنا بھی جائز نہ سمجھتا۔" (خطبات ص ۸۲)

(۲۳) "میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوا اور بچپن سے دریائے سندھ کے کنارے جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پرورش پائی۔ یہیں میں نے اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اسلام میں نے ایک پنڈت سے سیکھا ہے۔ ہمارے ملک میں برطانوی قبضہ کے بعد دو دفعہ ہندو سوسائٹی کی اصلاح شروع ہوئی۔ دونوں میں اس قدر فرق ہے جیسے ایکسٹریمسٹ (EXTRIMIST) اور ماڈریٹ (MODERATE) میں ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ پنڈت اننت رام نے پرانوں کی شرک آمیز تعلیم کا اسلامی توحید سے مقابلہ کیا اور آخر میں خود مسلمان ہو گیا۔ وہ مسلمانوں میں پنڈت مولوی کے نام سے مشہور ہوگا۔ اس کی

تحریک پنجاب میں خوب پھیلی سینکڑوں ہندو نوجوان مسلمان ہو گئے۔ میں سولہ برس کی عمر میں ۱۸۸۷ء میں اس کی کتاب تحفۃ الہند کو بار بار پڑھنے سے اسلام لایا۔ میں نے اپنا نام عبیداللہ پنڈت مولوی کے نام پر خود رکھا ہے۔ میں نے اپنے ہم جماعت طالب علموں سے نماز سیکھ لی اس زمانہ میں جب میں گھر پر تنہائی میں نماز پڑھتا تو اس قدر سرور حاصل ہوتا جو اب تک باوجود اس قدر علم پڑھنے کے اور عمر گزارنے کے کبھی کبھی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس تحریک کو انتہا پسند سمجھنا چاہیے۔" (خطبات صـ ۱۰۳)

(۲۴) میرا خیال ہے اسی طرح اگر نیا اصلاح شدہ عربی نصاب ہمارے مدارس میں غالب آگیا تو یقین مانیے کہ ہم حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتاب سمجھنے سے عاری ہو جائیں گے۔ ہمارا اپنا فلسفہ جب ذہن سے نکل گیا تو ہم ہر طرح بہکائے جا سکتے ہیں۔" (خطبات صـ ۹۴)

(۲۵) ہندوستانی مسلمان دو سو برس سے سوتا رہا ہے۔ اس نے اپنے اعلیٰ درجے کے مفکرین کی بے قدری کی، اس نے اپنے خیر خواہوں کو دشمنوں کے ہاتھ قتل کرایا۔ اس قسم کی غلطیاں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کی اکثریت سے تنہا تنہا بارہا ہوتی رہی ہیں، ورنہ ٹیپو سلطانؒ اور مولانا محمد اسماعیلؒ کی جماعتیں یوں شہید نہ ہوتیں، انقلاب کا مرکز بننے کی جو قدرتی صلاحیت ہندوستان کے مسلمان میں مضمر تھی۔ ان غلطیوں سے وہ انفرادی استعداد برباد ہو چکی ہے۔ (خطبات صـ ۱۲۷)

(۲۶) بے شک ہندو مذہب عیسائیت اور یہودیت کی طرح پرانے زمانے میں سچائی کا مالک تھا لیکن میں نے دیکھا ہے اس میں اب شرک مل گیا ہے، آپ کو اگر ہندو مذہب کی حقیقت معلوم کرنا ہو تو حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مکتوبات پڑھیے جو کلمات طیبات نام کی کتاب میں آپ کو ملیں گے۔ (خطبات صـ ۱۴۰)

(۲۷) روس کے انقلاب کی دو مرکزی شخصیتیں تھیں۔ کارل مارکس اور لینن۔ میں نے اپنی انقلابی دعوت کے لیے امام ولی اللہؒ اور امام محمد قاسمؒ دو امام چنے ہیں۔ انقلاب روس لادینی ہے

اور میر انقلاب امام ولی اللہؒ کی تعلیمات کا عین خلاصہ اور نچوڑ ہے (خطبات ص ۱۴۵)

(۲۸) ہمارا خیال ہے کہ الصدر الشہید (مولانا شاہ اسماعیل دہلویؒ) کو اگر خلافت کبریٰ سونپی جاتی تو اُسے فاروقِ اعظمؓ کی طرح چلاتے۔ امیر شہیدؒ نے انہیں خدمت خلق پر اپنے اسوۂ حسنہ سے لگایا تو وہ گھوڑوں کے لیے گھاس کھودتے تھے۔ ان کی کتاب تقویۃ الایمان میرے اہتدار بالاسلام کا واسطہ بنی ہے۔ اس لیے وہ میرے مرشد اور امام ہیں رضی اللہ عنہ۔

(خطبات و مقالات ص ۲۲۴)

(۲۹) "مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ہم نے اپنا پروگرام بنالیا کہ ان تبدیل شدہ حالات میں ہم کس طرح اپنے مسلک پر قائم رہ سکتے ہیں۔ یورپین فلاسفی اور ہندی فلاسفی کے ماہرین سے ہم ولی اللہ فلاسفی کا کس طرح تعارف کرا سکتے ہیں۔ ہم اس راستہ پر گرتے پڑتے قدم بڑھا رہے ہیں۔ ہر ایک غلطی کی اصلاح کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں، لیکن امام ولی اللہ کی حکمت و سیاست کی جو انقلابی روح ہماری سمجھ میں آچکی ہے۔ اس میں ایک ذرہ کا فرق بھی برداشت نہیں کر سکتے"۔ (خطبات و مقالات ص ۲۴۰)

(۳۰) ہماری سرگزشت ناکامیوں کی طویل فہرست ہے اور غلط کاریوں کے اعتراف سے بھری ہوئی ہے، لیکن اس میں ایک خوبی ضرور محسوس ہوگی۔ اس میں مایوسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہے۔ ہمیں حضرت شیخ الہندؒ کی وصیت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔

ایمن مشو کہ مرکب مردان راہ را
درسنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(خطبات و مقالات ص ۲۲۷)

(۳۱) ہندو جب بھی کوئی نیا نظام پیدا کرتا ہے، تو اس کی بنیاد سرمایہ داری پر ہوتی

ہے۔ چنانچہ گاندھی جی جیسا شخص بھی انسانیت کا اتنا بڑا نمائندہ بن کر سرمایہ داری سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کمیونسٹ ہیں، مگر وہ بھی سرمایہ دار ہیں۔ ان کے مقابلے میں حسرت موہانی کو لیجیے جس دن اس نے اشتراکیت قبول کی، وہ اپنی تمام جائیداد ختم کر چکا اور اب وہ ایک کوڑی کا بھی مالک نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یورپ جا کر سوشلسٹوں کے ساتھ رہ کر سوشلزم سیکھا۔ مگر حسرت اپنی ذاتی فکر و کاوش سے اس مرتبے پر پہنچا ہے۔ یہ فرق ہے مسلم سوسائٹی اور ہندو سوسائٹی میں۔ مسلم جس وقت اپنے اصلی نظام پر آئے گا۔ وہ سرمایہ داری کا بت توڑنے والا ہوگا اور آج دنیا میں سرمایہ داری کے سوا اور کون سا بڑا بت ہے جسے توڑنے کی ضرورت ہے۔"

(خطبات و مقالات ص ۱۸۸)

یہ چند افکار ہیں جن کی روشنی میں ناظرین کرام خود فیصلہ کریں کہ مولانا سندھیؒ کی طرف جس قسم کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں وہ قطعاً غلط ہیں مولانا نہ تو کمیونسٹ تھے اور نہ اسلام کو ترک کیا، بلکہ مولانا انتہائی درجہ کے مخلص مسلمان تھے اور اسی حالت میں انہوں نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔

رحمہُ اللہ رحمۃ واسعۃ وادخلہ الجنۃ الفردوس
وعافاہ اللہ والحمدللہ اولاً واخراً وصلی اللہ علی
رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین
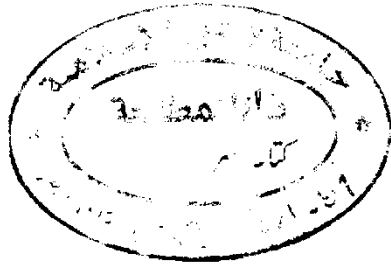
قرآن کا نظامِ نو

قرآن حکیم جو نیا نظام پیدا کرنا چاہتا ہے۔اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ یہ بات انسانوں کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ انسانوں پر حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ قیصریت اور کسرویت یعنی شہنشاہیت اور چند امراء کی حکومت کو توڑ کر ان کی جگہ ایسی حکومت پیدا کرنا چاہتا ہے۔جس کا مرکز اور محور قرآن ہی کا قانون ہو اور اس کے سوا وہ کسی اور قانون کے مانے جانے کو برداشت نہیں کرتا کیونکہ ایک شخص کے لیے، ایک خاندان کے لیے یا ایک بڑے قبیلے کے لیے، یہاں تک کہ ایک قوم کے لیے قانون تو شاید عقل مند انسان بنا سکیں، لیکن کل قومی قانون خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا کیونکہ وہی تمام قوموں کی ضرورتوں اور ذہنیتوں کو جانتا ہے جن کا جاننا کسی ایک انسان کے بس میں نہیں ہے اور نہ کوئی جماعت یہ کام کر سکتی ہے۔ پس اس بین الاقوامی قانون کا نوع انسانی میں چلنا ضروری ہے تاکہ نوع انسانی اپنی طبعی رفتار پر ترقی کرتی رہے۔ (قرآنی دستور انقلاب صہ ۸۰)

صرف مادی اسباب ہی کامیابی کا ذریعہ نہیں

اگر دنیا میں کامیابی کا آخری سہارا محض اور صرف اسباب مادی پر ہوتا تو جن قوموں

کو یہ مادی اسباب پورے طور پر حاصل نہیں ہیں، وہ کبھی ترقی نہ کر سکتیں مگر چڑھی ہوئی قوموں کا گرنا اور گری ہوئی قوموں کا اُٹھنا ظاہر کرتا ہے کہ مادی اسباب کے علاوہ بعض غیر مادی اسباب بھی ہیں جو قوموں کو گرانے اور اٹھانے میں اثر رکھتے ہیں۔ پس مادی اسباب سے کام لیتے ہوئے بھی خدا تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا ضروری ہے جو ان مادی اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اور عوام سے کسی قسم کی مادی اُجرت مانگنے کے خیال سے نظر ہٹا کر صرف خدا کی خاطر کام کرنا اس قرآنی تحریک کا خاص وصف ہے۔

گری ہوئی قوموں بے بس جماعتوں اور اسباب سے محروم لوگوں کو اٹھانے کے لیے اس اونچے فکر سے بہتر اور کیا حوصلہ دینے والی تعلیم ہو سکتی ہے۔ (دستور انقلاب ص ۸۴، ۸۵)

قرآن کا منشا مصنوعی خداؤں کا خاتمہ

پس جس طرح خدا کا قانون (تکوینی قانون) تمام کائنات میں جاری ہے اور کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔ ایسے ہی اس کا قانون — قرآن حکیم — انسانی سوسائٹی (معاشرے) میں جاری کیا جائے اور تمام مصنوعی خداؤں کی خدائی ختم کر دی جائے اور بندگی (عبادت) صرف ایک خدا کی کی جائے، یعنی انسان جو کچھ کرے اور جو کچھ سوچے اس سب میں یہ سمجھے کہ مجھے خدا کے سامنے جواب دینا ہے' اس میں لوگوں کے دکھاوے یا کسی حاکم کے فیصلے کو کوئی دخل نہیں۔ یہ فیصلہ ہر ایک انسان کو خود اپنے دل کے اندر کرنا ہوگا جب تک انسان کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ میرا یہ کام خدا کے سامنے پیش ہوگا تو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس وقت تک وہ اس کام کو اچھا نہ سمجھے، یہ ہے خدا کی بندگی۔ اس طرح جوابدہ سمجھنے کا یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اپنی ساری نوع کی یکساں خدمت کر سکے گا، کیونکہ وہ اصل میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی اس تجلی کے حوالے کر دے گا، جو انسانیت کے قلب پر پڑتی ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا، تو اُسے نوع انسانی کی ہمدردی

اور خدمت کرنی ہوگی۔ اس سورۃ میں قرآن کے انقلاب کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا انقلاب برپا کیا جائے جو کسی خاص خطے یا قوم کی ضرورتیں ہی پوری نہ کرے، بلکہ سب انسانوں کی انسانی ضرورتیں پوری کرے۔ (دستور انقلاب صہ ۸۷)

اسلام کا جامع انقلاب

دنیا میں اب تک جو انقلابات ہوئے ہیں، وہ سب کے سب جزوی انقلابات تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا انقلاب نہ تھا جو ساری انسانیت کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری امام انقلاب ہیں۔ جن کی دعوت کل انسانیت کے انقلاب کے لیے ہے اور آپ نے اس کا سب سے اچھا نمونہ حجاز میں قائم کرکے دکھا دیا۔ جسے دنیا اب تک اسی حیثیت سے جانتی ہے اور مانتی ہے۔ آپ کے انقلاب میں اس وقت کی مہذب قوموں کا بڑا حصہ آگیا اور سب کو انسانیت کی خدمت کے ایک نقطے پر جمع کرکے ان کے تعلقات ان کے خالق کے ساتھ درست کر دیئے بلکہ ان کے آپس کے تعلقات بھی ٹھیک کر دیئے۔ اب جب کبھی کوئی جماعت جامع کل قومی انقلاب پیدا کرنا چاہے گی اُسے آپ ہی کے پیچھے چلنا ہوگا جو جماعت اس پروگرام کے خلاف کوئی اور پروگرام لیکر اُٹھے گی، وہ یا تو سرے سے ناکام رہے گی یا صرف جزوی طور پر کامیاب ہوگی۔ چنانچہ فرانس، جرمنی، ترکی اور روس (وغیرہ) کے انقلابات اس اصول کی ظاہر مثالیں ہیں۔ یہ انقلاب سب انسانی ضرورتوں کو اپنے اندر نہیں لیتے۔ جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا کیے ہوئے انقلاب نے لیا تھا۔ (دستور انقلاب صہ ۱۴۹، ۱۵۰)

حق رہنمائی

قرآن حکیم نے اپنا قانون چلانے کے لیے جو جماعت یا سوسائٹی پیدا کی ہے، اس

کو مہاجرین اور انصار میں سے سب سے پہلے ایمان لانے والے اور نیکی میں ان کا اتباع کرنے والوں کا نام دیا ہے۔ یہ جماعت ان کے تمام امور کے انصرام و انتظام کے لیے اپنے میں سے ایک شخص کو بڑا مان کر اپنا امیر قرار دے لیتی ہے اور یہ امیر ان میں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق انتظام کرتا ہے، لیکن انتظام کی تمام طاقت اصل میں خود اس جماعت کے پاس رہتی ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جو قرآن حکیم نے پیدا کی ہے۔ حج کے موقع پر ہمیشہ مسلمان یہ الفاظ کہتے رہتے ہیں الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك اے خدا سب تعریف اور سب نعمت تیرے لیے ہی ہے اور بادشاہی اور حکومت بھی تیرے لیے ہی ہے۔ نیز اس سب میں کوئی ساجھی شریک نہیں۔ قرآنی سیاست کے مطابق رہنمائی کا حق زیادہ تر ان لوگوں کو حاصل ہے جو قرآن سب سے زیادہ جانتے ہیں اور سابقین اولین کی پیروی کرتے ہیں (دستور ص ۱۵۲-۱۵۳)

حاکم بالاصالة

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ خلافت مشورے کے بغیر نہیں چل سکتی۔ انسان کسی دوسرے انسان کو اپنے اوپر بالاصالۃ حاکم نہیں مان سکتا۔ خواہ وہ کوئی ہو۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ تمام حاکم اس اصلی حاکم کے نائب بن کر اس کا حکم چلا سکتے ہیں۔ اب جو جماعت حقیقی مالک کے سوا کسی دوسرے کی غلامی میں مبتلا ہو گئی ہو تو اس کی حالت تبدیل کرنے کے لیے سب سے پہلے اصول کار یہ ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بٹھایا جائے کہ تمام کائنات اور تمام انسانیت کو قانون دینے والا صرف وہ ایک کارساز حقیقی ہے، وہی ایسے قوانین دے سکتا ہے جن میں شخصوں، جماعتوں اور قوموں بلکہ ساری نوع انسانی کے فائدے اور فطرت انسانی کا خیال رکھا گیا ہو، وہ جماعت ہر ایسی طاقت کو ماننے سے انکار کر دے جو قانون کے اس منبع کے نیچے ضمنی قاعدے سے

(BYE-LAWS) نہیں بناتی۔ (دستور ص ۱۵۴)

صالح انقلاب کی بنیاد

ایک صالح انقلاب کی جڑ یہ ہے کہ انسانیت کو ہر قسم کے ظلم اور راتیا چار (استیصال) سے بچا کر اس میں عام لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے ادارے قائم کیے جائیں نہ کہ اپنے انتفاع (EXPLOITATION) کا شعبہ کھول لیا جائے۔ اگر باپ اپنے بیٹے سے یا استاد اپنے شاگرد سے حد سے زیادہ کام لینے لگ جائے گا تو وہ بیٹا یا شاگرد نافرمان ہو جائے گا۔ ایسے ہی اگر حکومت رعایا سے حد سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا شروع کر دے گی تو سلطنت درہم برہم ہو جائے گی۔ (دستور ص ۱۵۹)

سورۃ طارق کا خلاصہ جسم و روح کا رشتہ

جسم و روح کا رشتہ: آسمان و زمین کا تعلق۔ بارش آسمان کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ اس میں روئیدگی کی استعداد جس قدر ہوگی اسی قدر فائدہ ہوگا۔ وحی الٰہی (قرآن) کا نزول عالمِ بالا سے ہوتا ہے۔ انسانوں میں جس قدر استعداد ہوگی اسی قدر فیضان حاصل ہوگا۔ ابتدائے تخلیق کے ساتھ اعادہ یا قیامت کا ذکر بھی کر دیا۔ طارق (رات کو آنے والا ستارہ) کی روشنی غروب کے بعد اس کے ساتھ قائم رہتی ہے روح جب جسم سے جدا ہوتی ہے تو اس کی تمام قوتیں اخلاق و اعمال اس کے ساتھ قائم رہتے ہیں۔ انسان کی پیدائش ایک اچھلنے والے یا بہائے ہوئے قطرہ آب سے کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ محافظ قوتیں مقرر کی ہوئی ہیں خود انسان اور اس کے اعمال کی حفاظت کی جاتی ہے۔!

طارق رات کے وقت آنے والے مہمان کو بھی کہا جاتا ہے۔

۸ ؎ وما اخمدت نارلنا دون طارق
ولا ذمنا فی النازلین نزیل

نفس سے مراد روح انسانی یا نفس ناطقہ ہے جو تمام نوعی خواص کا حامل ہوتا ہے۔ صلب اور ترائب کے درمیان سے خروج سے مراد یہ ہے کہ نظام اعصاب اور بالخصوص نظام تولید و تناسل جنیٹل سسٹم (GANTAL-SISTEM) سینے کی ہڈیوں اور پشت کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ قرآن اور اس کی بات (وقوع قیامت) کوئی ہزل نہیں حقیقت ہے جو اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوگی۔ اعادہ کے بعد مخفی قوتوں کو ظاہر کر دیا جائے گا دنیا میں اگر اعمال ہیں تو وہاں پر جزائے اعمال قطعی طور پر ظاہر ہوگی۔

سورۃ البلد کا خلاصہ

اس بیس آیت والی مختصر سی سورۃ میں قرآن کریم کے انقلابی پروگرام کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان مکلف ہو، یعنی قانون کی پابندی انسان کے ذمہ ضروری ہے، کیونکہ ملکیت اور بہیمیت کی کش مکش اسی کو چاہتی ہے۔ مکلف ہونے کے ساتھ جزائے عمل لازم ہے جس طرح وجود کے ساتھ اعادہ اور قیامت لازم ہے، نام نہاد مذہبی علماء احبار رھبان یعنی مردار طاقت کے نمائندے بہت سے مولوی اکثر و بیشتر سرمایہ دار ڈکٹیٹر (DACTATER) جن میں زر پرستی اور سرمایہ داری کی مہلک بیماری پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ بالعموم نظام عالم کی اصلاح کے لیے کام نہیں کرتے۔ وعظ و تقریر بہت کرتے ہیں، لیکن کام نہیں کرتے اور یہ بہت بڑی بداخلاقی ہے سرمایہ پرستی کی لعنت کے ازالہ کا علاج اس سورت میں بتلایا گیا ہے۔ مکلف ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ انسان کسی وقت بھی مشقت سے خالی نہیں ہو سکتا، دیکھو مکہ مکرمہ کی آبادی میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام اور ام المؤمنین حضرت ہاجرہؓ

نے کیسی عظیم مشقت برداشت کی۔ انسانی کمالات میں ترقی حاصل کرنے کے سلسلہ میں حدِ کمال تک پہنچنے کے بعد اگر کوئی ہستی مشقت سے مستثنیٰ ہوتی تو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ تھی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں اور پھر مدنی زندگی میں کس قدر مشقت برداشت کی۔ انسان خواہ کتنا بھی باکمال ہو، مشقت سے بچ نہیں سکتا (یہ پہلی شہادت ہے) دوسری شہادت ۔ وَوَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ (قسم ہے والد کی اور اس کی جو اس نے جنا ہے) جننے والی ماں کس قدر مصیبت سے جنتی ہے۔ اور مشقت سے دودھ پلاتی ہے اور اس کو اٹھاتی ہے۔ انسانی زندگی مشقت ہی مشقت سے بھری ہوئی ہے اور یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی آرام کا خیال کرے، لیکن وہ ایک نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ (اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗ اَحَدٌ) اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (انسان کہتا ہے کہ میں نے ڈھیر مال خرچ کیا ہے) شرائع نوامیس الٰہیہ اور قوانین حقہ سے آزاد رہ کر اپنے جسمانی ذہنی عقلی سکون و آرام کے لیے بے اندازہ مال صرف کرتا ہے، مگر اس کو آرام نہیں ملتا۔ نہ تو شراب و کباب سے آرام و سکون حاصل ہو سکتا ہے، نہ رسم و رواج سے۔ اور پھر یہ مال بھی بے کس و بے بس یتیموں، مساکین، غرباء اور ناداروں سے لوٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس نے تو اپنے پیٹ میں آگ جمع کی ہے، تو اس کو آرام کہاں سے نصیب ہو گا۔ انسان کو غور سے دیکھنے کے لیے دو آنکھیں اور بولنے کے لیے زبان عطا کی گئی ہے، اگر اس کو معلوم نہ ہو تو کسی سے پوچھ لے اور دو اونچے راستے اپنی روحانی اصلاح و ترقی اور دوسرا اصلاح عالم اس کو دکھائے ہیں۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (وہ ایک دشوار گھاٹی پر کیوں نہ چڑھا) وہ نوامیس الٰہیہ کی تعلیم کے مطابق عمل کیوں نہیں کرتا۔ یہ گھاٹی صبر سے عبور کی جا سکتی ہے۔ اگر اس گھاٹی پر نہیں چڑھے گا تو وہ بلند راستے (ترقی روحانی و اصلاح عالم) نظر نہیں آئیں گے۔

یہ گھاٹی کیا ہے۔ یہ دو کام ہیں فَكُّ رَقَبَةٍ (گردن کا چھڑانا) یہ بڑی مشقت کا کام ہے غلامی کے پھندے سے آزادی دلانا۔ اگر دولت اس پر صرف کرتا تو اس کو سکون قلبی آرام نصیب ہوتا اور راحت پاتا۔ شراب و کباب کھیل و تماشا لہو و لعب سے کیسے سکون و آرام حاصل ہو سکتا ہے۔

یا کسی مقروض کو قرض خواہ سے آزادی دلاتا، یا کسی شخص یا قوم کو زر پرستوں اور سرمایہ داروں کی غلامی سے آزاد کراتا یا جہالت و کفر و شرک بدعت و معاصی سے لوگوں کی گردنوں کو چھڑاتا۔

یا معاشی و اقتصادی غلامی سے رہائی دلاتا۔

نمبر ۲: یا پھر اجتماعی اصلاح یا سوشل ورک (SOCIAL WORK) کرتا مساکین و یتامیٰ اور ضعیف اور کمزور طبقات کی معاش کا بند و بست کرتا۔ اگر غلام کو آزادی نہیں دلا سکتے تو پھر مساکین کا بند و بست کرو۔ یہ اونچے کام۔ اونچی گھاٹی سے تعبیر کیے گئے ہیں۔ جب تک بلند اور اونچی ذہنیت نہ رکھو گے انسانی زمرہ میں نہ آسکو گے۔ صرف اکل و شرب اور دوسروں کو شکار کرنا یہ تو محض حیوانی زندگی ہے۔ یہ زر پرستی اور سرمایہ داری اور عیاشی انسانیت کی دشمن ہے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ روحانی ترقی اور انسانیت کی تکمیل ایمان باللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ ہی اجتماعی اور انٹرنیشنل INTERNATIONAL جماعت کے ممبر ہوتے ہیں جو صحیح پروگرام پر عمل کرتی ہے۔ ایمان دار سوسائٹی SOCITY میں شامل ہونا اور انسانوں کے فائدے کے لیے مشقت برداشت کرنا اور انسانوں پر انتہائی شفقت اور رحم کرنا اور ان کی خیر خواہی اور راحت کا سامان تیار کرنا ایسی جماعت کا کام ہے۔ ایسے لوگ یقیناً برکت اور یمن اور نیک بختی والے ہیں۔ ان کو قلبی سکون اور ابدی راحت نصیب ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ـــ اور اس پروگرام کے مخالف یہ بدنصیب اور شقی لوگ ہیں

ان کو آگ جلاتی رہے گی، ان کو نہ دنیا میں حقیقی سکون و سرور میسر ہوا اور نہ آخرت میں آرام و چین نصیب ہوگا۔ یہ ابدی طور پر بے آرام اور انتہائی دکھ میں ہوں گے۔!

حقیقی انقلاب

فطرتِ انسانی کے تقاضے۔ خدا پرستی۔ (للہیت اور توحید الٰہی پر راسخ یقین) سے انکار کرنے والے سرکشوں کی گردن توڑنے والا انقلاب۔ فطرت انسانی کی تکمیل کرنے والے کمزور قوموں کو سربلند کرنے والا انقلاب! ظالموں سے باز پرس کرنے والا انقلاب اجتماع انسانی کو مادی اور روحانی امراض سے پاک کرنے والا انقلاب فطرتِ انسانی کا وہ گوہرِ نایاب ہے۔ جسے وہ کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی۔" (دستورِ انقلاب صہ ۴۷)

احساسِ ذمہ داری

تنظیم و تبلیغ، تعلق باللہ کی استواری، غربا و مساکین کی باقاعدہ منظم خدمت، ظاہری و باطنی طہارت اور پاکیزگی کو اختیار کرنا، خیالات۔ افعال اور اخلاق کی طہارت کو اختیار کرنا زرپرستی اور سرمایہ داری کی ہر شکل وصورت کو مٹانا۔ افراد و اشخاص کے تعلق کو اجتماعِ انسانی سے صحیح طریق پر قائم کرنا انسان میں اپنے افکار و اعمال، افعال و کردار کی ذمہ داری کے احساس کو بیدار کرنا ہر شخص کو اس قرآنی انقلاب میں حصہ لینے کے لیے اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا۔ تمام عالم میں کل قومی پیمانہ پر عدل و انصاف کو قائم کرنے کا پختہ عزم۔ یہ سب قرآنی تحریک و انقلاب کا مقصد ہے۔

(ج) امام عبدالعزیزؒ کے زمانے میں کلکتہ سے دہلی تک انگریزوں کا معنوی تسلط ہو گیا تھا۔ دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ دہلی کی سلطنت مسلمانوں سے چھیننا چاہتے تھے ان کے مقابلے میں لکھنؤ، حیدرآباد اور پھر میسور کی مسلم حکومتیں جو سلطان دہلی کا احترام

رکھتی تھیں۔

(د) ۲۔ امام عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے فتویٰ دیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقت کے قبضے میں جا چکے ہیں۔ ان قطعات میں اگرچہ برائے نام سلطان دہلی کا دخل مانا جاتا ہو تو بھی وہ سب کے سب دارالحرب ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نظام حکومت جب متغلب طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو تو یہ فرض ملت پر عائد ہوتا ہے۔ ملت کا اس سے تغافل برتنا اور تقاعد اختیار کرنا حرام ہے، بلکہ ہر ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ اس غلبے کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا ارادہ کرے۔ پھر جیسے حالات پیش آتے رہیں۔ اسی لحاظ سے اپنا اجتماعی نظام قائم کرتا رہے۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک (ص ۹۰ تا ۹۳)

عقلی فتح

سیاسی طاقت (پولیٹیکل قوت) (POLITACIAL ، POWER) اجتماعی (سوشل) (SOCIAL) قوت سے پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی طاقت ذہنی ترقی سے پیدا ہوتی ہے جب تک انسانی ذہن ایک جگہ مرتکز نہ ہو تو کسی قسم کی اجتماعی تبدیلی ممکن نہیں۔ ذہنی تبدیلی اور فکری ارتکاز یہی فلسفہ کہلاتا ہے۔ سیاسی۔ اجتماعی اور اقتصادی فتح کے ساتھ ذہنی فتح بھی ضروری ہے۔ انسانیت کی ترقی کے لیے بتقاضائے فلسفہ (حکمت) ضروری ہے کہ کوئی مرکز ہو، جس کے ساتھ تمام چیزوں کا اتصال ہو اور تمام چیزیں ایک ہی مرکز کے ساتھ مربوط ہوں۔ اگر ایسا ہوگا تو تمام انسانیت کے لیے اس کا قبول کرنا زیادہ آسان ہوگا۔

سورۃ اخلاص اسلام کے اسی مرکزی فکر یا فلسفہ (آئیڈیالوجی آف اسلام) کو پیش کرتی ہے۔ تمام عقل مند انسان اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک لہٗ مانتے ہیں۔ اس کا کوئی شریک

نہیں وہ یکتا یعنی واحد ہے۔ واحد کا معنیٰ ایک ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی اور لفظ آسکتا ہے، لیکن احد کے مقابلہ میں کوئی اور لفظ نہیں آسکتا۔

وہ صمد ہے تمام چیزیں اس کی محتاج ہیں اور وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ اللہ کے لیے یونانی فلاسفہ نے واجب الوجود کا لفظ استعمال کیا ہے اور ایرانی فلاسفہ نے خدا کا لفظ خدا یعنی خود آمدہ۔ قرآن نے صمد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ واجب الوجود سے عقول کے ظہور کا قول یونانی فلاسفہ نے کیا ہے۔ عقل اوّل کے بلا واسطہ اس سے صادر ہونے سے بہت سے لوگوں کی ولدیت اور ابنیت کا اشتباہ ہوا ہے، لیکن یہ فاسد اعتقاد ہے۔ وہ ولدیت ابنیت اور ہمسری کی تمام آلائشوں سے پاک و منزہ ہے! لیکن فلاسفہ اسلامیین ان عقول کو صفات کے طور پر مانتے ہیں۔

سیاسی قوت۔ اجتماعی اور اقتصادی قوت سب عقلی غلبے کے ساتھ مربوط ہیں۔
دنیا میں بہت سے اجتماعی پروگرام ہیں لیکن قطعی اور یقینی بات ہے کہ اسلام اور قرآن کے اجتماعی پروگرام سے بہتر کوئی پروگرام کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔

کھوکھلی مذہبیّت بے سود ہے

مولانا کہتے ہیں کہ یہ گھروندے جو تم نے بنا رکھے ہیں اور انہیں تم فلک الافلاک سے بلند سمجھتے ہو، یہ گھروندے زمانہ کے ہاتھ سے اب بچ نہیں سکتے۔ تمہارا تمدن، تمہارا سماج، تمہارے افکار، تمہاری سیاست اور تمہاری معاشرت سب کھوکھلی ہو چکی ہے تم اسے اسلامی تمدن کہتے ہو، لیکن اس تمدن میں اسلام کا کہیں شائبہ بھی نہیں، تم مذہب کا نام لیتے ہو، لیکن یہ مذہب تمہاری ہٹ دھرمی کا نام ہے مسلمان بنتے ہو تو اسلام کو سمجھو۔ یہ اسلام جسے تم اسلام کہتے ہو، یہ تو کفر سے بھی بدتر ہے۔ تمہارے امیر جاہ پرست ہیں۔ حکمران شہوات میں پڑے ہیں اور غریب طبقے توہمات کا شکار ہو رہے ہیں۔ بدلہ

ورنہ زمانہ تمہارا نشان تک بھی نہ چھوڑے گا، سنبھلو ورنہ مٹا دیے جاؤ گے۔
(مولانا عبیداللہ سندھیؒ از پروفیسر محمد سرور ص ۳۲)

عزم راسخ

مولانا (سندھیؒ) کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اگر ساری دنیا بھی تمہاری مخالف ہو جائے، لیکن تم اپنے ارادے میں ثابت قدم رہو تو تم ہی کامیاب ہو گے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ یہ اعتماد نفس ہے اور انقلاب کے لیے یہی اعتماد نفس پہلی شرط ہے۔ (مولانا عبیداللہ سندھیؒ ص ۶۵)

توکّل کامل

مولانا کو مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں سخت معاشی پریشانیوں میں سے گزرنا پڑا آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ ہندوستان سے بعض احباب کچھ بھیج دیتے تھے لیکن وہ ناکافی ہوتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ان کے پاس صرف اللہ کا نام رہ گیا اور فاقوں تک نوبت گئی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دو تین دن تک کھانے کو کچھ میسر نہ آیا۔ شاید عید الفطر کا دن تھا۔ مولانا نے اپنے عزیز سے جو زندگی بھر ان کی خدمت میں رہے۔ فرمایا کہ میں نماز کے لیے خانہ کعبہ جاتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے غافل تو نہیں ہے۔ وہ کچھ دے گا تو کھا لیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس طرح کے فاقے کئی بار آئے ہیں، لیکن طبیعت کبھی بد دل نہیں ہوئی اور دل کو ہمیشہ یہ یقین رہا کہ ایک ذات ہے جو سب کا خیال رکھتی ہے۔ اس یقین نے سخت سے سخت مصیبتوں میں بھی مجھے اطمینان اور سکون بخشا اور میں اس کی رحمت سے اپنی زندگی میں کبھی بھی ناامید نہیں ہوا۔ (مولانا عبیداللہ سندھی ص ۱۱۸)

دیوبندی جماعت اور دیوبندی نظام

امام ولی اللہ کی تحریک کا دوسرا دور

تحریک کا دوسرا دور، مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ نے ۱۲۴۶ھ میں شروع کیا۔ اور مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کی وفات ۱۳۳۹ھ پر ختم ہوا۔

مولانا اسحاقؒ نے واقعہ بالاکوٹ کے بعد گیارہ سال غور و فکر سے امام ولی اللہؒ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام شروع کیا اس پروگرام کے دو اہم اصول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

(الف) حنفی مذہب کی پابندی۔ (ب) اور ترکی سلطنت سے اتصال۔

شاہ محمد اسحاقؒ نے یہ طے کر لیا تھا کہ سب سے پہلے اس تحریک کو ان عناصر سے پاک کر دیا جائے جو امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیزؒ کے اصول اور طریق کار کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتے۔ اس طرح امام ولی اللہؒ کی پارٹی کا نظام عرب کی یمنی نجدی تحریکوں سے علیحدہ ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے اہم عنصر پشتونوں کو بھی مطمئن رکھ سکتا ہے۔

مدرسہ دیوبند

(الف) پہلی درس گاہ ہے جس نے مدرسہ دہلی کے بعد اس اصول پر کام شروع کیا دیوبندی نظام نے پچاس سال میں جس طرح کامیابی حاصل کی ہے وہ اس کی تجدید کی صداقت کے لیے شاہد عدل ہے۔

(ب) اس نظام کو پختہ بنانے کے لیے عوام کو بتلایا گیا کہ جس قدر رہنما فقہ حنفی اور ہندوستانی تصوف کو چھوڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ حقیقت میں شیعہ پارٹی کا کام کرتے ہیں۔ اس زمانے میں حزب ولی اللہ کا متوسط طبقہ ہر ایسے انسان کو جو فقہ اور تصوف کا انکار کرتا ہے چھوٹا رافضی کہتا رہا۔

(ج) اس نظام کو مزید مستحکم بنانے کے لیے شاہ محمد اسحاقؒ نے ترکی خلافت سے اشتراک پیدا کرنا ضروری سمجھا اور وہ اپنا مرکز مکہ معظمہ لے گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ یمنی نجدی تحریکیں دوبارہ معاملہ بگاڑ نہیں سکیں گی۔

(۲) مولانا محمد اسحاقؒ مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوبؒ دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علیؒ کی صدارت سے مولانا قطب الدین دہلویؒ، مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ اور مولانا عبدالغنی دہلویؒ کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے گا۔ یہی جماعت آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔

دیوبندی نظام

دیوبندی جماعت اور اس کی سیاسی مصلحت سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو مستحضر کر لینا چاہیے کہ جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس دہلوی جماعت

کا دوسرا نام ہے جو مولانا محمد اسحاقؒ کی ہجرت کے بعد ان کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاذ اساتذہ الہند مولانا مملوک علیؒ صدر مدرس دہلی کالج کے لیے مخصوص رہی۔ ان کے بعد مولانا اسحاقؒ نے مولانا امداد اللہؒ کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ مولانا اسحاقؒ نے اولاً مکہ معظمہ پہنچ کر بڑی آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس پر دولتِ عثمانیہ کی وزارتِ خارجیہ کو ان کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی اس بیرونی مخمصہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے مولانا محمد اسحاق نے شیخ الحرم کو واسطہ بنایا اور ایک پناہ گیر کے طور پر حجاز میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس اجازت کی شروط میں یہ ضروری فیصلہ بھی داخل تھا کہ مولانا محمد اسحاقؒ دولتِ عثمانیہ کی سیاسی رہنمائی پر کاملاً اعتماد کرتے ہیں، اس طرح ان کے اتباع میں ان کی معاون دہلی جماعت نے بھی اس فیصلہ کو قبول کر لیا تاکہ انہیں اپنے کام سے ربط رکھنے میں آسانی ہو۔

یہ دہلوی جماعت اس وقت تک اپنے گھر (دہلی) ہی میں کام کرتی رہی۔ جب تک دہلی کا شاہی اقتدار بحال رہا۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں جب اس پرانی انقلابی تحریک کو جو تعلیمی لباس میں کام کرتی رہی تھی۔ اپنے وطن میں اپنا وجود سنبھالنا ممکن نہ رہا، تو اس کا مرکز ایسے شہر میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو انگریزی حکومت کے قانونی احاطہ میں واقع ہو۔ اس جماعت کی مرکزی قوت ایک اختلاف کی بنا پر (جو ایام محاربہ میں سلطان کی طرفداری اور غیر جانبداری سے پیدا ہوا تھا) دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور دہلی کے عوض، دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے جس طرح مولانا محمد قاسمؒ دہلی کالج کے عربی حصّہ کو دیوبند لے گئے۔ اسی طرح سر سید احمد خان نے دہلی کالج کے انگریزی حصّہ کو علی گڑھ میں پہنچا دیا۔

کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورے اشتراک کے بغیر اپنا کام شروع ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے برٹش گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنالیا۔

مگر دیوبندی جماعت (جو مولانا اسحاقؒ کے زمانہ سے دولت عثمانیہ کو اپنی سیاسی رہنما مان چکی تھی) اضطراری حالات کے سوا حکومت کی کامل وفاداری کا اعلان نہیں کر سکتی تھی اس نے معتدل حالات میں برطانوی سیاسی مصالح سے غیر جانبداری کو اپنا مسلک بنایا۔ لیکن یہ غیر جانبداری بھی اس وقت قطعاً ختم کر دی جائے گی جب دولت عثمانیہ اور دولت برطانیہ میں لڑائی کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ہم مولانا شیخ الہندؒ کو اپنے مشائخ اربعہ مولانا امداد اللہؒ مولانا محمد قاسمؒ، مولانا محمد یعقوب دیوبندیؒ اور مولانا رشید احمدؒ کا جانشین مانتے ہیں۔ ہم اٹھارہ سال تک ان کی صحبت خاصہ میں رہ کر ان کے سیاسی مسلک کو سمجھتے اور پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ جس قدر ہم اس دیوبندی مسلک کو سمجھ سکے ہیں اس کا خلاصہ ہم نے اپنے الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ واللہ المستعان!

حزب امام ولی اللہ دہلویؒ

کی

اجمالی تاریخ کا مقدمہ (طبع قدیم)

از

مولانا سندھیؒ

(ص ۷۷ تا ص ۸۷)

انقلابی جماعت رجعت پسندوں اور مفاد پرستوں کو مردود قرار دے

قریش کی انقلابی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اثر سے خود اپنوں کو جو گو ان کے بھائی بند اور سگے عزیز تھے، لیکن وہ نئے انقلاب کی راہ میں حائل تھے، قتل نہ کرتی تو اسلام کبھی یہ حیثیت اختیار نہ کرتا اور نہ یہ ساری دنیا کو اپنا پیغام سنا سکتا۔ ضرورت ہے کہ آج مسلمان اپنے پیغمبر کے اس اسوہ حسنہ کی اہمیت

کو سمجھیں اور اپنی قوم کے ان طبقوں کو جو جونک کی طرح قوم کے خون کو پی رہے ہیں۔ مردود قرار دیں۔ یہ لوگ خواہ ہمارے اپنے جگر کے ٹکڑے ہوں یا ہمارے بزرگ ان کا وجود ساری قوم کے لیے وبال بن رہا ہے۔ ہمارے یہ مفاد پرست طبقے جس کھوکھلے تمدن کو تھامے ہوئے ہیں، وہ انسانیت کے لیے ایک روگ ہے۔ ہماری قوم کے نوجوان انقلابی گروہ کا فرض ہے کہ وہ ان کے تسلط سے قوم کے عوام کو رہائی دلوائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا ہماری قوم کی زبوں حالی ختم نہیں ہوگی۔ (مولانا عبیداللہ سندھیؒ ص ۱۸۵)

معاشی تباہ حالی سے اخلاقی تباہ حالی پیدا ہوتی ہے

انسانیت کی تباہی اور زبوں حالی کا اکثر یہ سبب ہوتا ہے کہ عام جمہور کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ فاقے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح انہیں محتاج رکھ کر ان کو معاشی اور اخلاقی حیثیت سے تباہ کیا جاتا ہے۔ معاشی تباہ حالی سے یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی پیٹ بھرنے کی فکر میں انسانوں کو کسی اور چیز کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کی جو اعلیٰ ضرورتیں ہیں۔ وہ سب بہم نہیں پہنچتیں اور اس طرح انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ (ایضاً ص ۱۸۶)

خودنوشت حالات

عبدِ ضعیف ابو الحسنؒ عبیداللہ ”بن الاسلام“ ہندی سیالکوٹی پیدائش کے لحاظ سے دیوبندی تعلیم کے اعتبار سے، سندھی پھر دہلوی رہائش پذیری کے لحاظ سے کہتا ہے کہ میری ولادت (جمعہ کے دن ۱۲ محرم دس مارچ) ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۲ء میں ہوئی ہے اور میری تعلیم کا سلسلہ ۱۲۹۵ھ ۔ ۱۸۷۸ء میں شروع ہوا اور اس وقت جو نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ اس سے زائد میں نے ریاضی حساب ۔ الجبرا ۔ اقلیدس اور تاریخ ہند سے اشتغال

رکھا اور میں نے عربی ادب کی ابتدائی کتابیں صرف ایک سال میں پڑھ لی تھیں اور ہندی (اردو) کی جو کتاب بھی میرے ہاتھ لگتی تھی میں اس کا مطالعہ کر لیتا تھا اور ۱۳۰۱ھ شیخ عبیداللہ نومسلم جو برہمن تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تھا ان کی تصنیف کردہ کتاب تحفۃ الہند میں نے دیکھی تو مسلسل اس کا مطالعہ کرتا رہا، یہاں تک کہ میں نے اس کو اچھی طرح سمجھ کر یاد بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلامی عقائد پر یقین رکھنے کی توفیق بخشی اور میں نے اسلام کے احکام طہارت، نماز، روزہ وغیرہ سیکھنے شروع کر دیے اور اسی دوران میں شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب تقویۃ الایمان بھی پڑھی اور شیخ محمد بن بارک اللہ لاہوریؒ کی کتاب احوال الآخرۃ بھی پڑھی۔

دریں اثنا میں تنہائیوں اور اندھیروں میں اکیلے نماز پڑھتا تھا اور جو لذت مناجات میں اس وقت پاتا تھا وہ اس کے بعد بہت کم ہی حاصل ہوئی ہے۔ ان ہی ایام میں رمضان ۱۳۰۴ھ میں روزے بھی رکھے۔ پھر میں نے وہ ترک کر دیے۔ تشہیر کے خطرے سے۔ پھر مجھ پر اظہار اسلام کی محبت کا غلبہ ہوا، لیکن بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا تو میں نے حضرت یونس علیہ السلام کی دعا کو التزام سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ تو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اسباب آسان کر دیے، چنانچہ ذیقعدہ کے مہینے ۱۳۰۴ھ میں پوشیدہ طور پر میں اپنے علاقہ سے نکل کھڑا ہوا اور سندھ میں پہنچ کر میں نے اپنے اسلام کا اظہار و اعلان کیا۔ میری عمر اس وقت سولہ سال تھی اور اپنا نام خود "عبیداللہ" تجویز کیا اور پھر میں سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے مجھے کلمہ توحید کی تلقین کی۔ میں نے ان کے ہاتھ پر صفر ۱۳۰۵ھ میں بیعت کی۔ یہ شیخ طریقہ راشدیہ جیلانیہ قادریہ اور شعبہ آدمیہ نقشبندیہ مجددیہ کے جامع تھے۔ آپ سنی حنفی تھے اور شرک و بدعت سے اسی طرح منع کرتے تھے جس طرح شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اور جب ان کی جماعت افغانستان جا رہی تھی

اور سندھ میں ان کا ورود ہوا تھا تو ہمارے شیخ حافظ محمد صدیق صاحبؒ نے ان کی مجالست کی تھی اور ان کی رفاقت اور صحبت سے مستفید ہوئے تھے اور روشنی حاصل کی تھی۔

سید العارفینؒ کی خدمت میں دو مہینے تک رہا۔ ان کے ساتھ جماعت میں نماز پڑھتا تھا اور ان کے حلقہ ذکر میں شریک ہوتا تھا اور مختلف مجالس میں ان کے کلمات نصیحت و ارشاد سنتا تھا اور وہ میری طرف شفقت و رحمت سے اس طرح توجہ فرماتے تھے جیسا کہ کوئی شفیق والد اپنی اولاد کی طرف توجہ کرتا ہے۔ آپ کی مجلس و رفاقت میں رہتے ہوئے آپ کے کلام و خطاب کی حلاوت و لذت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ پھر جب میں آپ سے علیحدہ ہوا تو مجھ پر ظاہر ہوا، آپ کی صحبت کا اثر ایسا تھا جیسا کہ کسی چیز کا بالکل آنکھ سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ علیحدگی کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ وہ نور ہیبت جو لطف و مہربانی کے ساتھ ملا ہوا تھا وہ مجھ سے گم ہو گیا ہے اور اس معرفت کا یقین مجھے اس وقت حاصل ہوا جب مجھے ہمارے شیخ، شیخ الاسلام مولانا گنگوہیؒ کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل ہوا، تو ان کی خدمت و رفاقت میں بھی اسی قسم کا اثر اور نور دیکھتا تھا جیسا سید العارفینؒ کی مجلس میں۔!

اس اجتماع صالح کی برکت سے اسلامی معاشرہ میری طبیعت کی اصل دنیا میں داخل ہو گیا، تو اپنے آپ کو ایسا خیال کرتا تھا کہ گویا میں بھی اسی خاندان کا ایک رکن ہوں۔

مجھے لوگوں نے بتلایا کہ سید العارفین میرے حالات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے اور میرے حق میں بہت سی دعائیں کرتے تھے۔ جن میں سے بعض کی مقبولیت کو تو میں نے دیکھ لیا ہے جیسا کہ آپ نے میرے بارے میں یہ دعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے کہ میرا واسطہ اور اعتماد ان علماء پر ہو جو راسخین فی العلم ہیں اور مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ آپ کی ساری دعائیں میرے حق میں مستجاب ہوں گی۔ (التمہید لتعریف ائمۃ التجدید ص ۸و۹)

ترکِ وطن بامرِ شیخ

میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے حکم سے ۴ شوال ۱۳۳۲ھ کو ہندوستان چھوڑا اور حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ کی خواہش پر اوائل ۱۳۵۸ھ میں واپس آیا۔ اس عرصہ میں ایسے حالات سے دوچار ہوتا رہا ہوں کہ کبھی موت کے منہ میں جاکر بچ نکلا اور کبھی غلبۂ یاس کے بُرے اثرات سے بچنے کے لیے ایسی جماعتوں سے متحد ہوکر کام سوچتا رہا۔ جن سے بحالت اطمینان شاید معمولی طور ملنا بھی جائز نہیں سمجھتا۔ یہاں پر مثنوی کے چند اشعار لکھ دوں تو میری کیفیت زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آسکے گی۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم	جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من	وز درون من نہ جست اسرار من
سرِ من از نالۂ من دور نیست	لیک گوش و چشم را آں نور نیست

اس بیان میں۔ میں اپنے خاص دوستوں کو دعوت دے رہا ہوں کہ وہ ہمارے شخصی حالات کرید کرید کر معلوم کریں اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِاُولِی الْاَلْبَابِ۔

مجھے وطن آنے کی اجازت ملی۔ میں اسے رحمت الٰہی کا خاص کرشمہ مانتا ہوں۔ آہستہ آہستہ میرے دماغ سے دہشت دور ہو رہی ہے۔ واپسی کی امید منقطع ہونے یا قریب انقطاع پہنچنے سے بہت بُرے اثرات دل و دماغ پر حاوی ہو رہے تھے۔ رحمت الٰہی نے اس مشکل میں دست گیری فرمائی اور اس ناقابل برداشت مصیبت سے نجات ملی۔ اَلْحَمْدُ رَبِّیْ عَلٰی ذَالِکَ حَمْدًا الشَّاکِرِیْنَ" (خطبات صہ ۸۲)

وطن واپسی کے حقیقی دواعی

جن حضرات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں ان کی یہ ترتیب فقط ظاہری حیثیت سے

ہے ۔یہاں میں اس کے بطن کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔اس معنوی لحاظ سے سب سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ العالی کا نام آتا ہے جو میرے استاذ شیخ الہندؒ قدس سرہ کے قائم مقام یعنی ثانی شیخ الہند ہیں۔اگر مولانا حسین احمد میری واپسی کی خواہش ظاہر نہ کرتے تو میں بمشکل اس امر پر راضی ہوتا کہ گورنمنٹ ہند سے واپسی میں سہولت پہنچانے کے لیے درخواست کروں ۔(خطبات ص ۸۵)

قابلِ اعتماد بزرگ

داخلی امور میں مولانا کفایت اللہ جیسا عقل مند عالم اور مولانا حسین احمد جیسا ثابت قدم مسلسل کام کرتے رہے ہیں۔یہ سب حضرت شیخ الہندؒ کے خادم ہیں۔" (خطبات ص ۱۰۷)

ویدانت فلاسفی اور تصوّف دو الگ الگ چیزیں ہیں

ویدانت فلاسفی اور تصوف دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔اسلامی تصوّف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے۔یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس طرح مسلمانوں میں ابن عربیؒ کا وحدۃ الوجود کا تصور توحید تھا اور اس کے خلاف امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدتِ شہود کا خیال پیش کیا۔بعینہ ہندوؤں میں بھی توحید کے یہ دونوں تصورات موجود تھے۔یہاں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اسلامی تصوف ویدانت کے فکر سے متاثر ہوا اور ہندوستان کے مسلمان صوفیاء نے نفس باطنی کی اصلاح اور تصفیہ کے لیے ہندو دیوگیوں سے ملتے جلتے طریقے اختیار کیے۔ بہرحال تھے وہ دونوں معنی الگ الگ۔ایک کی بنیاد قرآن، حدیث، شریعت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور مسلمان صوفیاء کی روایات تھیں اور دوسرے کا ذہنی پس منظر بالکل اور تھا۔" (مولانا عبید اللہ ص ۱۴۵)

باعمل صوفیائے کرام دنیا میں موجود ہیں

مولانا نے فرمایا کہ میں نے اچھے صوفی اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اس لیے تصوف کو زوال کا باعث یا اس کا نتیجہ ماننا میرے لیے تو ناممکن ہے۔ مجھ میں ان بزرگوں کے فیض صحبت سے نے جہاد، اقدام اور عمل کا جذبہ تیز کیا۔ (مولانا عبید اللہ صہ ۱۵۲)

صوفیائے کرام کا جذبہ تبلیغ

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ایک خلیفہ حضرت سراج الدینؒ کا جو گور میں قیام فرما تھے۔ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے تین سو مرید چین بھیجے تھے اور ان لوگوں کی کوششوں سے ان نواح میں اسلام پھیلا۔ (مولانا عبید اللہ صہ ۱۵۷)

اشتراکیت ایک نامکمل تحریک ہے

اس عہد کی ایک بین الاقوامی تحریک۔ مولانا (سندھیؒ) اس تحریک کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان محض معاشی حیوان نہیں۔ اشتراکیت نے انسانیت کی خارجی زندگی کی تنظیم کر کے ایک بڑا کام کیا ہے، لیکن انسان کی معنوی زندگی بھی ہے۔ بے شک اسلام اور اشتراکیت دونوں بین الاقوامی تحریکیں ہیں۔ دونوں کا پیغام تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ پھر دونوں کی دونوں انقلابی ہیں، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اشتراکیت صرف معاشی زندگی پر سارا انحصار رکھتی ہے۔ اسلام معاشی زندگی کا انکار تو نہیں کرتا۔ لیکن وہ زندگی کو محض معاشی دائرہ تک محدود بھی نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک زندگی دوام چاہتی ہے اور وہ اس دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتی۔ یقیناً یہ فرق بھی کوئی معمولی فرق نہیں۔" (مولانا عبید اللہ صہ ۲۵۶)

قرآن کے پروگرام کے مقابلے میں مولانا سندھیؒ کسی پروگرام کو نہیں مانتے

مولانا فرماتے ہیں "میں نے جب سکھ مذہب چھوڑا اور اسلام لایا تو میں نے قرآن کو اللہ کا کلام مانا اور قرآن کے عقائد و احکام کے بارے میں جو فکر میرے ذہن میں مرتکز ہے، میں نے ہمیشہ اس فکر کو اپنا مقصود بنایا۔ میری ذات ہمیشہ اس فکر کے تابع رہی ہیں اور دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی کو میں نے کبھی اس فکر کے مقابلے میں مقدم نہیں جانا۔" (افادات وملفوظات صہ ۱۳۴)

ہند کے مسلمانوں کو بیرونی خیال کرنا غلطی ہے

تاریخ پڑھ کر ہندو نوجوان یہ نظریہ قائم کر لیتے ہیں کہ ہندو اصلی ہندوستانی ہے اور مسلمان انگریزوں کی طرح ایک بیرونی فاتح ہے۔ اس لیے جب وہ ہند کو بیرونی لوگوں سے متعارف کرنے کا خیال کرتے ہیں تو اس میں مسلمانوں کو بیرونی فرض کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان شرفاء کی ایک بڑی جماعت عرب و عجم کے بزرگوں کی اولاد ہے اور ان کی زبان سے بھی بعض اوقات ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جن سے ہندو نوجوانوں کو اپنے اس خیال کی سند مل جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین میری شخصیت کے متعلق ناواقف نہ ہوں گے کہ میں ایک ہندو گھر میں پیدا ہوا اور ہندو نومسلم کی کتاب تحفۃ الہند میں نے دیکھی جو ایک برہمن کے واسطے سے مجھے ملی تھی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اسلام کی حقانیت پر یقین کر کے سولہ برس کی عمر میں مسلمان ہوا اور بتیس سال کی عمر میں علوم دینیہ میں تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند میں سندِ فضیلت حاصل کی۔ میں علمی تحقیقات سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عام آبادی، خصوصاً طبقہ سافلہ، کاشتکار اور مزدور ہندو بزرگوں کی اولاد ہیں جو اسلام قبول کر چکے ہیں اور جو بزرگ فاتحانہ

ہند میں داخل ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اور جو خاندان اس نئے مذہب اور تمدن کو ہند میں قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی اولاد اوّل درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندوؤں کا نومسلم اور اسلامی فاتحین کی اولاد میں فرق کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے بھائیوں کو بہت جلد اس غلط فہمی سے پاک ہو جانا چاہیے۔ میرا یقین ہے کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لیے کوئی مذہب کوئی فلسفہ، کوئی تمدن، کوئی قانون میسر نہیں آسکتا۔ اس لیے ہندوستانیوں کو اسے بخوبی مان لینا چاہیے، لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکتا تو ہم نومسلم کیا ایسے بھی گئے گزرے ہیں کہ اپنی آبادی کے تناسب اپنے مذہب کی عزت تمام بھائیوں سے نہ منوالیں۔ ایک ہندوستانی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ بہادر زیادہ شریف تصور کرتا ہے۔ (سرگزشت کابل صہ ۸۰)

سرمایہ داری ایک بدترین اخلاقی بیماری ہے

مولانا فرماتے ہیں۔ جماعتوں کی ایک خرابی سرمایہ داری ہے۔ جب ایسے گروپ پیدا ہو جائیں جو سرمایہ ہی کو سب کچھ خیال کرنے لگ جائیں تو اس سے انسانی اخلاق برباد ہو جاتے ہیں اور دنیا و آخرت میں ایسے لوگ ناکام اور تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی حیوانوں کی طرح ہوتی ہے اخلاق اور دین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اسی طرح امپیریلزم والے بھی اپنی قوت اور طاقت کی گھمنڈ پر مظلوم طبقات پر ظلم و ستم کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے مسلمان کبھی بھی امپیریلزم یا شہنشاہیت کے طرفدار نہیں ہو سکتے۔ اس سے ان کو پاک رہنا چاہیے۔ اسی طرح نیشنلزم بھی قابلِ اصلاح ہے۔ ہر ایسی قومیت یا نیشنلزم جس کی بنیاد نسلی تنافر پر قائم ہو وہ بھی قابلِ لعنت ہے۔ اگر نیشنلزم کے سامنے کوئی بلند نظریہ نہ ہو تو ایسی نیشنلزم کی طاقت کبھی انٹرنیشنلزم کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اگر قومیت یا نیشنلزم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور خدا پرستی کے بلند نظریہ پہ قائم ہو تو پھر ایسا سوشلزم

صحیح ہوگا۔ قرآن کریم نے قریش کو اس قسم کے ملعون نیشنلزم کو ترک کرنے کا حکم دیا اور اس کی اصلاح پر زور دیا۔ نیشنلزم کی طرح نام نہاد مذہبیت بھی ناکام ہے اور ایسے مذہبی لوگ یتیموں اور مساکین و کمزور طبقات کا استحصال کرتے رہتے ہیں اور سرمایہ پرستی کی بیماری میں یہ مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے علماء مولوی حضرات اور پیر گدی نشین یہ سب مردار طاقت ہے۔ ایسے لوگوں میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ کمزوروں اور مساکین سے ظلم دور کرنے اور مساکین کی معاشی حالت درست کرنے کا انتظام کیا ہو، مذہب تو عمل کرنے سے ترقی کرتا ہے۔ محض علم سے نہیں۔ (خلاصہ مافی المقام المحمود)

تسلّی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند اور مرغوب تھا کہ انسانیت اس نسخہ کو قبول کرے تو کہا گیا وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ جیسے ایک طالب علم کو کہا جاتا ہے کہ جتنے نمبر تم چاہتے ہو۔ لکھو دو ہم اتنے ہی دے دیں گے۔

یعنی اقوام عالم اس کو قبول کر لیں گی۔ آپ کو عرب اور قیصر و کسریٰ کی رعایا کو ظلم سے چھڑانا تھا۔ یہ پہلا مقصد تھا۔ نیز اقوام یعنی تمام انسانیت کو بادشاہوں، رہبان و احبار اور سرمایہ پرستوں کے ظلموں سے نجات دلانی تھی۔ تو آپ کو تسلی دی گئی کہ یہ سب کچھ آپ کو مل جائے گا۔" (المقام المحمود پارہ عم ص ۱۷)

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے تجدیدی کارنامے

(حضرت عمر بن عبد العزیزؒ) سنہ ۹۹ھ میں خلیفہ اسلام ہوئے۔ تو اس زمانے کو ان کی تجدید کا زمانہ کہتے ہیں کہ صدی کے سر پر ایک مجدد آئے گا۔ مگر ہم ان کی تجدید ۸۷ھ سے گنتے ہیں جو نبوت کے ۱۰۰ برس بعد اور ۴ برس مسلسل رہی۔ یہاں تک کہ خلافت پر پہنچے۔

اور خلافت کا کام صرف دو سال کے قریب انہوں نے انجام دیا۔ مگر ان کا کام درحقیقت نبوت کی صدی سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے انٹرنیشنل روح قائم کرنے کے لیے آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیۃ۔ کو خطبہ جمعہ میں داخل کر دیا۔ جس کا مسلمانوں کے خطبہ میں آج تک اعلان ہوتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کی تجدید کا جو دور ہے اس کے متعلق ہمیں خوشی ہے کہ اسی زمانے میں سندھ فتح ہوا۔ آپ کی خلافت کے زمانے میں جو دو سال کے قریب رہی، سندھ کا اکثر حصہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان میں اسلام کا یہ اول بیج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پنجاب، کشمیر، سندھ فرنٹیئر اور افغانستان وغیرہ میں جس قدر قومیں بستی ہیں۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرکزی جماعتیں ہیں اور یہ ہی امامت کے حقدار ہیں۔ دریائے سیحون درحقیقت یہی دریائے سندھ ہے جس کا حدیث میں ذکر آتا ہے۔ ہندی میں اس کا نام سین ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنی حدیث میں اس کا نام سیحون ذکر کیا ہے، تو یہ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ملکی زبانوں میں ایسے اختلافات عموماً ہوتے ہیں۔ پنجاب کے پانچوں دریا اور کابل کا دریا وغیرہ درحقیقت دریائے سندھ کا احاطہ ہیں۔ ہندوستان میں ہم تمام ہندوستان ہندوؤں کے لیے چھوڑ سکتے ہیں، مگر اس علاقہ یعنی پنجاب، کشمیر، سندھ فرنٹیئر، بلوچستان اور افغانستان سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ خواہ وہ تمام دنیا کو ہمارے مقابلے پر لے آئیں۔ غرض مسلمانوں کا مرکزی حصہ یہی ہے۔ اسی طرح عربی قوموں کا مرکز۔ نیل اور فرات کا درمیانی حصہ ہے اور عجمی قوموں کا مرکزی حصہ جیحون اور سندھ کا درمیانی حصہ ہے! امام ابوحنیفہؒ اس عجمی سرزمین سے تعلق رکھنے والے تھے۔!

عمر بن عبدالعزیزؒ نے قرآن کے ماتحت عربی ذہنیت کو مہذب کر دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ عجمی ذہنیت کو امام ابوحنیفہؒ نے زندہ اور مہذب کر دیا۔ آپ بہت بڑے امام ہیں آپ عجمی قوم کو قرآن مجید اور فقہ کے مطابق اور حدیث پر عمل کرانے کے لیے عجمی ذہنیت

مدنظر رکھتے ہیں۔ (المقام المحمود پارہ عم صـ۱۴۴)

تین قسم کے انسان ناکام اور ایک قسم کامیاب

پھر دولت پرست انسانوں کو معلوم ہوگا کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" اور انہوں نے اپنی روحانی ترقی کو بھلا دیا جس کے باعث وہ جہنم میں پڑے اور اللہ کے بندے جنہوں نے نظامِ عالم میں ایک پرزہ بن کر کام کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے۔ وہی دنیا و آخرت میں کامیاب ہیں۔ انسان چار قسم کے ہیں ایک امپائر (ملوک و شہنشاہ) دوسرا امپیریلیسٹ (نوکر شاہی والے اور شاہ پرست) تیسرا سرمایہ دار (کیپیلسٹ) اور چوتھا غمخوار نوعِ انسانی" (المقام المحمود پارہ عم صـ۹۳)

قیامت حشر اور جزائے عمل کی تشریح

انسان فطری ترقی کرتا ہے تو آہستہ آہستہ قیامت کی منزل آجائے۔ انسانیت کا کہیں خاتمہ نہیں بلکہ طبقہ بہ طبقہ اور درجہ بدرجہ آگے بڑھے گا۔ جب انسانی ترقی زمین میں مکمل ہوجائے گی۔ تو انسان کو یہ دنیا چھوڑ کر اوپر جانا پڑے گا اور یہی قیامت ہے انسان کے مرنے کی حقیقت یہ نہیں کہ انسانیت بالکل فنا ہوجاتی ہے، بلکہ موت کے بعد بھی انسانیت اسی طرح قائم رہتی ہے اور انسان کے تمام اعمال عقائد اور علوم اس کی حسِ مشترک میں محفوظ رہتے ہیں۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسان جسم کی ضروریات سے فارغ ہوکر اپنے اعمال کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر انسانی قویٰ یا طاقتوں کا تجزیہ اور تحلیل (ANALYSIS) کیا جائے تو ان کے دو حصے نکلتے ہیں۔ ایک حصہ کو بہیمیت یا حیوانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے جسمانی حیات قائم رہتی ہے اور جسم اس بہیمیت یا حیوانیت سے زندہ رہتا ہے۔ دوسرے حصہ کو ملکیت یا نورانیت سے

تعبیر کرتے ہیں اور اس دوسرے حصّہ کے واسطہ سے انسان کا تعلق مقدس لوگوں، فرشتوں اور بعد میں اللہ تعالیٰ سے بالواسطہ قائم ہوتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی میں جو چیز موت تک غالب (ظاہر) ہے وہ اس کی بہیمیت یا حیوانیت کا جزء ہے جس کا پھیلاؤ اور غلبہ رہتا ہے اور دوسرا جزء ملکیت اس کے اندر چھپ کر کام کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ٹھنڈے پانی کو اگر گرم کیا جائے کہ وہ کھولنے لگ جائے اور وہ آگ کا ایک ٹکڑا معلوم ہونے لگے تو پھر بھی اس حالت کے اندر بھی وہ اپنی طبعی برودت یا ٹھنڈک کو نہیں چھوڑتا وہ اس کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر کھولتا ہوا پانی آگ پر ڈال دیا جائے تو وہ اس حالت میں بھی اپنے طبعی جذبہ و قوت سے آگ کو بجھا دے گا۔ موت کے بعد کی حالت میں دوسرا جزء یعنی ملکیت ظاہر اور غالب ہوگا اور پہلا جزء یعنی بہیمیت مغلوب ہو جائے گا اور چھپ جائے گا۔ بالکل غائب نہیں ہوگا۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے وہ غلط ہے۔ ان میں سے اگر کوئی جزء بھی بالکل غائب یا معدوم ہو جائے تو انسانیت ہی باطل ہو جائے گی، بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور رہے گا۔ جب تک انسانیت رہے گی۔ یہ دونوں جزء بہیمیت و ملکیت ساتھ ساتھ ہی رہیں گے۔ بہیمیت کو امداد خاکی یا مادی جسم سے پہنچتی رہتی ہے جتنا حصّہ اس کا کم ہوتا ہے یا تحلیل ہوتا ہے۔ اس کا بدل خاکی جسم پہنچاتا رہتا ہے، لیکن موت کے بعد جسم خاکی سے اس کا علاقہ منقطع ہو جاتا ہے، تو بہیمیت کو مدد نہیں پہنچ سکتی۔ تو ملکیت آہستہ آہستہ غالب اور ظاہر ہونے لگتی ہے جس طرح گرم پانی آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔ ایک زمانہ تک روح کی حالت ایسی ہی رہے گی۔ وہ سمجھے گا کہ میرے دونوں جزء ملکیت و بہیمیت جیسے دنیا کی زندگی میں تھے ویسے ہی اب بھی قائم ہیں۔ فرق اتنا ہوگا کہ وہ یہ خیال کرے گا کہ بدن یا جسم خاکی نہ ہونے کی وجہ سے میں کام نہیں کر سکتا باقی ویسا ہی ہوگا جیسے دنیا میں تھا۔ جب تک یہ خیال قائم رہے گا۔ اس زمانے کو عالم قبر (برزخ) کہا جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خیال کم ہونا شروع ہوگا اور ملکیت

غالب ہونے لگے گی اور پھر اس طرح کا خیال پیدا ہونے لگے گا کہ مجھے ملکی قوتوں سے اتصال پیدا کرنا چاہیے اور پرانے طریقے کو بھولنے لگے گا۔ جب اس دور کو پورا کرے کہ اپنے درجہ کے مناسب ایک ایسی جماعت میں جہاں ملکیت ظاہر ہے شامل ہوسکے تو اس کا زمانہ یہاں پر ختم ہو جائے گا۔ اب اس کے بعد ملکیت کی اجتماعی زندگی پر انانیت کا مدار ہوگا۔ جب یہ اپنے آپ کو "میں" تصور کرے گا تو اس کے سامنے وہ گروپ آجائے گا۔ جس کا یہ جزء ہے (مثلاً ملائکہ) اور اس جماعت کی ہستی کے اندر اپنے آپ کو مضمحل پائے گا یعنی اس سے جدا ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر آگے جو زندگی ہے وہ اس طرح اجتماعی طور پر بڑھتی چلی جائے گی۔ محشر میں ایک درجہ طے کرے گا۔ جنت میں یا جہنم میں جدھر جائے گا اس کو جماعت کا ایک حصہ ہو کر رہنا پڑے گا۔ جس وقت تک وہ اپنا سرمایہ ملکیت کا جتنا اس کے پاس ہے اس کو سنبھال لے اور سمجھ جائے اور اس میں زیادتی سے قریب قریب مایوس ہو جائے اور وہ سمجھے کہ جو کچھ ہے بس یہی ہے تو سمجھو کہ محشر کا دن قریب قریب ختم ہو گیا۔ اب اس کے بعد زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔ جس کا مدار ملکیت پر ہوگا اور بہیمیت یا حیوانیت کا تھوڑا سا تعلق بھی رہے گا۔ جیسا بالواسطہ تعلق ہوتا ہے اور اس زندگی کی طبعی ترقی کا میدان جنت ہے۔ اس میں ترقی کے لیے جنت کا ایک ایک درجہ آئے گا۔ جس طرح سیڑھی پر ایک ایک زینہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک مدت تک ایک درجہ یا طبقہ طے کرنا پڑے گا اور یہ ترقی ایسی ہو گی جس کے زمانے کا اندازہ انسان اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتا جو لوگ عارف کامل اور راسخ فی العلم ہوں گے، وہ اس کا اندازہ معلوم کر سکیں گے۔ شاید ایسے لوگ اشارہ کنایہ سے اس کے بارے میں کچھ بتلا سکیں، لیکن عام لوگ نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ بتلا سکتے ہیں اور جن لوگوں کے مزاج اور طبیعت میں اتنا نصاب یا علم و عمل کا اتنا حصہ نہیں ہوگا کہ جنت کا دروازہ ان کے لیے کھل سکے تو ایسے لوگوں کو ایک عرصہ تک اعراف میں رکھا جائے گا۔ ایسے لوگ پاس مارک حاصل نہیں کر

سکتے۔ ایسے لوگ اپنی ترقی کو آگے جاری نہیں رکھ سکتے۔ ان کی حالت قابل غور ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کو موقع ملنا چاہیے تاکہ وہ سنبھل جائیں اور درست ہو کر اپنی ترقی کو جاری رکھ سکیں اور جو لوگ اس سے بھی نیچے درجہ میں ہوں گے، وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔ ان کے آپریشن وہاں ہوں گے ان کو داغ دیے جائیں گے اور وہ بہت تکالیف اٹھائیں گے۔ (المقام المحمود پارہ عم صہ ۵۳ یا صہ ۵۷)

دین دار مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے ملنے کا شوق ہوتا ہے

جس نے اپنی طبیعت اور مزاج کو حظیرۃ القدس کی طرف جانے کے لیے تیار و آمادہ کیا اور اپنے آپ کو تجلی الٰہی کے سامنے ہونے کا اہل و مشتاق بنایا اس لیے کہ انسان اگر مذہبی اور دینی ذوق رکھتے ہوں تو ان کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کی خواہش اور شوق ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ تکالیف بھی برداشت کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال یعنی ان کے حساب کا کاغذ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ کیونکہ وہ دنیا میں بھی سیدھے راستے پر جا رہے تھے۔ وہ اپنے گھر مسرت سے پہنچ جائیں گے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نیک لوگ اس وقت ہی اپنی نیکی سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا سکیں گے جب وہ اپنی سوسائٹی کو بھی درست رکھیں گے۔ انسان اپنی سوسائٹی سے بہت جلد اثر قبول کرتا ہے۔ (المقام المحمود پارہ عم صہ ۶۰)

جہاد اہلِ اسلام پر فرض ہے

اور جب عمل (جہاد) عام ہوگا اہلِ اسلام میں تو عزم جہاد بھی ان میں زندہ اور ہمیشہ قوی اور مضبوط ہوگا اور جب یہ کام وہ اجرت سے کریں گے جس کو وہ کسی سلطان یا حاکم سے لیں گے تو یہ مقصد فاسد ہوگا اور عزم جہاد بگڑ جائے گا۔ عزم جہاد کو عام کرنا

اور اس کو قوی اور مضبوط کرنا فی سبیل اللہ لازم اور واجب ہے ، ہر فرد پر مسلمانوں کے افراد میں سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ، اور جب مسلمان مرد اور عورتیں اس امر کو پورا کریں گے تو تمام تشویشات جو اجتماعات کے سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کے بارہ میں پیدا ہوتی ہیں وہ رفع ہو جائیں گی اور جو شخص بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے ۔ اس کو وہ تمام قوتیں جو اس راستہ سے روکتی ہیں یا کمزور کرنے والی اور منافقین کی قوت ، اس کو ہٹانا ضروری امر ہے ۔ خواہ یہ روکنے والے ملوک ہوں یا رہبان (پیر) ہوں یا احبار (مولوی) ان سب کو راستہ سے دور کرنا ضروری ہے اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ یہ سب منافقین ہیں ۔ دعوت الی الجہاد اور قتال کی وجہ ضعفاء سے رفع ظلم وستم ہے جو لوگ بھی راہِ خدا میں لڑتے ہیں ، وہ اسی ظلم و تعدی کو ضعفاء سے ہٹاتے اور دفع کرتے ہیں ، قرآن کے نظام حکم کے مطابق اور یہ قرآن تمام کتب الٰہیہ کا خلاصہ اور نچوڑ ہے ۔ اس کے برخلاف ظالم اور مستبد حکومتیں اور وہ سلاطین جن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ خود مختار ہیں اور اپنے کاموں میں غیر مسئول ہیں اور یہ مقدس اور پاک لوگ اور ان کے نام پر طرح طرح کے مفاسد کا ارتکاب کیا جاتا ہے ۔ یہ سب طاغوت ہیں ۔ صدر اسلام یعنی اس کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے کسریٰ و قیصر کی شہنشاہیتوں کو مٹایا ۔ اب یہ سب مغربی اور مشرقی ملوکیتیں اسی زمرہ میں آتی ہیں ۔ لوگوں نے ان کو الوہیت کا درجہ دے رکھا ہے ۔

مولانا سندھی نے انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کے بارہ میں ذکر کیا ہے کہ وہ تھوڑا سا کمزور اور ضعفاء کی مدد کی طرف مائل ہوا تو اس کو برطانیہ والوں نے بدنام کر کے معزول کر دیا کہ اس نے ایک شخص کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے ۔ (مولانا سندھیؒ) نے کابل میں اقامت کے دنوں کا ایک لطیفہ بھی ذکر کیا ہے کہ امیر کابل (حبیب اللہ خان مرحوم) کے واقعات اور باتیں سن سن کر ایک نوجوان نے مجھ سے تعریضاً سوال کیا کہ مولانا السلطان ظل اللہ فی ارضہ ۔ یعنی سلطان اللہ تعالیٰ کا سایہ ہوتا ہے زمین میں ۔ یہ حدیث ہے تو میں

نے کہا کہ ہاں حدیث تو ہے، لیکن مطلب یہ ہے کہ اگر سلطان اللہ کے حکم کے مطابق حکم دے تو وہ ظل اللہ ہوتا ہے اور جب وہ شیطان کے حکم کے مطابق فیصلہ یا حکم دیتا ہے تو وہ ظل الشیطان ہوتا ہے۔ میرا یہ جواب سن کر وہ نوجوان ہنس پڑا۔

(الہام الرحمٰن ج ۲ ص ۱۹۴)

مکّہ سے رخصت ہوتے وقت

مولانا (سندھیؒ) نے فرمایا کہ میرا یہ غیر متزلزل یقین ہے اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بے شک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر اُبھرے گا، لیکن خارج میں اس کا وہ ڈھانچہ نہیں ہوگا جو اس وقت ہے مجھے جس طرح اس بات پر یقین ہے کہ اسلام پھر ایک بار اُبھرے گا۔ اسی طرح میرا یہ بھی ایمان ہے کہ ہمارا موجودہ ڈھانچہ اب چند دنوں کی چیز ہے۔ اسلام کو ایک نیا ڈھانچہ بنانا ہوگا اور مسلمان اسے جس قدر بھی جلد بنالیں بہتر ہوگا۔ یہ دو عقیدے ہیں جو مجھے کشاں کشاں ہندوستان لے جا رہے ہیں۔ میں اب چراغِ سحری ہوں۔ خدا معلوم زندگی کے کتنے دن اور ہوں گے۔ چاہتا ہوں مرنے سے پہلے اپنی قوم کے کانوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں۔" (مولانا عبید اللہ سندھیؒ ص ۱۹۸)

حجۃ اللہ پر کلام کرتے ہوئے

(مولانا) اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک زمانے میں مسلمانوں کی اپنی حکومت تھی۔ ان کی سلطنت کا دبدبہ تھا۔ ان کے بازوؤں میں قوت اور ان کے اخلاق میں پختگی تھی۔ ان کی قومی جمعیت بنی ہوئی تھی اور ان کا قانون حاکم اور نافذ تھا۔ اس لیے اسرار دین کو سمجھنے اور ہر خاص و عام کو ان حکمتوں سے واقف کرانے کی علماء نے اس وقت زیادہ

ضرورت محسوس نہ کی، لیکن آج نقشہ ہی دوسرا ہے۔ نہ حکومت باقی رہی نہ سلطنت کا دبدبہ ہے۔ جمعیت کبھی کی مفقود ہو گئی۔ قانون کا عمل دخل نہیں رہا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انتشار آخری حد تک پہنچ چکا ہے اور تو اور اب تو خود ہمارا دین اغیار کے نرغے میں ہے اور اس پر ہر طرف سے اور ہر طرح کے حملے ہو رہے ہیں اور ڈر ہے کہ جس طرح ہماری قومی جمعیت توڑ دی گئی ہے۔ اسی طرح خدا نہ کرے کہیں ہمارے دین کو گزند نہ آ جائے۔ چنانچہ آج اس زمانے میں اہلِ علم کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام کی حکمتوں کو سمجھیں اور غیر تو ایک طرف رہے خود اپنوں کو ان کے دین کی یہ حکمتیں سمجھائیں۔ کیونکہ اب تو نوبت اس کی آ رہی ہے کہ کہیں مسلمان خود ہی اسلام سے خدانخواستہ دل برداشتہ نہ ہو جائیں ۔۔۔۔

اور عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اسلام کے اصول و قواعد کے اسرار خود بھی اور ان کے حقائق سے دوسروں کو بھی آگاہ کروں! (مقدمہ خطبات و مقالات ص۳)

الہام الرحمٰن

مولانا سندھی کی تفسیری تشریحات ہیں جن کو مولانا موسیٰ جار اللہ (جو کہ مولانا سندھی کے تلمیذ تھے) نے جمع کیا تھا اور یہ عربی زبان میں ہے۔ اس کی جلد اول اور جلد ثانی ہمارے پیش نظر ہے۔ موسیٰ جار اللہ ماسکو میں رہتے تھے اور مولانا سندھی جب ماسکو گئے تھے اسی وقت سے ان کا تعارف تھا۔ موسیٰ جار اللہ بڑے وسیع المعلومات کثیر المطالعہ عالم تھے۔ حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ یہ بزرگ روسی انقلاب ۱۹۱۷ء کے بعد روس سے ملک بدر یا جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ جار اللہ صاحب بھی مولانا سندھی کی طرح مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے۔ اور وہاں ہی ایک سو پچاس دن میں یہ تفسیری نوٹ انہوں نے قلمبند کیے تھے۔ یہ مولانا سندھی نے اپنے قلم سے نہیں لکھی، بلکہ اس کی

حیثیت ایک املائی تقریر کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں لکھی ہوئی بہت سی باتیں مولانا سندھیؒ کی ہیں، لیکن پوری کتاب مِن و عَن مولانا کی طرف منسوب کرنا بڑی زیادتی ہوگی اور اس کو اگر علمی خیانت کہا جائے تو بجا ہوگا۔ کچھ باتیں اس کی مشتبہ اور غلط بھی ہیں، جن کے مولانا سندھیؒ قائل نہیں تھے اور نہ وہ باتیں فلسفہ ولی اللہی کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ موسیٰ جار اللہؒ زندگی کے آخری سالوں میں ہندوستان بھی آئے تھے اور ریاست بھوپال میں ٹھہرے تھے۔ انہوں نے اور بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض مفید بھی ہیں۔ الوسیعۃ فی رد الشیعہ بھی ان کی ایک اچھی کتاب ہے اور بعض کتب ان کی غلط اور قابل ردّ ہیں۔ مثلاً ان کی کتاب السنۃ بھی ہے جس میں انہوں نے سنت کو اصل اور کتاب اللہ (قرآن کریم) کو فرع قرار دیا ہے جو کہ تمام سلف کے مسلک کے خلاف ہے۔ سلف تو کتاب اللہ کو اصل اور سنت کو فرع اور اس کی تفسیر و تشریح قرار دیتے ہیں۔ موسیٰ جار اللہؒ کی جمع کردہ الہام الرحمٰن کو سو فی صد مولانا سندھیؒ کی طرف منسوب کرنا امانت و دیانت کے خلاف ہوگا۔ املائی کتابوں میں استاذ یا مقرر کے علاوہ سامع اور جامع کے الفاظ و تخیلات اور تعبیرات بھی شریک ہوتے ہیں اس کی پوری ذمہ داری استاذ پر ڈالنی جائز نہیں۔ اِلّا یہ کہ استاذ کی نظر سے وہ گزرے اور استاذ اس کی تصدیق کر دے تو پھر اس کی ذمہ داری ہوگی۔ ورنہ املا کرنے والے کی ذمہ داری ہوگی۔ مولانا سندھیؒ کی طرف اکثر منسوب کتابیں اصلاً املائی ہیں۔ ان کے اپنے قلم سے بہت کم مضامین اور کتابیں ہیں جو انہوں نے خود اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ موسیٰ جار اللہؒ اگرچہ وسیع المعلومات کثیر المطالعہ بزرگ تھے لیکن ایک محقق عالم کی جو شان ہوتی ہے وہ ان میں کم تھی، بلکہ تمتع زہر گوشہ یافتم والی بات زیادہ نظر آتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے مولانا سندھیؒ سے کافی استفادہ کیا ہے ہمارے نزدیک تو موسیٰ جار اللہ صاحب بھی صد توقیر و احترام کے لائق ہیں۔ فی الجملہ

صحیح العقیدہ تھے اور روسی استبداد کے مارے ہوئے مظلوم مسلمان تھے۔ اسٹالن نے انہیں ملک بدر کر دیا تھا۔ زندگی کا اکثر حصہ جلاوطنی اور مشکلات میں گزارا۔ موسیٰ جار اللہ صاحب متوفیک کا معنی ممیتک لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ جو لوگوں کے درمیان عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بارے میں مشہور ہوا ہے۔ یہ یہودیوں اور صابیوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے اور یہ بات حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں مشہور ہوئی ہے صابیوں میں سے جو لوگ بنی ہاشم کے انصار تھے ان کے واسطے سے اور یہودیوں میں سے جو لوگ حضرت علیؓ کے انصار تھے ان کے واسطے سے، مسلمانوں کے درمیان اس کی اشاعت حضرت علیؓ کی محبت کے لیے نہیں، بلکہ اسلام اور اہل اسلام کے بغض و نفرت کی وجہ سے تاکہ مسلمان اسلام کے عمومی غلبہ سے رک جائیں۔ اس کے بعد جار اللہ صاحب نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ قرآن میں کوئی صریح آیت نہیں جو حیات مسیح پر دلالت کرتی ہو اور یہ کہ وہ زندہ ہیں اور عنقریب زمین پر اتریں گے۔ یہ محض استنباطات اور تفسیرات ہیں بعض حضرات کی جو شکوک و شبہات سے خالی نہیں۔

(الہام الرحمٰن ج ۲ ص ۴۹)

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ موسیٰ جار اللہ صاحب علم حدیث سے اس قدر تجاہل عارفانہ برت رہے ہیں کہ گویا کہ امت کے تمام اکابر محدثین کو ان احادیث کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا کہ یہ کس پایہ کی احادیث ہیں اور انہوں نے محض ایسے شکوک و شبہات پر مسلمانوں کے عقیدے قائم کر دیے۔ العیاذ باللہ۔ مولانا سندھیؒ کی طرف اس قسم کی باتوں کو منسوب کرنا محض الزام تراشی اور بہتان سے کم نہیں۔ مولانا سندھیؒ نے علم حدیث مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ اور عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے ثقہ اور راسخین فی العلم حضرات سے پڑھا تھا۔ ایسی باتیں ان کی طرف منسوب کرنا سوائے غلط بیانی کے اور کچھ نہیں۔ خدا اس قسم کی گمراہی سے بچائے۔ مولانا سندھیؒ

تو علم حدیث کے بڑے شد و مد سے قائل تھے اور دوسروں کو بھی قائل کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ چہ جائیکہ وہ صحیح اور مستند احادیث کو قیاسیات اور استنباطات کہہ کر رد کر دیں۔ سبحانك هٰذا بهتانٌ۔ !

مولانا سندھیؒ اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں۔ مولانا حمید الدین مرحوم (فراہی) میرے بہت پرانے دوست تھے۔ قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا مذاق (ذوق) متحد تھا۔ اگرچہ طریقے اور پروگرام میں کسی قدر اختلاف رہا۔ وہ بائبل مجھ سے بدرجہا اعلیٰ جانتے تھے اور میں حدیث ان سے زیادہ جانتا تھا۔ جب تک میں ہندوستان میں رہا۔ ان سے ملتا رہا، حدیث شریف کے ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا۔ اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا۔ اسی سال وہ بھی حج کے لیے آئے۔ ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں۔ افکار میں بے حد توافق پیدا ہو گیا تھا، مگر وہاں بھی حدیث ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہو گئی۔ ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا اور کہا حدیث کو ضرور ماننا پڑے گا۔ تنگ آکر فرمانے لگے آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا موطا امام مالک۔ فرمایا ہم اس کو مانتے ہیں میں نے کہا بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے۔

(امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف ص ۵۵)

موطا علم حدیث کی امہات کتب میں سے ایک ہے۔ امام ولی اللہؒ کے نزدیک موطا امام مالک۔ بخاری اور مسلم درجہ اول کی کتابیں ہیں اور ان پر امت کے جمیع طبقات کا اتفاق ہے کہ ان تینوں کتابوں میں موضوع احادیث نہیں۔ راجح مرجوح متکلم فیہ ہونا الگ بات ہے۔ علم و عمل دونوں کے لیے یعنی عقیدہ و عمل کے لیے یہ قابل اعتماد ہیں امام ولی اللہؒ کے نزدیک ان کا استخفاف کرنے والا اہل حق میں نہیں ہوتا، بلکہ اہل بدعت میں شمار ہوگا۔ !

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے حیات مسیح علیہ السلام کے علاوہ التصریح

بما تواتر بہ نزول المسیح میں ان تمام روایات کا استقصا کیا ہے جو سو سے زیادہ ہیں۔ ان سب کو قیاسات اور استنباطات کہنا زیادتی نہیں؟ ان میں سے اکثر روایات صحیح صریح اور درجہ اوّل کی ہیں اور بعض حسن اور اس سے کم بھی ہیں۔

خود مولانا سندھیؒ نے اپنے رسالہ محمودیہ جو انہوں نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے جس میں انہوں نے امام ولی اللہؒ کے افکار سیاسیات کو سمجھایا ہے، تفہیمات الٰہیہ کے حوالہ سے امام ولی اللہؒ کی جامعیت خود ان کے الفاظ میں اس طرح بیان کی ہے۔

فهمني ربي جل جلاله	امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ مجھے
انك العكس فيك نور الاسمين	اللہ تعالیٰ نے یہ بات الہامی طور پر
الجامعين۔ نور الاسم	سمجھائی ہے کہ تجھ میں دو جامع اسموں
المصطفوی و الاسم	کا نور منعکس ہوا ہے ایک اسم مصطفوی
العيسوی عليهما الصلوٰة	کا دوسرا اسم عیسوی علیہما الصلوٰۃ
والتسليمات فعسى ان تكون	والتسلیمات تو عنقریب کمال کے افق
ساداً لافق الكمال	کا سردار بن جائے گا۔ اور قرب الٰہی
غاشياً لاقليم القرب	کی اقلیم پر حاوی ہو جائے گا تیرے
فلن يوجد بعدك مقرب	بعد کوئی متقرب الٰہی ایسا نہیں ہو
الا ولك دخل في تربيته	گا جس کی ظاہری اور باطنی تربیت میں
ظاهراً و باطناً حتى	تیرا ہاتھ نہ ہو، یہاں تک کہ حضرت
ينزل عيسیٰ عليه السلام	عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں۔

(محمودیہ ص۲۶)

چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا سندھیؒ کا جو عقیدہ وخیال ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیں مولانا سندھیؒ کے تلمیذ علامہ محمد صدیق ولی اللٰہی صاحب کی ذاتی لائبریری میں مولانا سندھیؒ

کی شرح سطعات کا جو قلمی نسخہ موجود ہے۔ اس کی عبارت ملاحظہ فرمائیں اور یہ مضمون رسالہ نقیب ملتان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں "انسان کو اپنا حال اور مستقبل خود سوچ کر پروگرام بنانا چاہیے۔ ماضی پر فخر کرتے رہنا احمقوں کا کام ہے اور محض مستقبل میں کسی بڑے مصلح کا منتظر رہنا اس سے بھی زیادہ حماقت ہے۔ اول تو اس کا یقین نہیں کہ وہ مصلح ہمارے زمانہ میں آئے گا۔ فرض کیجئے وہ ہمارے زمانہ میں آتا ہے تو ہم یقین کر سکتے ہیں کہ وہ صرف فعال طاقتوں کو اپنے ساتھ لے گا۔ لولے لنگڑے اور قاعدین کو تو وہ اپنے پاس تک نہیں آنے دے گا۔ اس قسم کی فکر رکھنے کے ہم دشمن نہیں ہیں کہ ایک مصلح آئے گا۔ اس لیے کہ سنی و شیعہ اس میں مبتلا ہیں اور حدیث میں اس کی وضاحت آ چکی ہے۔ اس موضوع پر ہم کسی سے جھگڑا نہیں چاہتے لیکن یہ بات ہم دونوں طاقتوں کو دکھا سکتے ہیں کہ ان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو فعالیت کے ایسے بلند مقام پر پہنچا دیں کہ لوگ اس آنے والے مصلح کے باڈی گارڈ اور وزیر اعظم ہو کر کام کریں ایک مذہبی جماعت کے لیے اس کا ماننا ضروری ہے۔ اس لیے ہم اس کے رد کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ قوموں میں بلند تخیل پیدا کرنا ایک دن کا کام نہیں ہے۔ اگر کسی قوم میں بلند تخیل ہو گیا ہے تو اس میں جو غلطیاں ہوں نکال دینی چاہئیں"۔

(شرح سطعات قلمی صہ ۲۳، ۲۴)

اسی طرح مولوی احمد رضا خان بریلوی نے جو فتویٰ شاہ میر خان قادری کے جواب میں لکھا ہے۔ وہ فتویٰ الجراز الدیانی علی المرتد القادیانی ۱۳۴۰ھ قادیانی مرتد پر خدائی خنجر رسالہ کے صہ ۱۷ مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور" قادیانی صدہا وجہ سے منکر ضروریات دین تھا اور اس کے پس ماندے حیات وفات سیدنا عیسیٰ رسول اللہ علی نبینا الکریم علیہ صلوٰت اللہ وتسلیمات اللہ کی بحث چھیڑتے ہیں جو ایک فرعی سہل خود مسلمانوں میں ایک نوع کا اختلافی مسئلہ ہے جس کا اقرار یا انکار کفر تو درکنار ضلال بھی نہیں"۔

یہ فتویٰ بھی نہایت غلط ہے اور عقیدہ حیات و رفع الی السماء میں تشکیک پیدا کرتا ہے سراسر ضلال و گمراہی اہلِ اسلام میں یہ مسئلہ اختلافی نہیں رہا۔ کسی غیر محقق آدمی یا گمراہ شخص کے قول کو اہلِ اسلام کی طرف منسوب کرنا درست نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور رفع السماء اور نزول۔ یہ اہلِ اسلام کے نزدیک اتفاقی عقائد ہیں۔ یہود و نصاریٰ میں البتہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

مسئلہ حیات و نزول مسیح علیہ السلام امت کے جمیع طبقات کے درمیان ایک مسلمہ مسئلہ ہے اور یہ اعتقادی مسئلہ ہے۔ اس میں تشکیک پیدا کرنا از حد غلط اور گمراہ کن بات ہے۔ قرآنی آیات میں اور صحیح اور صریح احادیث مبارکہ میں اس کی مکمل تشریح موجود ہے حضرت حکیم الامت امام شاہ ولی اللہؒ اور ان کے تمام پیروکار اور علماء دیوبند کا متفقہ عقیدہ ہے اور مولانا سندھیؒ کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ موسیٰ جار اللہ صاحب نے مولانا سندھیؒ کی نسبت سے اس مسئلہ میں جو تشکیک نقل کی ہے بالکل غلط ہے اور اسی طرح محمد نور کی کا حاشیہ بھی گمراہ کن ہے۔ احقر نے ۱۹۶۸ء میں جمعیت العلمائے اسلام کی کانفرنس کے موقع پر حضرت مولانا سندھیؒ کے ایک قدیم شاگرد مولانا عبدالقادر صاحب آف سانگھڑ سے اس مسئلہ پر گفتگو کی تھی۔ اس وقت مجلس میں مولانا عزیز احمدؒ برادر خورد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا پیر وہب اللہ صاحب آف پیر جھنڈا بھی موجود تھے۔ میں نے مولانا عبدالقادر صاحب کے سامنے عرض کیا تھا کہ جناب مولانا سندھیؒ کے قدیم شاگرد ہیں اور ان کے احوال سے بھی اچھی طرح باخبر ہیں۔ اس مسئلہ کی وجہ سے لوگوں میں گمراہی پھیلتی ہے اور مولانا سندھیؒ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مولانا عبدالقادر صاحب نے کہا کہ مولانا سندھیؒ کے بارے میں یہ لوگ غلط بیانیاں کرتے ہیں، اور میں اس کے بارے میں مولانا سندھیؒ کا عقیدہ واضح کروں گا۔ میرے پاس اس کا ثبوت موجود ہے کہ مولانا سندھیؒ کا عقیدہ وہی تھا جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا تھا۔

مولانا عبدالقادر صاحب نے اس کے بارے میں بیان دینے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر افسوس کہ اس کے بعد قریب زمانہ میں مولانا عبدالقادر صاحب بس کے ایک حادثہ میں وفات پا گئے اور یہ بات اسی طرح رہ گئی۔ اس کے علاوہ مولوی محمد معاویہ مرحوم آف کبیر والا بھی مولانا سندھیؒ کے متن اور کتب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے الہام الرحمٰن جلد اول و جلد ثانی کا اردو میں ترجمہ بھی شائع کرایا تھا۔ اس کی اشاعت کے وقت میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مولانا سندھیؒ کی طرف مسئلہ وفات المسیح کی نسبت درست نہیں اس کی کچھ وضاحت ہونی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی طبع دوم کے وقت ایک مختصر سا مضمون شائع کرایا تھا۔

اصل میں وفات مسیح کا مسئلہ مرزائیوں، قادیانیوں اور لاہوریوں نے زیادہ اٹھایا تھا تاکہ وفات مسیح کو ثابت کرنے کے بعد ان تمام احادیث کی تاویل اپنے زعم فاسد کے مطابق مرزائی قادیانی پر چپاں کر سکیں اور یہ لوگ اسی عقیدہ فاسدہ کی بنا پر اور اجرائے نبوت کے قائل ہونے کی وجہ سے تمام طبقات اُمت کے نزدیک مرتد، کافر اور زندیق خارج از اسلام ہیں۔ علماء کرام اور مختلف تنظیموں نے اس سلسلہ میں گذشتہ صدی کے اکثر حصہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ کتابی، تحریری شکل میں، مناظروں اور مباہلوں کی شکل میں، جلسوں کانفرنسوں کی شکل میں، اور اس ملعون مرتد طبقہ و فرقہ کے خلاف ایجی ٹیشن اور تحریکات چلا کر بہت کام کیا اور بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ کیونکہ انگریز ملعون بھی اس فرقہ ملعونہ کی پوری پشت پناہی کر رہا تھا۔ یہاں تک بالآخر ۱۹۷۳ء کے آئین پاکستان میں مسلمانوں کے شدید اور ہمہ گیر مطالبہ پر اس فرقہ ملعونہ کو اس کے اصلی مقام پر رکھا گیا اور کسی قدر اہل اسلام کو اطمینان ہوا۔

محمد نور مرشد کا الہام الرحمٰن کے حاشیہ میں یہ لکھ دینا کہ مولانا محمد انور کشمیریؒ نے بعض تابعین کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام وفات پا گئے ہیں۔ یہ بات سو فیصد

غلط اور اتہام ہے۔ مولانا انور شاہؒ نے اس مسئلہ پر عربی زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور اس کے ہر پہلو پر کلام کیا ہے اور اس مسئلہ کو اتفاقی اجماعی، قطعی قرار دیا ہے اور یہ کہ آج تک اہلِ اسلام میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا اور قرب قیامت میں مسیح علیہ السلام کا نزول اجماعی عقیدہ ہے اور پھر یہ کہہ کر مغالطہ دینا کہ علم کلام کی کتابوں شرح مواقف اور عضدیہ وغیرہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا بہت غلط بات ہے جبکہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی فقہ اکبر میں اور بیان السنۃ یا عقیدۃ الطحاوی میں اس کا ذکر موجود ہے جو علم کلام کا سب سے قدیم اور صحیح ماخذ ہے۔ پھر اس کا انکار کس طرح روا ہو سکتا ہے۔ اس کو بجز گمراہی اور کجروی کے اور کیا تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور اس طرح مولانا ابو الکلام آزادؒ اور بعض دیگر علماء کرام ایک اور بات کا ذکر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دین کو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا ہے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پر تکمیل دین ہو چکی ہے اور تکمیل دین کی آیت قرآن کریم میں نازل ہو چکی ہے۔ اب دین کی تکمیل کسی نئے ظہور پر موقوف نہیں۔ مسیح علیہ السلام اگر دوبارہ زمین پر آئیں گے یا مہدی کا ظہور ہوگا، تو یہ تکمیل دین کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ یہ قیامت کی علامات کے طور پر ہوگا۔ مسیح علیہ السلام کوئی نیا حکم جاری نہیں کریں گے۔ قرآن و سنت کے مطابق ہی عمل کریں گے اور اسی پر لوگوں کو کاربند بنائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قرآن و سنت پر عمل کرنا اور عمل کرانا یہ امت کا فریضہ ہے۔ یہ نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں اور انتظار کریں کہ مسیح علیہ السلام اور مہدی کا ظہور ہوگا تو اس پر عمل مکمل ہوگا۔ یہ نظریہ باطل اور گمراہ کن ہے۔ یہ روافض اور اس قسم کے گمراہ لوگوں کا اعتقاد ہو سکتا ہے نہ کہ اہلِ ایمان کا۔

جناب ظفر حسن ایبک صاحب کے موسیٰ جار اللہ کے متعلق تاثرات

ایبک صاحب آپ بیتی میں لکھتے ہیں:۔

میرا لینن گریڈ کا سفر

مشرقی یونیورسٹی کا تعلیمی سال ختم ہونے کے قریب اپریل ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں ہماری جماعت کو لینن گریڈ کی سیر کو بھیجا گیا۔ لینن گریڈ اور ماسکو کے درمیان جو ریل کی سڑک ہے اس کو زار روس کے حکم سے ایک سیدھی لکیر کی طرح بنایا گیا تھا جس میں نہ کوئی موڑ ہے اور نہ اترائی اور چڑھائی۔ اس وجہ سے ان دو شہروں کا درمیانی فاصلہ کم سے کم رہ گیا ہے۔ قبلہ مولانا صاحب سے بھی کہا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو لینن گریڈ کی سیر کو جا سکتے ہیں۔ اس پر انہوں نے بھی عزیز احمد کو ساتھ لے کر ہمارے گروپ کے ہمراہ لینن گریڈ جانے کا ارادہ کر لیا اور روسی وزارتِ خارجہ کو میرے ذریعہ مسٹر رائسنر (REISNER) کے ہاتھ (ایک زمانے میں کابل کے روسی سفارت خانہ میں اپنے بہنوئی روسی سفیر رسکولنیکوف (ROSKOLNIKOV) کا فرسٹ سیکرٹری رہ چکا تھا اور اب روسی وزارتِ خارجہ کے شعبہ مشرق قریب میں کام کرتا تھا) خبر بھیج دی کہ وہ لینن گریڈ میں روسی مہمان خانہ کی بجائے روسی مسلمانوں کے مذہبی لیڈر موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر مہمان ہوں گے۔ موسیٰ جار اللہ صاحب ایک بڑے جید عالم اور خدا پرست سیاسی لیڈر تھے جن کی قدر و منزلت نہ صرف روسی مسلمانوں کی نظروں میں بہت زیادہ تھی بلکہ سارا عالمِ اسلام جانتا تھا۔ انہوں نے شروع میں بولشویکوں کے ہاتھوں کافی ایذائیں اٹھائی تھیں، لیکن چونکہ وہ بولشویکوں کی سیاست میں دخل نہ دیتے تھے۔ اس لیے ان کو قید سے رہا کر دیا گیا۔ بعد میں ان کو حج پر جانے کی بھی اجازت مل گئی تھی اور اس طرح ان کو اپنے

ضمیر کے مطابق کام کرنے کا پھر موقع مل گیا۔ وہ حج پر غالباً ۱۹۳۰ء میں قبلہ مولانا صاحب سے حجاز میں ملے تھے اور ان کے حلقہ درس سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ میں نے سنا بعد میں وہ حیدرآباد دکن بھی گئے۔ لیکن ان کو انگریزوں نے وہاں آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ پھر وہ ترکی آئے۔ میں ان سے استنبول میں اس وقت ملا تھا جب وہ بیمار تھے اور ان میں کام کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ وہ ترکی سے بعد میں مصر چلے گئے تھے اور وہاں ہی انہوں نے وفات پائی۔ لینن گریڈ میں قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ میں بھی ان کا ایک ہفتے مہمان رہا۔ لینن گریڈ چونکہ روس کے شمالی حصہ میں واقع ہے اور ہمارے قیام کے وقت گرمی کا موسم بھی شروع ہو چکا تھا۔ یہاں دن بہت لمبا ہوتا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا اس لیے ہم کو کوئی ۱۸ گھنٹے کا روزہ رکھنا پڑتا تھا افطار کر کے آرام کی نوبت بھی نہ آتی تھی کہ عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنے کے کوئی دو گھنٹے بعد (یعنی غروب سے کوئی تین گھنٹے پیچھے) صبح صادق کی سپیدی نظر آنے لگتی تھی۔ اگر آپ اور زیادہ شمال کی طرف جائیں تو وہاں گرمی کے مہینوں میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا۔ ایک روز موسیٰ جار اللہ صاحب نے ایسے ملکوں میں روزہ رکھنے کا مسئلہ قبلہ مولانا صاحب سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا "ان ملکوں میں بارہ گھنٹے روزہ رکھنا اور بارہ گھنٹے آزادی سے کھانا پینا چاہیے اور نماز پنج وقتہ بھی اس اصول پر ادا کی جانی چاہیے۔ اسلامی احکام جو ساری دنیا کے لیے ہیں وہ پوری طرح دنیا کے انہی حصوں کے لوگوں پر جاری ہو سکتے ہیں جو ایسی جگہوں میں آباد ہیں جہاں قوانین فطرت اوسط درجہ پر چلتے ہیں۔ بحر منجمد شمالی اور بحر منجمد جنوبی کے ملکوں میں جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے۔ وہاں صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا ناممکن ہے"۔ لینن گریڈ میں موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر رہتے ہوئے مجھے نماز بالکل آزادی سے پڑھنا نصیب ہوئی۔ ماسکو یونیورسٹی میں تو نماز روزے کا نام لینا بھی ممکن نہ تھا۔ میں بڑی مشکل سے چارپائی پر لیٹ کر اور سر کے اشارے سے نماز

ادا کیا کرتا تھا اور کبھی کبھار اگر موقع مل جائے تو فضل الٰہی قربان سے جس کو یونیورسٹی بورڈنگ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا کمرہ علیٰحدہ ملا ہوا تھا، اجازت لے کر اس کے کمرے میں نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ ماسکو جیسے دشمن مذہب شہر میں، فضل الٰہی قربان کا جو اپنے کو کمیونسٹ کہا کرتا تھا۔ مجھے نماز کے لیے اپنے کمرے میں موقع دے دینا ایک بڑی جرأت کا کام تھا کیونکہ اگر کسی کمیونسٹ کو اس کا پتہ چل جاتا تو نہ صرف فضل الٰہی قربان کی پوزیشن خراب ہو جاتی، بلکہ اس کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اسی لیے مجھے کبھی کبھار ایسا موقع دے کر مجھ پر احسان کیا تھا۔ لینن گریڈ کی سیر کو ہم سب ہم جماعت اکٹھے جایا کرتے تھے، مگر قبلہ مولانا صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تھے۔ وہ موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر سے زیادہ باہر نہ نکلتے تھے۔ لینن گریڈ ایک خوبصورت شہر ہے جس کو بنانے پر پیٹر اعظم زار روس نے کروڑوں روپے خرچ کیے تھے۔ یہ شہر دریائے نیوا (NEVA) کے کنارے پر واقع ہے اور آس پاس کی دلدلوں کو مٹی سے پُر کر کے جو سخت زمین بنائی گئی تھی۔ اس پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں ہزاروں مزدوروں نے جن کو بہت کم مزدوری پر ان دلدلوں میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اپنی جانیں دی تھیں۔

(آپ بیتی صفحہ ۴۲ تا ۴۳)

مولانا سندھیؒ کی طرف سے منسوب اکثر تحریرات صحیح نہیں

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی طرف منسوب تحریریں اکثر وہ ہیں جو املائی شکل میں ان کے تلامذہ نے جمع کی ہیں۔ مولانا کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی تحریرات اور بعض کتب بہت دقیق، عمیق اور فکر انگیز ہیں اور وہ مستند بھی ہیں، لیکن املائی تحریروں پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور بعض باتیں ان میں غلط بھی ہیں جن کو ہم املا کرنے والوں کی غلطی پر محمول کرتے ہیں۔ مولانا کی طرف ان کی نسبت درست نہ ہوگی۔ مولانا کا ذہنی پس منظر فکر، ذہانت،

قوت حدس بہت بلند تھا۔ ذہانت اور قوت حافظہ بھی بے مثال تھا اور ان کا ذہن قوت قدسیہ کا مالک تھا۔ دقیق اور مشکل ترین باتوں کی تہہ تک پہنچنا مولانا کا کمال تھا مولانا کا انہماک اور توجہ زیادہ تر قرآن مجید کی طرف رہا ہے۔ مولانا نے زندگی کے کم و بیش پچاس سال قرآن کریم کے مطالعہ اور افہام و تفہیم میں بسر کیے تھے۔ بالخصوص امام ولی اللہؒ کی حکمت اور علوم و فلسفہ کی روشنی میں مشکلات قرآن حل کرتے رہے اور قرآن کے نظام اور اس کے قوانین کو عہد حاضر میں کس طرح سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ مولانا نے قرآن کریم کے پڑھانے میں بھی بہت وقت صرف کیا تھا اور آپ سے پڑھنے والے مختلف استعداد کے حضرات ہوتے تھے۔ کبھی بڑے ذہین و فطین المعی قسم کے علماء ہوتے تھے اور بعض اوقات عام معمولی استعداد کے طلباء بھی شریک ہوتے تھے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی ہوتے تھے اور قدیم درس نظامیہ کے فارغین بھی۔ مولانا کو خدا تعالیٰ نے ایسی صلاحیت بخشی تھی کہ دوسرے عالی مرتبت علماء چھ ماہ میں بھی اتنا قرآن کریم سے روشناس نہیں کرا سکتے تھے۔ جتنا مولانا ایک ماہ میں کر دیتے تھے۔ مولانا سندھیؒ سے پڑھنے والے اور استفادہ کرنے والے حضرات کی فہرست بہت طویل ہے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے مولانا سندھیؒ سے حدیث بھی پڑھی اور قرآن کریم بھی۔ اور پھر مولانا نے ان سے وعدہ لیا کہ ساری عمر قرآن کریم ہی پڑھاتے رہنا۔ مولانا لاہوریؒ نے آخر دم تک اس وعدہ کو کما حقہ پورا کیا۔ کم و بیش پانچ ہزار علماء کو قرآن کی تفسیر پڑھائی اور عوام کو درس قرآن کے ذریعہ مستفید بنایا، جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور خاص جماعتوں کو مشکوٰۃ شریف اور حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھاتے تھے اور عوامی حلقوں کی اصلاحات تو لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ اسی طرح حضرت مولانا حکیم فضل الرحمن صاحب نے بھی مولانا لاہوریؒ کے ساتھ ہی قرآن کی تفسیر مولانا سندھیؒ سے پڑھی تھی اور اس کے علاوہ مشکوٰۃ شریف بھی پڑھی تھی۔ تقریباً پچاس سال کے بعد بھی مولانا سندھیؒ کی تقریریں ان کو یاد تھیں۔ حکیم صاحب ایم بی بی ایس بھی تھے اور حکیم اجمل خان کے مایہ ناز

تلامذہ میں سے تھے۔ طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر تھے اور متعدد طبی کتب کے مصنف تھے پھر حیدر آباد دکن میں نظامیہ طبی کالج کے وائس پرنسپل ہو گئے تھے۔ احقر نے اسی دور میں حکیم صاحب سے پڑھا تھا۔ حکیم صاحب مولانا سیف الرحمٰن ٹونکی کے بھانجے تھے۔ مولانا سیف الرحمٰن حضرت گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے انہوں نے جنگِ آزادی میں بہت کام کیے۔ وہ بھی افغانستان میں مولانا سندھیؒ کے ساتھ تھے۔

مولانا سلطان محمود صاحبؒ سابق صدر مدرس فتح پوری دہلی بھی مولانا سندھیؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ انہوں نے بھی چند رسالے لکھے ہیں جن میں مولانا سندھیؒ کے افکار کو سمویا ہے اور اسی طرز پر قرآن کریم کی تعلیم بھی آخر تک دیتے رہے۔

مولانا عزیز احمد صاحبؒ برادر خورد مولانا احمد علی لاہوریؒ جو سفر کابل میں آپ کے ساتھ رہے۔ پھر مکہ مکرمہ میں بھی آپ کے ساتھ رہے۔ آپ کے خدمت گزار کے طور پر ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ انہوں نے خود بیان کیا تھا کہ قرآن کریم کے علاوہ شرح ملا جامی اور قطبی میں نے مولانا سے پڑھی تھی۔ حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھی تھی اور کہتے تھے جب میں نے الخیر الکثیر مولانا سے پڑھنے کی کوشش کی تھی تو اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ یہ بہت زیادہ مشکل تھی اور میں چونکہ قطبی سے آگے تعلیم مختلف وجوہات کی بنا پر جاری نہ رکھ سکا۔ اس لیے الخیر الکثیر پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مولانا عزیز احمد صاحبؒ آخر تک مولانا سندھیؒ کے افکار و طریق کے حامل اور عامل رہے۔

مولانا خواجہ عبدالحیٔ فاروقی صاحبؒ بھی مولانا سندھیؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ انہوں نے بھی قرآنی افکار کے سلسلہ میں سورۃ بقرہ کی تفسیر الخلافۃ الکبریٰ اور آخری پارہ کی تفسیر بھی رقم فرمائی ہے اور ان میں مولانا سندھیؒ کے افکار عالیہ سے مکمل استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانا صبغۃ اللہ بختیاری مدراسیؒ نے بھی مولانا سندھیؒ سے استفادہ کیا تھا۔ مولانا قاری عبدالکریم ترکستانیؒ اور مولانا محمد طاہر آف پنج پیرؒ بھی مولانا سندھیؒ سے مکہ مکرمہ میں

پڑھتے رہے ہیں۔ مولانا محمد طاہر نے مولانا سندھیؒ سے حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھی تھی اور اس کی تقریر بھی ضبط کی تھی۔ اسی طرح مولانا محمد عبداللہ عمر پوریؒ بہاول پور والے فاضل دیوبند نے بھی مکہ مکرمہ میں مولانا سندھیؒ سے پڑھا تھا۔ علامہ محمد صدیق صاحب آف یزمان نے اور مولانا عبیداللہ انورؒ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے بھی مولانا سندھیؒ سے استفادہ کیا تھا۔ آخری دور میں سب سے زیادہ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے مولانا سندھیؒ سے پڑھا اور فائدہ اٹھایا۔ مولانا قاسمی فاضل دیوبند اور جامع المعقول والمنقول مدرس عالم ہیں۔ آپ نے کئی کتابوں پر حاشیے بھی لکھے ہیں۔ قدوری کا حاشیہ اور اس کا عالمانہ مقدمہ تو بہت متداول ہے۔ آپ نے مولانا سندھیؒ کی مشہور کتاب التمہید بھی اپنے حاشیہ کے ساتھ شائع کرائی جو کہ بہت بڑا کام ہے اور خیر الکثیر کا اردو ترجمہ جو آپ نے مولانا سندھیؒ سے پڑھ کر ضبط کیا تھا۔ وہ بھی شائع کرایا ہے اور امام ولی اللہؒ کی متعدد کتابیں بمع مقدمات وضروری تشریحات کے شائع کرائی ہیں۔ پہلے الرحیم میں اور آج کل الولی میں آپ کے مضامین اور اداریتی نوٹ شائع ہوتے ہیں جو بہت قیمتی علمی وضروری مواد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مولانا کچھ عرصہ رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے ہیں بارک اللہ فی علمہ و مساعیہ و عمرہ۔ مولانا مقبول عالم لاہوری مرحوم اور غازی خدا بخش صاحبؒ بھی حضرت سندھیؒ سے استفادہ کرنے والے لوگوں میں شامل تھے۔ مولوی بشیر احمد بی اے لدھیانوی مرحوم بھی مولانا کے معتمد تھے اور انہوں نے مولانا کی متعدد تحریرات جو قرآنی سورتوں پر مشتمل ہیں شائع کرائی ہیں۔ تفسیر سورۃ فاتحہ، تفسیر سورۃ قتال، تفسیر سورۃ فتح، تفسیر سورۃ مزمل ومدثر تفسیر سورۃ العصر تفسیر سورۃ اخلاص اور تفسیر معوذتین۔ حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ و تشریح ابتدائی ستر ابواب تک جو مولانا عبداللہ لغاری صاحبؒ نے مولانا سندھیؒ سے مکہ مکرمہ میں ضبط کیا تھا۔ اسکو بھی مولانا بشیر احمد صاحب نے مرتب کر کے لاہور میں بیت الحکمت کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا بشیر احمد صاحب کے

پاس سطعات کا ترجمہ وتشریح جو مولانا سندھیؒ سے انہیں حاصل ہوئی وہ بھی انہوں نے خود تو شائع نہیں کرائی، بلکہ وہ مولانا سید محمد متین ہاشمی کو انہوں نے دی تھی اور وہ انہوں نے شائع کرائی ہے۔ رسالہ محمودیہ جو مولانا سندھیؒ نے عربی اور فارسی میں ترتیب دیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مع متن شیخ بشیر احمد صاحب لدھیانوی نے بیت الحکمت کی طرف سے شائع کیا تھا۔ مولانا بشیر احمد صاحب مرحوم نے اور بھی بعض مضامین اس سلسلے میں لکھے تھے مولانا بشیر احمد صاحب زندگی کا اکثر حصہ اسکول میں پڑھاتے رہے۔ علوم دینیہ کی تحصیل باقاعدہ نہیں کی تھی۔ عربیت سے کچھ مناسبت تھی۔ مولانا سندھیؒ سے کافی استفادہ کیا تھا لیکن فلسفہ ولی اللہی کی غامض باتوں کے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ احقر کے ساتھ مولانا بشیر احمد مرحوم کی متعدد بار ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے اس کا اقرار کیا تھا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں درس نظامیہ کی تعلیم حاصل نہ کر سکا، لیکن مولانا بشیر احمد صاحب مرحوم کی طبیعت میں استقامت تھی اور املائی تحریریں بھی ان کی اکثر محتاط ہیں۔

خلاصۃ القرآن کے نام سے جو ایک مختصر سا کتابچہ ہے۔ وہ بھی ایسا ہے کہ مولانا سندھیؒ جس قرآن کریم پر تلاوت کرتے تھے، تو مختلف سورتوں پر وہ کچھ اشارات نوٹ کر دیتے تھے، چنانچہ ان کو جمع کر کے اور ترتیب دے کر مولانا عزیز اللہ صاحب آف پنوں عاقل نے اسے شائع کرایا ہے۔ یہ کوئی مکمل نوٹس نہیں، بلکہ اشاراتی زبان ہیں بعض باتیں بہت مغلق سی ہیں اور بعض مشتبہ بھی ہیں۔

المقام المحمود تفسیر پارہ عم مولانا عبداللہ لغاری مرحوم نے مکہ مکرمہ میں مولانا سندھیؒ سے سن کر اردو زبان میں قلمبند کی تھی۔ وہ بھی ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا صاحب کے تقدیم وتصحیح کے ساتھ شائع کرائی گئی ہے۔ اس میں بھی بعض باتیں قابل گرفت ہیں۔ اس کی بھی ذمہ داری مولانا سندھیؒ پر نہیں، بلکہ مولانا لغاریؒ اور مذکورین پر ہوگی۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

یہ ایک مختصر سا مقالہ جس کو مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا اور پھر اس کو مولانا نور الحق علویؒ سابق پروفیسر اورینٹیل کالج لاہور نے مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اس کی تشریح حواشی بھی لگائے۔ مولانا نور الحق علویؒ خود مولانا شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور نہایت ذہین، کثیر المطالعہ اور ثقہ بزرگ تھے۔

امام ولی اللہؒ کی تحریک کو سمجھنے کے لیے یہ کتابچہ بہت قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے۔ تحریک کے تمام ادوار اور اشخاص اور اصول اس میں واضح کیے گئے ہیں۔ امام ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے وہ تمام حضرات جو ان کے افکار و نظریات کے حامل تھے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے والے اور اس کی تشریح و توضیح کرنے والے امام ولی اللہؒ کے بیٹے، پوتے اور ان کے تلامذہ اور پھر ان کے اتباع اکابر علمائے دیوبند اور ان کی مساعی وجہود کے بارہ میں اس قسم کے معلومات کسی دوسری کتاب سے ملنے مشکل ہوں گے۔ بعض حضرات کو اس کی بعض باتوں سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ یہ بات ہر جماعت اور ہر فرد کے بارے میں ہو سکتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ مقالہ بہت گراں قدر اور وقیع معلومات پر مشتمل ہے۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (حکیم الاسلام) بھی مولانا سندھیؒ سے مستفید ہونے والوں میں سے تھے۔ آخری دور میں مولانا سندھیؒ نے قاری صاحب کو اپنے سامنے بٹھا کر حجۃ اللہ البالغہ کے چند خاص مقامات خود پڑھائے اور پھر ان کو مامور کیا کہ اس طرح حجۃ اللہ البالغہ کو پڑھاؤ، چنانچہ قاری صاحب آخری دور میں حجۃ اللہ البالغہ اسی طریق پر پڑھاتے تھے۔ قاری صاحب کو جب پتہ چلا کہ مولانا سندھیؒ کی کتاب التمہید کسی بزرگ کے پاس موجود ہے تو انہوں نے اس کی نقل حاصل کی، چنانچہ قاری صاحب نے اس کتاب کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

التمہید لتعریف ائمۃ التجدید

یہ کتاب ایک تاریخی اور علمی و سیاسی مرقع ہے جو حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار صالحہ کا ثمرہ ہے۔ اس کی جلد سے جلد طبع اور شائع ہونے کی ضرورت ہے۔ احقر نے بھی اس کی ایک نقل کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے لیے کرائی ہے۔

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حال وارد کراچی
۵۔ نومبر ۱۹۵۵ء

المقام المحمود

جو مولانا عبداللہ لغاری نے ضبط کی تھی کچھ تو براہ راست مولانا سندھیؒ سے انہوں نے سن کر لکھی تھی اور کچھ بالواسطہ اس کا ابتدائی حصہ ڈاکٹر منیر احمد مغل صاحب نے مرتب کیا ہے۔ مغل صاحب نے بڑی محنت اور تحقیق سے اس کو مرتب کیا ہے اور ڈاکٹر پالیپوٹہ سے بھی اس سلسلہ میں تعاون حاصل کیا ہے۔ ابتدا میں مقدمہ مضامین مکمل فہرست اور مولانا سندھیؒ کے افکار و خیالات کا اجمالی تذکرہ، ان کی سوانح حیات اور تعلیمی سلسلہ اور دیگر اشغال اور کچھ سیاسیات پر بھی کلام کیا ہے۔ مولانا سندھیؒ کی عربی تصانیف کا ذکر بھی ہے اور پھر اس امالی کے مضامین کی سرخیاں بہت اچھے طریق پر لگائی ہیں، لیکن تفسیری نکات میں بعض باتیں جن کا ذکر مغل صاحب نے مولانا سندھیؒ کی نسبت سے کیا ہے جیسے اذن اللہ کا مفہوم گائے کو ذبح کرنے کا مفہوم۔ تلاوت کا مفہوم۔ بدی کا مفہوم اور اور یوم الحساب سے مراد۔ وغیرہ باتیں ایسی ہیں جو امام ولی اللہؒ کی حکمت اور ان کے طریق سے مناسبت نہیں رکھتی اور نہ مولانا سندھیؒ کا منشاء ہو سکتا ہے۔ مولانا سندھیؒ مولانا شاہ ولی اللہؒ اور مولانا شیخ الہندؒ کے طریق سے باہر نہیں نکلتے۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ املا کرنے والوں نے مولانا سندھیؒ کی تقریر کو یا تو سمجھا نہیں، یا اپنے ذہن کے

مطابق کشید کیا ہے۔ یہ قابل اعتبار نہیں اور نہ لائق اعتناء ہیں۔

ڈاکٹر منیر احمد صاحب مغل نے بہت سی جگہوں میں غلط سلط تفسیر بیان کی ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ گویا مولانا سندھیؒ کی بیان کردہ تفسیر ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ "فانظر الی حمارک" عزیر علیہ السلام کے واقعہ میں لکھتے ہیں: اپنی سواری تلاش کر کے اس پر سوار ہو جاؤ اور موت و حیات کا معنی مردہ قوموں کا زندہ ہونا، کس قدر غلط تفسیر ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں پرندوں کے بارہ میں فَصُرْهُنَّ کو صرف سدھانا اور مانوس کرنے کے معنی پر محمول کیا ہے۔ امام رازیؒ نے تو صرف اصفہانی کا ایک مرجوح سا قول نقل کر دیا ہے اور ادھر جمہور مفسرین جو معنی بیان کرتے ہیں اس کو چھوڑ کر صرف مجازی معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس مقام پر مولانا سندھیؒ کی جو تقریر الہام الرحمٰن میں موسیٰ جار اللہ صاحب نے نقل کی ہے، وہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ اس میں مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ جس نے ان آیات کی تاویل کی ہے اور ان کو معنی مجازی پر محمول کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ احیاء حقیقی نہیں تھا، بلکہ یہ تشبیہ بالحیوٰۃ تھا۔ مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو ہم انبیاء علیہم السلام کے طریق سے بعید خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ معنی مجازی مراد لینے والا اس تاویل سے کوئی فساد والا مطلب نہ لیتا ہو۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اعادہ حیاۃ ہم جب نباتات میں مشاہدہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کیوں نہیں زندہ ہو سکتے۔

(الہام الرحمٰن صفحہ ۳۱۲ ج ۱)

مولانا سندھیؒ کی تصنیفات

(۱) رسالہ محمودیہ جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

(۲) امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف، یہ نہایت مفید کتاب ہے

جس میں مولانا سندھیؒ نے پہلے تمہیدی امور ذکر کیے ہیں جن میں علوم وفنون حاصل کرنے کے اصول واستعداد کے بارہ میں امام ولی اللہؒ اور ان کے اکابر واسلاف اور اخلاف سب کے طرز تکمیل کا ذکر کیا ہے۔ پھر قرآن کریم اور تفسیر کے متعلق قواعد وضوابط اور ضروری باتیں اور مشکلات قرآن کو حل کرنے کے طریقے اور تفسیر کے اہم ترین مباحث کا ذکر ہے۔ پھر تیسرے باب میں علم حدیث اور حدیث بطور شرح قرآن اور طبقات حدیث اور حجیت حدیث کے دقیق علمی مباحث اور کتب حدیث اور محدثین کے اذہان و مراتب اور امہات کتب حدیث کے اصولی مباحث ذکر کیے گئے ہیں۔ باب چہارم میں علم فقہ کا مفید ہونا اور بطور قانون نفاذ عرب وعجم کے اذہان کا تفاوت اور سلاطین کا رجحان اور فقہ وحدیث میں تطبیق اور امام ولی اللہؒ کا فقہ میں مقام اور حنفی فقہ کی ترجیح کی دقیق وجوہات وغیرہ کا ذکر ہے۔ باب پنجم میں تصوّف اور فلسفہ کا بیان ہے اس کتاب میں جابجا مولانا نور الحق علویؒ کے نہایت مفید حواشی بھی ہیں۔

(۳) ۱۳۰۷ھ میں طالب علمی کے دور میں مولانا نے ایک کتاب "مراصد الوصول الی مقاصد الاصول" تصنیف کی تھی جس کو مولانا شیخ الهندؒ نے پسند فرمایا تھا۔ (التمہید ص۱)

مولانا سندھیؒ کی مفید تصانیف جن کا ذکر خود انہوں نے اپنی کتاب التمہید میں کیا ہے۔ ان میں سے۔

(۴) تعلیق علی شرح معانی الآثار للطحاویؒ۔

(۵) تعلیق علی فتح القدیر لابن الہمامؒ۔

(۶) بلوغ المرام کی شرح فتح الاسلام لا بواب بلوغ المرام (چند ابواب کی شرح ہے)

(۷) سفر السعادۃ للفیروز آبادی کے کچھ حصّہ کی شرح۔

(۸) تخریج ما فی الباب للامام الترمذیؒ کا کچھ حصہ

(۹) غنیۃ الطالبین کی احادیث کی تخریج۔

(۱۰) تہذیب رفع الیدین للامام البخاریؒ

(۱۱) تنسیق احادیث بدء الوحی من الجامع الصحیح للامام البخاریؒ (التمہید صـ ۱۵)

(۱۲) مولانا کی کتاب التمہید، عربی زبان میں تقریباً پانچ صد صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب ہے جس میں اسانید علم حدیث اور فقہ اور رجال کا ایسا مفید اور جامع تذکرہ ہے جو کسی اور کتاب میں شاید نہ مل سکے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے التمہید کا مطالعہ بھی احقر نے کچھ تھوڑا بہت کیا ہے۔ رسالہ محمودیہ حکمت کا اجمالی تعارف سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ لیکن مولانا کی نمبر چار سے گیارہ تک کتب رسائل احقر کو دستیاب نہیں ہو سکے۔ باقی مولانا کی املائی کتب و رسائل کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

(۱۳) مولانا کا ایک خطبہ ہے جو آپ نے ۱۹۱۴ء میں کابل جانے سے پہلے دیا تھا۔ "قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے" کے نام سے طبع ہوا ہے۔ ایک سو دس صفحات کا یہ رسالہ بہت مفید ہے اور قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم کے بعض حقائق کو سمجھنے کے لیے کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ بالخصوص واقعات و قصص کی تشریح اور ان کے احکام و قوانین کے ساتھ انطباق بہت عمدہ طریق پر کیا گیا ہے۔

(۱۴) اس کے علاوہ مولانا کے چند خطبات بھی ہیں جو انہوں نے جلاوطنی سے واپسی کے بعد مختلف کانفرنسوں اور اجتماعات میں پڑھے تھے۔ ان میں چونکہ بعض خطبات بحالتِ بیماری اور سفر اور بعض دیگر ذہنی کوائف کی ناہمواری کی حالت میں لکھے گئے تھے۔ اس لیے ان میں بعض جگہ پر اضطراب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اکثر خطبات بہت عمدہ ہیں اور اجتماعیات سیاسیات کے سلسلے میں گرانقدر معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مولانا کی بعض تحریریں مثلاً ہمعات کا دو صفحہ کا مقدمہ اتنا عمدہ ہے کہ امام شاہ ولی اللہؒ کے اکثر حکیمانہ رسائل و کتب کو سمجھنے میں بہت ممد ہے اور اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ مولانا کا ذہنی تفوق اور علمی وسعت کس قدر وسیع ہے۔

مولانا مسعود عالم ندویؒ کا ذکر

مولانا مسعود عالم ندویؒ مرحوم نے بھی ایک کتابچہ مولانا سندھیؒ کے رد میں لکھا ہے اس کا عمدہ اور شاندار تعاقب تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نے کیا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ مرحوم خاندانی طور پر غیر مقلدیت کے پیروکار تھے اور ندوہ میں تعلیم حاصل کی کسی قدر اعتدال تو ان میں پیدا ہو گیا تھا۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں سید سلیمان ندویؒ میں اس دور میں کسی قدر ظاہریت بھی پائی جاتی تھی۔ اگرچہ وہ حنفی مسلک پر عامل رہے، لیکن حنفیت میں پختگی اور تصلب ان میں حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی بیعت کے بعد پیدا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ ندوۃ میں مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ۔ اور مولانا حفیظ اللہ فرنگی محلیؒ جیسے پختہ کار احناف کی تعلیم و تربیت کا بھی بڑا اثر تھا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ بھی حنفیت میں بہت راسخ تھے۔ بہرحال مولانا مسعود عالم ندوی مولانا ابوالحسن علی کے رفیق تھے اور اس دور میں حسن اتفاق سے مغرب (مراکش) کے ایک عالم جو مالکی المذہب تھے، لیکن طبیعت میں تعصب نہیں تھا۔ ان کی اس غیر تعصب والی خصلت کو لوگ ظاہریت پر محمول کرتے تھے۔ وہ عالم ڈاکٹر تقی الدین البلالی المراکشی تھے۔ یہ فرانس کے استعمار کے مارے ہوئے جلا وطن۔ تھے۔ حسن اتفاق سے یہ وارد ہندوستان ہوئے تو ندوہ والوں نے انہیں بطور معلم رکھ لیا۔ جدید عربیت میں بہت ماہر تھے مخلص بھی تھے۔ انہوں نے

ندوہ والوں کو عربیت جدیدہ میں تربیت دے کر بہت کام کیا۔ مولانا مسعود عالم ندوی بھی ان کے شاگرد تھے اور پھر ندوۃ العلماء کے توسط سے لکھنؤ میں ایک عربی زبان کا مجلہ الضیاء بھی نکالتے تھے۔ اس کی عربی معیاری ہوتی تھی۔ اس لیے ان کی شہرت بہت تھی اسی دوران مودودی جماعت (جماعتِ اسلامی) کا تولد ہوا مولانا مسعود عالم بھی اس کے بانی ارکان میں سے تھے۔ مولانا ابوالحسن علی۔ مولانا منظور نعمانی اور مولانا امین احسن اصلاحی اور اس قسم کے بہت سے حضرات مودودی صاحب کے ساتھ شریک ہوئے لیکن سب پر بہت جلد ہی حقیقت حال منکشف ہوتی رہی اور ایک ایک کر کے جماعت سے الگ ہوتے رہے۔ کوئی ایک سال بعد کوئی دو سال بعد چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں یہ اعلان کیا کہ سولہ سال میں ایک گم کردہ راہ قافلے کے ساتھ چلتا رہا۔ اب میں اس سے الگ ہو کر حیران کھڑا ہوں۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب باوجودیکہ خود بھی ان کے افکار تجدد پسندانہ ہیں۔ وہ ابلیس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے اور رجم حدود کے اندر داخل نہیں اور معراج خواب کا واقعہ تھا، لیکن بایں ہمہ وہ مودودی صاحب کے بارے میں کہتے تھے کہ لَا فَرْقَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ پرویز۔ اسی طرح اس جماعت کے صوبہ مدارس کے قیم حضرت مولانا صبغۃ اللہ بختیاری بھی ایک عرصہ تک اس میں رہے آخر کار یہ کہہ کر کہ اس جماعت کے امیر مولانا مودودی کو میں ضال و مضل سمجھتا ہوں جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مولانا منظور نعمانی صاحب پر تو ایک سال کے اندر ہی حقیقتِ حال واضح ہو گئی تھی۔ مولانا ابوالحسن ندوی دو سال کے بعد اس سے الگ ہو گئے، لیکن ان دونوں حضرات نے اس جماعت کی خرابیوں کو کئی سال بعد واضح کیا۔ ابتداء میں خاموش رہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے حضرات جیسے مولانا عبدالغفار حسن جو سلفیت اور غیر مقلدیت میں نمایاں تھے۔ وہ بھی الگ ہو گئے۔ غازی عبدالجبار مرحوم اور اسی قسم کے بہت سے حضرات اس جماعت سے الگ ہو گئے۔ بعض حضرات جو

جماعت میں داخل تو نہیں تھے، لیکن اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے، وہ بھی چوکس ہو گئے۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے بھی کافی عرصہ کے بعد اس جماعت کے مفاسد کو کتاب کی شکل میں ظاہر کیا اور شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحبؒ نے بھی کتاب لکھ کر اس جماعت کے مفاسد کو واضح کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی ایک کتابچہ لکھا اور واضح کیا کہ مودودی صاحبؒ دین کی بعض بنیادی اصطلاحات کے بارے میں غلط عقیدہ رکھتے ہیں۔ مولانا دوست محمد قریشی مرحوم نے بھی ایک دفعہ احقر کے سامنے یہ اقرار کیا تھا کہ ہم لوگ بھی پندرہ سال تک دھوکے میں رہے۔ ہم خیال کرتے تھے کہ ہمارے شیخ حضرت مدنیؒ سیاسی آدمی ہیں اور مودودی صاحب بھی سیاسی آدمی ہیں اور سیاستدان ایک دوسرے کے خلاف نظریات رکھتے ہیں، لیکن جب مولانا مودودی صاحب کی کتاب خلافت و ملوکیت سامنے آئی تو ہمیں یقین ہوا کہ یہ شخص تو فاسد الاعتقاد ہے اس کا موقف صحابہ کرامؓ کے بارے میں رافضیوں جیسا ہے اور ہم اپنی غلطی کی اسٹیج پر تلافی کرتے ہیں کیونکہ خلافت و ملوکیت میں حضرت امیر معاویہؓ۔ حضرت عمرو بن العاصؓ سعد بن عبادہؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور خود حضرت علیؓ کے خلاف غلط قسم کے الزامات اور ریمارکس (REMARKES) ہیں جو کسی بھی سنی مسلمان کے لائق نہیں۔ حضرت سعد بن عبادہؓ سے عصبیت جاہلیہ نکلی نہیں' العیاذ باللہ اور مغیرہ بن شعبہؓ نے بدنیتی سے حضرت معاویہؓ کو غلط مشورہ دیا تھا اور امیر معاویہؓ خود بھی اور اپنے گورنروں سے ممبروں پر حضرت علیؓ اور اہل بیت کو گالیاں دیتے تھے۔ العیاذ باللہ یہ صریح بہتان ہے ان حضرات کے ذمہ! افسوس کی بات ہے کہ مولانا مسعود عالم ندویؒ کو مولانا سندھیؒ کی حنفیت سے چڑ ہے اور وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ مقلدیت و غیر مقلدیت یا سلفیت و حنفیت کا تنازعہ کوئی کفر و اسلام کا تنازعہ تو نہ تھا، بلکہ راجح و مرجوح کا تنازع تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ حنفیت سے اتنا بغض اور مودودیت کی رکنیت و حمایت جس

کے افکار و خیالات سراسر گمراہی پر مبنی ہیں اور بالاتفاق علماء راسخین نے خواہ وہ احناف ہوں جیسے علماء دیوبند یا غیر مقلد ہوں جیسے مولانا اسمٰعیل سلفی اور مولانا حافظ محمد گوندلوی اور حکیم مودود صاحب وغیرہ حضرات نے کتابیں اور رسالے لکھ کر مودودی جماعت کی گمراہیوں اور کجرویوں کو واضح کیا ہے، کیونکہ مودودی صاحب راسخین فی العلم میں سے نہیں تھے، بلکہ نوابت (خود رو علماء) میں سے تھے۔ کثیر المطالعہ، وسیع المعلومات اور صاحب تحریر ہونے کے باوصف ؟ فکر صحیح نہیں تھی۔ مزید برآں مجتہدانہ غرور بھی بہت زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے تمام اکابر کے تراجم قرآن کو "بے جان ترجمے" کہتے تھے، کیونکہ جاندار ترجمہ تو مودودی صاحب کا ہی ہو سکتا تھا اور پھر تفسیر میں جابجا فاش علمی اور اعتقادی غلطیاں مثلاً الم کا مطلب ساری امت بھول گئی۔ العیاذ باللہ اور ایلاء کا بغیر قسم کے واقع ہونا اور مسیح علیہ السلام کی حیات و رفع الی السماء کو مشتبہات میں شمار کرنا اور ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں کہنا کہ راستہ کی منزل میں وہ شرک میں آلودہ رہے۔ منزل پر پہنچ کر توحید کا اعتقاد پختہ ہوا۔ العیاذ باللہ اور نوح علیہ السلام کی دعا کرنے کو جذبہ جاہلیت سے تعبیر کرنا اور یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں اور آدم علیہ السلام کا اطاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں گر جانا اور داؤد علیہ السلام میں خواہشات نفسانیہ کی آلودگی اور صحیح احادیث کو عقل کے خلاف سمجھ کر رد کر دینا اور یہ کانا دجال وغیرہ افسانے ہیں ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں اور انصار مدینہ کی قربانی اور ایثار جس پر نصوص قرآنیہ شاہد ہیں۔ اس کو یہودی اخلاق کا اثر قرار دینا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس پر ان پڑھ بدوی کا لفظ اطلاق کرنا کس قدر افسوسناک امور ہیں۔ مسعود عالم صاحب کو ان میں سے کوئی بات بھی نظر نہ آئی۔ مولانا سندھیؒ نے اگر یہ لکھ دیا کہ مولانا ولایت علی صادق پوریؒ اور ان کے رفقاء سید احمد شہیدؒ کی غیوبیت کے عقیدہ کے قائل ہو گئے تھے، تو بات

غلط نہ تھی۔ یہ بات ان کی کتابوں سے ثابت ہے یا مولانا سندھیؒ نے امام شوکانیؒ کے بارے میں کہا کہ وہ زیدی شیعہ تھے تو اس میں کون سی بات غلط تھی امام شوکانی فی الواقعہ زیدی شیعہ تھے۔ شیعوں میں یہ گروہ ہی ایک ایسا گروہ ہے جو اہل السنۃ کی طرف اقرب ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی غیبوبت کا عقیدہ ایسا ہی فاسد تھا جس طرح مہدی جونپوری کا عقیدۂ مہدودیت اور مہدی سوڈانی کا عقیدہ مہدودیت اگرچہ ان حضرات کے عزائم خراب نہیں تھے۔ ایک نے مستبد اور ڈکیٹر (DICTATER) حکمرانوں کے خلاف قوت حاصل کرنے کے لیے یہ دعویٰ کیا تھا اور دوسرے نے انگریز کی ظالمانہ طاقت کو مٹانے کے لیے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ غلطیاں معاف فرمائے۔ مولانا مسعود عالم آخر تک مودودیت کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے اور دار العروبہ میں مودودیت کی تعریب کرتے ہوئے اور اس کی خدمت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔

فسوف ترىٰ اذا انکشف الغبار

افرس تحت رجلك ام حمار

مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کا ذکرِ خیر

مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کا بھی ایک مضمون مولانا سندھیؒ کے رد میں ہے۔ ایک تو رسالہ معارف کا ادارتی نوٹ ہے جو سیّد سلیمان ندویؒ نے معارف میں ۱۹۴۳ء کو لکھا تھا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے مولانا سندھیؒ کے متعلق اقرار بھی کیا ہے کہ مولانا سندھیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم و افکار، کتب اور فلسفہ کا بڑا وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ اور ان کی تمام کتب و فنون پر عمیق نظر رکھتے ہیں اور اجمالاً اور تفصیلاً مولانا سندھیؒ نے شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ اور حکمت کو اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بعض باتوں پر جو اعتراض کیا ہے وہ درست

نہیں۔ بعض باتیں یقیناً ایسی ہوں گی جن پر گرفت ہو سکتی ہے اور ہر صاحبِ فکر و نظر عالم کو گنجائش اور اختیار ہوتا ہے کہ وہ نقد کرے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی ایسی غلطیاں کی ہیں جو ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی قرآنی غلطیاں ایک رسالہ میں مولانا امداد صابری نے مرتب کرکے پیش کی ہیں۔ وہ رسالہ بھی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ سیرت میں بعض باتوں سے سید سلیمان ندویؒ نے رجوع بھی کیا ہے، مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ مولانا سندھیؒ کی طرف اشتراکیت و الحاد کی نسبت جن لوگوں نے کی ہے وہ بڑی زیادتی ہے۔ سید سلیمان ندوی صاحبؒ نے مولانا سندھیؒ کے اس تجزیہ پر نقد کیا ہے کہ مولانا کے نزدیک سید شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کے اسباب میں شوکانیت وہابیت یا غیر مقلدیت کی آمیزش بھی ہوگئی تھی۔ سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "مگر جہاں تک خاکسار کے علم کا تعلق ہے اس تحریک کے علمبرداروں میں فقہی جنگ و جدال یا آمین اور رفع یدین کے ذریعے رد بدعت یا اتباع سنت کے خیال نے کبھی راہ نہیں پایا" سید سلیمان ندویؒ صاحب جو کچھ بھی اس کی توجیہہ کریں حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کے اسباب میں کسی نہ کسی درجہ تک وہابیت غیر مقلدیت کو ضرور دخل ہے۔ نیز سید احمد شہیدؒ کا ایک دم انقلاب لانا اور افغانوں پر ان کے علاوہ دوسروں کو حاکم مقرر کر دینا یہ بات اصولاً غلط تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل " یکرم کریم کل قوم ویولیہ علیہم " موجود ہے۔ پھر پٹھانوں کے صدیوں کے رواج اور دلوں میں بسی ہوئی رسومات و بدعات کا ایک دم تشدد سے ازالہ ممکن نہیں تھا۔ نیز ان کی لڑکیوں کے نکاح بھی ایسے لوگوں کے ساتھ جو نہ ان کی زبان جانتے تھے اور نہ ان کے ماحول سے باخبر تھے۔ ہزیمت میں ان باتوں کا بھی کسی نہ کسی درجہ میں دخل ہے۔ پھر ان لوگوں میں نفاق بھی بہت قدیم سے تھا۔ پھر پیسے کی خواہش اور اقتدار کی ہوس قومیتوں کی برتری حسد و قبائلی تفاخر ان میں رچا بسا تھا۔ اس کے لیے ان میں سے ہی

صالح عناصر کو ساتھ لے کر اور رفق و سہولت سے اقدام مناسب تھا۔ شہیدینؒ کے لشکر میں بہت سے لوگوں میں ظاہریت بہت نمایاں تھی۔ گو اخلاص کے ساتھ ہو۔ اس کے نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہو سکے۔ سید سلیمان ندویؒ کا یہ الزام بھی صحیح نہیں کہ مولانا سندھیؒ گو بہت سے خیالات میں آزاد ہیں، مگر مقلدیت کے باب میں ان کا تشدد علی حالہ قائم ہے۔ الا یہ کہ مولانا سندھیؒ مقلدیت کے اسی حد تک قائل ہیں جس حد تک ان کے اساتذہ شیوخ مولانا شیخ الہندؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیگر مشائخ کرام تھے، یہ تمام مشائخ کرام حنفیت میں رسوخ رکھتے تھے، لیکن ان کے دلوں میں ظاہریت اور غیر مقلدیت کے خلاف وہ نفرت نہیں تھی جو اہل بدعت وغیرہ کو رہی ہے۔ مولانا سندھیؒ نے خود تصریح کی ہے کہ حاشا وکلا ہم اہل حدیث یا غیر مقلدین میں سے کسی معقول انسان کے خلاف نفرت یا بغض و عداوت نہیں رکھتے ۔۔۔، البتہ بے تکے لوگ اور غیر معقول قسم کے لوگوں کا رد نہ کرنا بھی انصاف کے خلاف ہو گا۔ مولانا سندھیؒ نے تو خود مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ سے تلمذ کیا ہے اور حدیث کی اجازت حاصل کی ہے۔ اسی طرح یمنی سلسلہ کے بزرگ محسن انصاریؒ بھوپالی سے بھی اجازت حدیث حاصل کی ہے۔ غیر مقلد حضرات جب حنفیت کا نام سنتے ہیں تو بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھیؒ پر جناب غلام رسول مہر صاحب مرحوم نے بھی جا بجا سیرت سید احمد شہیدؒ میں چھینٹے پھینکنے کی کوشش کی ہے۔ جب مولانا سندھیؒ سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ کو شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے ساتھ مربوط قرار دیتے ہیں تو اس پر غیر مقلدین کو غصہ آتا ہے اور وہ اس کو مولانا شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کی کاوشوں کا اور ظاہریت کی طرف میلان کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ شاہ عبدالقادرؒ مولانا عبدالحئیؒ اور شاہ اسحٰقؒ کا ربط اس تحریک کے ساتھ ان کو اچھا نہیں لگتا۔ بہر حال غلام رسول مہر صاحب ۱۹۱۴ء میں مولانا آزادؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں تھے اور مولانا آزاد خود

بھی ظاہریت کی طرف میلان رکھتے تھے، لیکن ان کی غیر مقلدیت یا ظاہریت دوسرے مقلدین سے بالکل جدا ہے نہ ظاہری طور پر غیر مقلدوں میں ان کے ساتھ ملتے تھے اور نہ ان میں غیر مقلدین جیسا تعصب تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ مولانا آزاد کے خلاف جب ۴۴ ۱۹ء تا ۴۷ ۱۹ء تک مسلم لیگ کے جگادریوں نے جو غیر اخلاقی مہم چلائی تھی اور مولانا کی تحقیر و توہین اور تکفیر کی جاتی تھی۔ احسان کے مدیر اور غلام رسول مہر اور زمیندار اور اس کے بانی سب ہی ساتھ چلتے تھے اور وہ شعر آج تک احقر کو یاد ہے جو زمیندار میں شائع ہوتا تھا جو مولانا آزاد کے بارے میں کہا جاتا تھا۔

ع بگڑا ہوا عالم ہے کہ بپھرا ہوا خنزیر

مولانا سید سلیمان ندویؒ مولانا سندھیؒ کے حالات سے پوری طرح باخبر ہیں کہ ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے اور سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ علماء کی تربیت میں رہتے ہوئے ابتدائی تعلیم اور عربی زبان سیکھی اور حضرت شیخ الہند کی خدمت میں دیوبند پہنچ گئے۔ تعلیم کی تکمیل کے ساتھ اس جوش جہاد اور جذبہ سے بھی آشنا ہوئے جو سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیلؒ اور ان کے پیروکاروں میں موجزن تھا اور اپنے خیال کے مطابق اس پورے منصوبے کو پورا کرنے کے لیے مولانا شیخ الہندؒ کی تحریک میں عملی اقدام بھی کیا اور افغانستان پہنچے۔ سید سلیمان ندویؒ اس بات کا اقرار کرتے ہیں

"تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اسلام سے بڑی محبت تھی اور اس کی دنیاوی برتری کے لیے ان کے اقدام میں بڑا جوش تھا۔" بایں ہمہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مولانا سندھیؒ پر ایسا نقد کہ وہ گویا مجسمہ تجدد تھے اور اشتراکیت سے متاثر تھے اور دین وطنیت میں تطبیق کی کوشش کرتے تھے اور انہوں نے اسلامی مسائل کی ایسی تاویلات وتشریحات کیں جو ان کے فلسفہ پر منطبق ہوجائیں اور انہوں نے وحدت انسانیت کا صحیح مسلک اختیار کرنے کے بجائے وحدۃ الوجود کی سنگلاخ کو اختیار کیا۔

اور یہ کہ حنفیت کے ساتھ ان کی دلچسپی اس لیے نہ تھی کہ وہ دلائل کے اعتبار سے قوی یا حجت کے لحاظ سے راجح ہے، بلکہ اس لیے کہ امام ابوحنیفہؒ عجمی ہندی بلکہ سندھی تھے اس لیے انہوں نے اس کو اختیار کیا اور وحدۃ الوجود کو انہوں نے اس لیے نہیں اختیار نہیں کیا کہ اس سے ربط الحادث بالقدیم کا مشکل مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ ہندو ویدانت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے ساتھ اس لیے وہ تعلق نہیں رکھتے کہ یہ ایک مبارک خانوادہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی تائید سے اسلام کی تلقین و تعبیر و تشریح کرتا ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ ہندی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے اور پھر وطنیت کے ساتھ مصطفیٰ کمال کی قدیم سے علیحدگی اور یورپ کے جدید معاشرے، تعلیم خط، لباس اور تمدن کی پیروی اختیار کرنا اس کو بھی مولانا نے وطنیت کے ساتھ آمیز کیا ہے بعربی، فارسی کے بجائے لاطینی خط اور علماء کو کوٹ پتلون ہیٹ لگانے کا مشورہ وغیرہ اور یہ بھی کہ مولانا سندھیؒ قرآن کے اعجاز کو صرف عربی زبان میں اسلام کی عالمگیر تعلیم کے منافی خیال کرتے ہیں اور اسلامی تصوف کو ہندی یوگ سے ماخوذ مانتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اکثر باتیں جو انہوں نے مسعود عالم صاحب کی کتاب کے مقدمہ میں ان کی تائید و تصویب میں درج فرمائی ہیں درست نہیں۔ وطنیت اور قومیت کو بالکل ہی اسلام کے خلاف قرار دینا ایک سطحی بات ہے۔ اس سلسلہ میں جناب مودودی صاحب نے بھی اور دیگر مسلم لیگی حضرات نے بڑا مواد جمع کیا ہے لیکن اس کی تہ میں کچھ بھی نہیں، اسلام نہ تو وطنیت کے خلاف ہے اور نہ قومیت کے اور نہ ہی کسی زبان کے خلاف ہے۔ البتہ ایسی قومیت یا وطنیت یا لسانیت جس کی تہ میں خدا پرستی نہ ہو اور وہ محض قومی تفاخر یا وطنی عصبیت یا لسانی تعصب پر مبنی ہو، ایسی قومیت کو مولانا سندھیؒ بھی ملعون قرار دیتے ہیں۔ اس لیے قریش کی قومیت کو برقرار رکھتے ہوئے

ان کو توحید اور خدا پرستی کی دعوت دی گئی۔ تاریخ میں تمام اقوام عربوں کے علاوہ جو اسلام میں داخل ہوئی، انہوں نے نہ اپنی قومیت کو ختم کیا نہ لسان کو۔ ایک ہی لسان اور ایک ہی قسم کے معاشرہ پر اصرار کرنا اور لوگوں کو مجبور کرنا یہ فطرت کے خلاف ہوگا۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ

(۲۲ روم)

قومیتیں باعتبار لسان کے اور باعتبار نسل کے اور باعتبار دین اور مذہب کے اور باعتبار اوطان کے ہو سکتی ہیں۔ موجودہ زمان میں تو قومیں حقیقت یہ ہے کہ اوطان کے ساتھ ہی شمار ہوتی ہیں خواہ ان کی نسبت کسی نسل، مذہب لسان یا رنگ و معاشرہ کے ساتھ ہو۔ پاکستانی قومیت کے عناصر ہر لسان و مذہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ جب وہ بیرونی ممالک میں جاتے ہیں اور ان کے پاسپورٹ ویزا میں پاکستانی قومیت کا ہی اندراج کرتے ہیں اسی طرح سعودی جنسیت عراقی قومیت۔ ایرانی۔ افغانی۔ روسی۔ برطانوی۔ اطالوی۔ امریکی وغیرہ سب ہیں۔ عمل تو اسی نظریہ پر ہو رہا ہے اور کہنے کو ایک قومی نظریہ کفر قرار پاتا ہے اور دو قومی نظریہ ایمان؟ دو قومی نظریہ کے بانی مجدد صاحبؒ کو قرار دیا جاتا ہے اور مبلغ ڈاکٹر اقبال مرحوم کو، کیا یہ تعجب انگیز بات نہیں سیاسی نظریات کو دین کی بنیاد قرار دینا۔ حالانکہ سیاسی نظریات میں استقرار نہیں ہوتا۔ کوئی چیز سیاست میں حرف آخر نہیں ہوتی۔ یہ نظریات بدلتے رہتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے: "مولانا سندھیؒ کے افکار و خیالات کی بوالعجبی کا پتہ اہل دیوبند کو تو ۱۹۱۲ء ہی میں مل گیا تھا۔ جب وہ مؤتمر الانصار کی دعوت لے کر اٹھے تھے اور آخر وہ مؤتمر سے دست کش ہو کر دلی میں مسجد فتح پوری کے اندر نظارۃ المعارف القرآنیہ بنا کر بیٹھے اور چند انگریزی و عربی کے فارغ التحصیل اور

نیم فارغ التحصیل طلباء کو قرآن کا درس دینے لگے۔ ان کے اس درس کا منشاء یہ تھا کہ پورے قرآن کو جہاد و سیاست ثابت کیا جائے اور تمام احکام کو اسی جنگی رنگ میں پیش کیا جائے۔ اس تفسیر کی جھلک آپ کو ان تلامذہ مثلاً خواجہ عبد الحیٔ صاحب فاروقی کی تفسیر اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کے قرآنی حواشی میں پوری طرح نظر آئے گی۔"

حقیقت یہ ہے کہ مؤتمر الانصار مولانا سندھیؒ نے نہیں قائم کی تھی، بلکہ وہ تو علماء دیوبند، بالخصوص مولانا شیخ الہندؒ کی قائم کردہ ایک تنظیم تھی جس کے مقاصد اصلاً تعلیمی ترقی اور اس کے اجتماعی مفادات تھے۔ مولانا سندھیؒ تو اس کے ایک فعال ناظم تھے کئی سال تک اس کا کام ہوتا رہا اور اس کے فوائد بھی سامنے آنے لگے۔ اہلِ مدرسہ کو جب انگریز کی مداخلت کا خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے مولانا سندھیؒ پر اعتقاد کے فساد کا الزام لگایا۔ مولانا سندھیؒ مولانا شیخ الہندؒ کے حکم سے دلی میں قرآن کی تعلیم دینے لگے احقر کے سامنے مولانا عبداللہ عمر پوری فاضل دیوبند جو مولانا سندھیؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور مولانا عزیز احمد نے بھی اسی طرح بیان کیا کہ وہ خود اس وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھے۔ جب مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے نمائندے گئے تھے جب مولانا سندھیؒ سے ملے تو ان کی خدمت میں کچھ رقم ہدیہ کے طور پر پیش کی اور ساتھ معذرت بھی کی مولانا دہ ۱۹۱۲ء کے واقعہ میں جو پریشانی آپ کو لاحق ہوئی تھی۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ اس کی حقیقت کیا تھی، اس لیے آپ بھی معاف کر دیں۔ میرے دل میں آپ کے خلاف کسی قسم کی کدورت نہیں۔ مولانا سندھیؒ خاموش تھے۔

اس واقعہ کو حضرت مدنیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے۔ "حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولانا سندھیؒ کے نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں، امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔

گئے۔" (حاشیہ نقش حیات ص۱۴۴ ج ۲)

مولانا سندھیؒ کا نہ تو کوئی اعتقادی فساد تھا اور نہ گمراہی اور کفر تھا۔ یہ واقعہ جن لوگوں نے لکھا ہے وہ غلط رنگ میں لکھا۔ پروفیسر سرور مرحوم نے بھی یہ واقعہ صحیح نہیں لکھا۔ تحریک شیخ الہندؒ کے مرتب مولانا سید محمد میاںؒ لکھتے ہیں (۳) یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ مولانا سندھیؒ کا دیوبند سے دہلی منتقل ہونا، ذمہ داران دارالعلوم کے کسی اختلاف کے باعث نہیں تھا، بلکہ جماعت کے پروگرام کے بموجب۔ ان کا کام مرکز علوم دارالعلوم دیوبند سے دہلی منتقل کیا گیا جو پورے ہندوستان کا سیاسی مرکز تھا۔ (ص۱۰۴)

سید سلیمان ندویؒ نے مولانا سندھیؒ کی قرآنی تعلیم پر جس قسم کے الفاظ سے ریمارک دیا ہے۔ یہ ان کی شان سے بہت فروتر ہے اور پھر قرآن کو صرف جہاد اور سیاست ثابت کرنے پر محمول کرنا، یہ الزام بھی مولانا سندھیؒ پر غلط ہے۔ مولانا سندھیؒ نے قرآن کی تمام باتوں کو ٹھیک سمجھا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ مولانا سندھیؒ اگر قرآن کی بعض آیات سے اجتماعی یا سیاسی مسائل کا استنباط کریں تو یہ قابل اعتراض ٹھہرا۔ لیکن سید سلیمان ندویؒ کے پیر و مرشد حضرت مولانا تھانویؒ اگر قرآنی آیات سے مسائل تصوف و سلوک استنباط کریں تو وہ قابل قبول۔ البتہ مولانا سندھیؒ جب علماء کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں، تو علماء بھڑک اٹھتے ہیں اور مولانا سندھیؒ پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں جو حقیقت اور واقعہ کے خلاف ہیں۔ پھر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جن لوگوں کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا خواجہ عبدالحئی فاروقی صاحب کی تفسیر سورۃ البقرہ، خلافۃ الکبریٰ میں احقر کو تو کوئی بات جمہور مفسرین اور سلف صالحین کے عقائد کے خلاف نظر نہیں آئی۔ طرز بیان بے شک ان کا جدید ہے اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کے مترجم قرآن اور حواشی کے بارہ میں اس کی ابتداء میں جن علماء کی تصدیقات ہیں ان میں سید سلیمان ندویؒ کی تصدیق بھی پوری شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔ دیانت کا تقاضا تو یہی تھا کہ اگر اس ترجمہ یا حواشی میں کوئی بین خرابی تھی تو اس کو بیان کرتے اس

ہیں تو توصیف و تعریف میں رطب اللسان ہیں اور مسعود عالم ندوی کی کتاب کے مقدمہ میں یہ فرا رہے ہیں یا للعجب۔

ہیٹ پینٹ کا قصہ بھی سن لیں کہ مولانا سندھیؒ کا مقصد چست لباس ہے صنعت و مشینری کے زمانے میں ڈھیلا ڈھالا لباس ناموزوں ہوگا۔ چست لباس کی ضرورت ہے کوٹ۔ ہیٹ۔ پینٹ دنیا میں کسی قوم کا مذہبی شعار یا مخصوص دینی لباس تو ہے ہی نہیں تاکہ اس کی مشابہت سے خطرہ ہو۔ جیسا صلیب، قشقہ، زنار۔ اور بعض قوموں کی مخصوص مذہبی شعار ہیں ان کے پہننے سے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ میں آئے گا لیکن کوٹ پینٹ ہیٹ کسی خاص قوم کا مذہبی شعار نہیں، بلکہ دنیا کی تمام اقوام خواہ امریکن ہو یا روسی ہو خواہ ترکی یا مصری۔ اور یورپ کی اقوام ہوں۔ یہ تمام اقوام کا لباس ہے۔ تمام دنیا میں ٹیبل کرسی کا استعمال بھی اسی طرح ہے۔ تقویٰ کی وجہ سے کوئی بچنا چاہے تو اچھا ہے ورنہ ضرورت کے تحت اس کا استعمال کراہت نہیں رکھتا۔ احقر نے بچشم خود تلنگانہ میں تلنگے کسانوں کو چپل دھوتی پہنے ہوئے اور سر پر بڑے بڑے ہیٹ دھوپ سے بچنے کے لیے استعمال کرتے دیکھا ہے۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ ایک دفعہ مدراس میں مولانا سندھیؒ اور ان کے تلمیذ حضرت مولانا صبغۃ اللہ بختیاریؒ ایک جگہ جا رہے تھے ایک موٹر پر سوار ہونا تھا۔ موٹر چل پڑی۔ مولانا سندھیؒ نے تو پاجامہ اور کوٹ پہنا ہوا تھا وہ تو جلدی جلدی سوار ہو گئے۔ مولانا بختیاریؒ نے بڑا چغہ اوڑھا ہوا تھا ڈھیلے کپڑے ان کو بڑی دشواری ہوئی بڑی مشکل سے ہانپتے ہوئے وہ موٹر کے اندر داخل ہوئے تو مولانا سندھیؒ ان پر برسنا شروع ہوئے کہ ایسے زمانہ میں یہ چغے اور جبے قبے تمہارے کس کام کے۔

بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن اس کے باوجود مولانا سندھیؒ کو مطعون کیا جاتا ہے۔ تمام مشینوں کو چلاتے وقت فوجی خدمات، پولیس کی خدمات انجام دینے کے لیے ایسے ہی

چست لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ سے تو ان کے تلمیذ رشید مولانا ابوالحسن علی ندوی نے زیادہ بہتر انداز میں مولانا سندھیؒ کا ذکر کیا ہے اور تنقید بھی اعتدال سے کی ہے، چنانچہ انہوں نے نزہتہ الخواطر ج ۸ ص ۳۰۸ میں کسی قدر تفصیل سے مولانا سندھیؒ کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا کا اپنے شیخ محمد صدیق سندھیؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا اور پھر قادری طریقہ پر ان سے بیعت کرنا پھر ابتدائی تعلیم وہاں حاصل کرنا اور پھر ملتان میں اور وہاں سے دیوبند جانا اور بعض کتب کا کانپور میں جاکر مولانا احمد حسن کانپوری کے پاس بعض وجوہ کی وجہ سے پڑھنا پھر دیوبند میں مولانا شیخ الہندؒ کے پاس علم حدیث کی تکمیل کرنا پھر سندھ میں واپس جاکر مدرسہ دارالارشاد میں تدریس کرنا اور پھر وہاں سے دیوبند کی طرف رجوع کرنا اور مدرسہ والوں کا ان سے اختلاف اور ان پر بعض امور میں سوءِ اعتقاد کا اتہام لگانا اور پھر ان کا دیوبند سے الگ ہوکر دہلی میں جاکر نظارۃ المعارف القرآنیہ کا دارہ قائم کرنا اور قرآن کریم اور حجۃ اللہ البالغہ کی تعلیم دینا۔ پھر افغانستان پہنچ کر اپنے شیخ مولانا شیخ الہندؒ کے پروگرام کے مطابق امیر حبیب اللہ سے ربط و تعلق اور اس کو انگریزوں کے خلاف آمادہ بجنگ کرنا اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دینا اور کابل سے ہندوستان خط و کتابت کرنا جو ریشمی رومال وغیرہ سے مشہور ہے اور پھر کابل کا انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہونا اور مولانا سندھیؒ پر پابندی اور ان کا کابل کو چھوڑ کر تاشقند اور ماسکو جانا اور اپنے شاگرد ظفر حسن ایبک اور دوسرے رفقاء کی مدد سے اشتراکی نظام کا مطالعہ کرنا اور روسی وزیر خارجہ کو ہندوستان کی آزادی کے پروگرام میں مدد دینے کے لیے آمادہ کرنا اور پھر وہاں سے مایوس ہوکر ترکی چلے جانا اور پھر وہاں سے آخر کار مکہ مکرمہ پہنچنا اور بارہ پندرہ سال کا عرصہ وہاں گزارنا قرآن کریم اور حجۃ اللہ اور حدیث اور علوم ولی اللہی کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہنا اور پھر ہندوستان واپس آنا۔ مولانا جب ہندوستان واپس آئے، تو ان کے اکثر ہمعصر ختم ہو چکے تھے۔ نیا دور اور نئی نسل تھی

نیا ماحول اور نئی فضا پائی ،سیاست واجتماعیت اور ثقافت میں کچھ اپنی شاذ آرار کا اظہار بھی شروع کر دیا جن کے ساتھ ان کے دوست احباب، علمار اور اسی طرح مسلمان زعمار وسیاسی لوگوں نے بھی اتفاق نہیں کیا۔ مولانا سندھیؒ لاطینی رسم الخط لازم قرار دینے اور ہیٹ پینٹ کوٹ یعنی انگریزی لباس کو اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح مسلمان برہمنی لباس اور سنسکرت کے رسم الخط سے نجات پا سکتے ہیں ورنہ برہمن کی فکری اور ثقافتی غلامی کا شکار ہو جائیں گے۔ مولانا سندھیؒ نوادر رجال میں سے تھے۔ بہت مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ بلند خیال تھے۔ خطروں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ شہوات سے بہت دور رہنے والے اور ذکار مفرط رکھنے والے تھے علوم سے بہت قوی نسبت رکھتے تھے۔ ان کے طریقہ پر بہت سے علمار نے فائدہ اٹھایا جن میں مولانا احمد علی لاہوریؒ بہت مشہور ہیں۔ اگرچہ مولانا تھانویؒ اس اسلوب تفسیر کے خلاف تھے اور ایک رسالہ بھی انہوں نے اس کے رد میں لکھا تھا۔ مولانا سندھیؒ گاندھی جی کے اور اس کی سیاست کے شدید ناقد تھے اور اس کو مسلمانوں کے تشخص کے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور اسی طرح مولانا سندھیؒ کمال اتاترک کے بھی ناقد تھے اور اشتراکیوں اور ملاحدہ کے بھی شدید مخالف اور معارض تھے، لیکن کبھی کبھی آپ میں شدت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ بھڑک اٹھتے تھے اور کسی چیز کی پرواہ نہ کرتے تھے اور لوگوں کی دشمنی اور تنقید کی بھی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اذکار قلبیہ اور اوراد پر مداومت کرتے تھے۔ آخر میں اپنے مربی حضرت مولانا شیخ غلام محمد دین پوریؒ کی بستی دین پور میں واصل بحق ہوئے اور شیخ کے پاس ہی مدفون ہیں۔ رحمہ اللہ علیہ۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جس طرح مولانا سندھیؒ کے متعلق اظہار رائے کیا ہے کہ وہ کابل سے روس اور روس سے ٹرکی اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ سے ہوتے ہوئے مکہ پہنچے اور روسی اور مغربی اقوام کے انقلابی حالات صنعتی اور مشینی ترقیات کو دیکھ کر

اور ٹرکی کے مصطفیٰ کمال کے تجدد وغیرہ کو دیکھ کر چکا چوندسی ہوگئی اور مولانا سندھیؒ ایک طرف وطنیت اور اسلام کو آپس میں تطبیق دینے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری طرف مسئلہ وحدۃ الوجود کو اس لیے تسلیم کرتے تھے کہ وہ ویدانت فلاسفی سے بھی ثابت ہے اور اس طرح وہ عربی اسلام اور ہندی اسلام کو قومیت اور اسلام کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اپنے جو خیالات انہوں نے اخذ کئے تھے۔ ان کو شاہ ولی اللہؒ کی حکمت اور فلسفہ کے نام پر پیش کرنا شروع کر دیا اور مولانا سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کے رفقاء۔ اور ان کے سلسلہ کے اکابر علماء دیوبند مولانا شیخ الہندؒ وغیرہ کے خالص اسلامی عقائد و دینی نظریات کو لینن مارکس اسٹالن اور ٹراٹسکی کے خیالات کے ساتھ ساتھ تطابق دینے اور چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ کجا یہ بزرگان دین اور ان کا خالص صحیح اسلامی نظام اجتماعیت اور دینی و مذہبی سیاست اور کجا ان ملحدوں کے ناپاک اور ملحدانہ نظریات چونکہ یہ الزام بہت سخت تھا اور یہ مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسے بزرگ کی طرف سے اور شدید تکلیف دہ تھا کہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سندھیؒ کے حالات اور ان کے جہود و قربانیوں سے باخبر تھے اور ان کے اکابر و اساتذہ جن پر مولانا سندھیؒ اپنے دین و سیاست میں مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ ان سے بھی مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ربط و تعارف موجود تھا۔ اس کے باوجود سید سلیمان ندویؒ صاحب نے ایسا شدید حملہ مولانا سندھیؒ پر روا رکھا اس سے بہت دکھ ہوا۔ ؎

وظلم ذوی القربیٰ اشد مضاضۃ

علی المرء من وقع الحسام المھند

اس بات پر خاموشی اور سکوت بھی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا سندھیؒ ایک خدا پرست عالم دین تھے۔ ان کے بارے میں اشتراکیت یا مارکسیت کا الزام اور

یورپ کے ملحدانہ نظام کی نسبت خلاف واقعہ ہے۔ مولانا کا اعتقاد و عمل اور دعوت
اول و آخر صرف اور صرف اسلام کے اس نظام کی طرف تھی جس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب
قرآن کریم میں پیش کیا گیا ہے اور جس کی شرح سنت ثابتہ اور خلفائے راشدین نے
کی ہے اور اس سلسلہ میں بعض باتیں مولانا کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں اور خود انہوں
نے اپنے قلم سے نہیں لکھیں۔ کچھ ان کے تلامذہ اور کچھ دوسرے حضرات نے ان کو جمع
کیا ہے۔ لہٰذا ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور ان باتوں کی وجہ سے مولانا سندھیؒ پر طعن
کرنا حق کے خلاف ہوگا اور بعض باتیں اجمالی ہیں۔ ان کی تفصیل و توجیہہ کی جا سکتی ہے
اور کچھ باتیں مبہم ہیں جن کا سمجھنا دشوار ہوگا اور بعض باتیں مولانا کی منفردانہ ذاتی تحقیقات
پر مشتمل ہیں۔ ان کو اسی زمرہ میں شمار کرنا چاہیے، وہ مسلک و مذہب نہیں صرف تشریح
و تبیین کی حد تک ہو سکتی ہیں۔ مولانا کی تحریروں سے ہم نے ثابت کیا ہے کہ دورِ حاضر
میں تمام جدید تحریکات کے سلسلہ میں جو تحریک اسلام کے شدید خلاف ہے۔ وہ
اشتراکیت کی تحریک ہے۔ کیونکہ یہ ایک عمومی اور عالمی تحریک ہے۔ لیکن مولانا نے یہ
بات بھی فرمائی ہے کہ اشتراکیت والے بھی مجبور ہو جائیں گے اور قرآن کریم کے پیش
کردہ نظام سے بہتر کوئی نظام اور کوئی اجتماعیت نہیں مل سکتی۔ مولانا سندھیؒ کو بھی وفات
پا کر اب بیتالیس سال گزر چکے ہیں۔ اس اثناء میں اشتراکیت اور سوشلزم پر بہت سے
دور آئے ہیں اور اب تو وہ نظام بھی اگر مکمل طور پر نہیں تو کافی حد تک کمزور ہو کر ناکامی
کی طرف گامزن ہے اور جس طرح نظام سرمایہ داری (کیپٹلزم) اور زر پرستی ایک ملعون
نظام ہے جس میں یورپ اور ایشیا کے اکثر لوگ صدیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے
مضرات سے باخبر ہونے کے باوجود اس کو ترک نہیں کر سکے۔ اسی طرح نظام اشتراکیت
بھی ایک ملعون اور غیر فطری نظام ہے، وہ بھی تقریباً نصف صدی کے اندر اندر ہی
ناکام ہو چکا ہے، لیکن اجتماعیت کے نکتہ نگاہ سے ہر ایک نظام میں کچھ خوبی کی باتیں

بھی ہوتی ہیں۔ شاید ان ہی کی وجہ سے یہ نظام چلتے رہتے ہیں۔ امیر شکیب ارسلانؒ نے حاضر العالم الاسلامی میں ذکر کیا ہے کہ اسلام میں بھی مبادی اشتراکیت موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض عمدہ اور اچھی باتیں دوسرے نظاموں کی اسلام میں بھی موجود ہوں اس سے ان نظاموں کا بتمامہٖ برحق اور صحیح ہونا تو ثابت نہیں ہو سکتا۔ وحدۃ الوجود کا مسئلہ اگر ویدانت فلاسفی میں اور گیتا، اپنشد وغیرہ کتب ہنود میں پایا جاتا ہے اور اسی طرح مسلمان صوفیاء کرام کی کتب میں بھی پایا جاتا ہے، تو اس میں کیا حرج۔ ماخذ دونوں کے الگ الگ ہیں۔ اگر مولانا سندھیؒ نے یہ کہہ دیا کہ بعض صوفیائے کرامؒ یوگیوں کی کتب و علوم اور ان کی رفاقت سے متاثر ہوئے ہیں اور بعض باتیں یوگیوں کی اپنے سلسلہ میں جاری کی ہیں، تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ جب تک کہ کوئی چیز دین کے بنیادی عقیدہ سے نہ ٹکرائے اور نہ سنت ثابتہ کے خلاف ہو تو اس کے اخذ کرنے میں کوئی برائی یا قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ مولانا سندھیؒ کا مقالہ "امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف" جس کو مولانا منظور نعمانی صاحب نے مکتبہ الفرقان بریلی کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس کی ابتداء میں مولانا النعمانی لکھتے ہیں" اور ولی اللہی علوم و معارف کے لیے بجا طور پہ اس مقالہ کو بنیادی لٹریچر قرار دیا جا سکتا ہے، نیز اس کے مطالعہ کے بعد ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "ولی اللہی حکمت" پر مولانا سندھیؒ کی نظر کس قدر گہری ہے اور شاہ صاحب کے علوم و معارف کا انہوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے۔ عہد حاضر کے جلیل القدر اور وسیع النظر عالم علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک نجی گرامی نامہ میں مولانا سندھیؒ کے اس مقالہ کے متعلق ہی راقم سطور کو تحریر فرمایا تھا۔ مولانا سندھیؒ کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بے شبہ مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحبؒ کے فلسفہ اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے۔"

پروفیسر محمد سرور صاحب کا تذکرہ

پروفیسر محمد سرور صاحب مرحوم اصل میں گجرات قصبہ مدینہ سادات کے رہنے والے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے گجرات کے اس ہائی سکول میں جس کو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ نے قائم کیا تھا میٹرک تک تعلیم حاصل کی اس دور میں اس سکول میں ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم اور ملک حسن علی صاحب آف شرقپور معلم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ سکول آزاد تھا اس کے بعد سرور صاحب جامعہ ملیہ دہلی میں داخل ہوئے اور وہاں تعلیم کی تکمیل کی۔ جامعہ ملیہ تمام برصغیر میں علی گڑھ یونیورسٹی کا بدل خیال کیا جاتا تھا اور اس میں قومی ملی اور وطنی خصوصیات کا خیال کیا جاتا تھا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی قیادت میں یہ ادارہ اس دور میں خوب کام کرتا رہا اور برصغیر کے تمام صوبوں سے لوگوں نے اس ادارہ میں تعلیم حاصل کی کسی قدر مذہبی رجحان بھی اس ادارہ میں دوسرے کالجوں اور جامعات کی بہ نسبت زیادہ تھا اور برطانیہ کی متسلط حکومت کے خلاف بھی ایک قسم کا ذہن نمایاں ہوتا تھا۔ سرور صاحب نے جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس ادارہ میں تعلیم دینی شروع کی اور پھر اس اثناء میں وہاں کے اہل حل وعقد کے مشورہ سے آپ مصر بھی گئے اور جامع الازہر اور مصر کے بعض دیگر جامعات سے بھی کچھ علمی استفادہ کرتے رہے۔ عربی جدید میں کافی درک پیدا کیا اور پھر بدستور جامعہ ملیہ میں برصغیر کی تقسیم تک بطور معلم اور استاذ کام کرتے رہے، پھر پاکستان چلے آئے۔ بعض صحائف وجرائد کے اندر بطور مدیر بھی کام کرتے رہے خاص طور پر شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی کے ماہانہ مجلہ الرحیم میں، پھر ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے نکر و نظر میں بھی کام کرتے رہے۔ پروفیسر سرور صاحب بہت اچھے بااخلاق اور نہایت مہذب اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ زبان میں کسی قدر لکنت تھی، قلم کے دھنی تھے۔

ان کے قلم سے بہت اچھی اچھی تحریریں سامنے آئی ہیں اور کئی کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں مگر یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ سرور صاحب کوئی عالم دین نہیں تھے جس نے باقاعدہ درس نظامیہ کی تعلیم حاصل کی ہو اور عقلیات و نقلیات کا نصاب پڑھا ہو۔ وضع قطع میں بھی آزاد تھے۔ عربی کے ساتھ فارسی زبان سے بھی شناسا تھے اور انگریزی میں کافی درک رکھتے تھے۔ مطالعہ خوب کرتے تھے۔ اخذ کا ملکہ بھی خوب تھا۔ تحریر بہت عمدہ ہوتی تھی۔ احقر کے پاس پانچ مرتبہ ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے بھی احقر کا ربط ان کے ساتھ تقریباً پچیس سال تک رہا۔ پروفیسر صاحب کو خود اس بات کا احساس تھا کہ ان کی تعلیم یک طرفہ ہے۔ باقی جو انہوں نے اخذ کیا یا حاصل کیا وہ خود ان کے ذاتی شوق اور مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ احقر نے جب ایساغوجی کی شرح (تشریحات سراتی) (درس نظامیہ میں پڑھائی جانے والی ابتدائی منطق کی کتاب) جب ان کی خدمت میں پیش کی تو کہنے لگے کہ میں نے معقولات پڑھے نہیں، اس لیے آپ منطق پڑھا دیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں اور اب اس عمر میں اس کا موقع بھی نہیں، آپ اس اردو شرح سے اچھی طرح استفادہ کر سکتے ہیں —!

پروفیسر صاحب نے ایک مجموعہ "مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حالاتِ زندگی، تعلیمات، اور سیاسی افکار مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ چھوٹے سائز (۳۰-۲۰/۱۶) پر ۴۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرا مجموعہ افادات و ملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ یہ (۲۲-۱۸/۸ سائز) کے ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں مجموعات بڑے اہم ہیں اور دونوں قابلِ تنقید ہیں۔ ان مجموعات میں تقریباً مولانا سندھیؒ کے بارہ میں صحیح، قابلِ وثوق، ضعیف، موضوع، غیر قابلِ اعتماد ہر قسم کی باتیں موجود ہیں۔ اس لیے کلی طور پر یہ مجموعات اس قابل نہیں کہ ان میں تمام درج کردہ باتیں قابلِ اعتماد ہوں یا جن کی ذمہ داری حضرت مولانا سندھیؒ پر ڈالی جائے اور ان مجموعات کی ان باتوں میں جن کو

مولانا سندھیؒ کا مسلک اور نظریہ کہا جا سکتا ہے اور جو باتیں ان کے نظریہ اور مسلک سے مطابقت نہیں رکھتیں ان میں امتیاز کرنا اگرچہ مشکل ہے، لیکن ضروری ہے۔ پروفیسر سرور صاحب کا تعلق مولانا سندھیؒ کے ساتھ اس طرح ہوا کہ مولانا سندھیؒ جب مکہ مکرمہ میں مقیم تھے تو انہوں نے جامعہ ملیہ کے سرکردہ حضرات کو لکھا کہ جامعہ کے کسی ایسے استاذ کو میرے پاس مکہ میں بھیج دیں جس کو میں کچھ ضروری باتیں سمجھا دوں کیونکہ مولانا کی جب عمر آخری دور میں پہنچی تو انہیں شدید احساس تھا کہ ان کے ذہن میں عمر بھر کے تجربات ہیں اور جو باتیں ان کے مشاہدہ میں آئی ہیں اور ملک وملت کے لیے اور دین وسیاست میں ان کا جاننا ناگزیر ہے۔ وہ کہیں ان کے ذہن میں ہی نہ پڑی رہیں اور وہ دنیا سے رخصت ہو جائیں اور قرآن کریم کے پچاس سالہ مطالعہ اور تدریس کے اہم ترین نتائج جو ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور امام شاہ ولی اللہؒ کی حکمت اور فلسفہ کے اہم حصے بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ کے ذریعہ حکیم الامتہ شاہ ولی اللہؒ نے جو تمام شرائع الٰہیہ بالعموم اور نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور دین کو ایک منتظم شکل میں اور ایک بہترین نظام کی شکل میں جس طرح پیش کیا ہے لیکن اس کا سمجھنا اتنا آسان نہیں کہ ہر صاحبِ علم اس کو سمجھ سکے۔ اس کی تربیت وتعلیم کے لیے جو مخصوص طریق کار ہو سکتا ہے وہ مولانا سندھیؒ کے ذہن میں موجود تھا اس سے وہ دوسروں کے فائدے کے لیے اسے عام کرنا چاہتے تھے، لہٰذا کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو جدید علوم سے باخبر ہو اور جو مولانا کی تقریر سمجھ سکتا ہو۔ عربیت سے بھی اس کو کچھ درک ہو۔ جامعہ کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ڈاکٹر مجیب صاحب وغیرہ حضرات نے اس کام کے لیے پروفیسر سرور صاحب کو زیادہ موزوں خیال کیا اور ان کو مکہ مکرمہ روانہ کر دیا۔ اس طرح وہ مکہ میں پہنچ کر مولانا سندھیؒ کی خدمت میں کچھ عرصہ رہے، لیکن بہت جلد ہی مولانا برصغیر کی طرف واپس آ گئے۔ ان کو یہاں آنے کی اجازت

مل گئی برطانیہ کے معتوب تھے اور پچیس سال کی جلا وطنی گزار کر حضرت مدنیؒ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور بہت سے دیگر حضرات کی کوششوں سے برطانیہ نے مشروط طور پر واپس ملک آنے کی اجازت دے دی۔ دریں اثنا پروفیسر صاحب نے کچھ باتیں تو مکہ مکرمہ میں اخذ کیں اور باقی حصہ کچھ ہندوستان میں جب مولانا جامعہ ملیہ میں مقیم ہوتے تھے اس وقت اخذ کیں۔ لیکن یہ کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں تھی جو کتاب، مضمون یا یکسوئی کی شکل میں ہو بلکہ یہ مجالس کی شکل میں ہوتی تھی۔ غیر مرتب اور بغیر کتاب کے زبانی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جن کو پروفیسر سرور صاحب وہاں قلمبند بھی نہیں کر سکتے تھے، بلکہ مجلس کے اختتام پر اپنے ٹھکانے پر جا کر اپنے حافظہ اور یادداشت کی شکل میں مرتب کرتے تھے لہٰذا ان مرتب کی ہوئی کتابوں میں بہت سی چیزیں ایسی بھی آگئی ہیں جو قابلِ اندراج نہیں تھیں اور وہ المجالس بالامانۃ کے حکم میں تھیں اور بعض باتیں مبہم تھیں اور ان کی تشریح وتبیین کی ساری ذمہ داری سرور صاحب پر آتی ہے۔ وہ مولانا کی تشریح و تفصیل ہی نہیں اور بعض باتیں مولانا کی پروفیسر صاحب سمجھ ہی نہیں سکے اور بعض باتیں بالکل اصولِ موضوعہ کے خلاف ہیں جو نہ مولانا سندھیؒ کی باتیں ہو سکتی ہیں اور نہ وہ امام ولی اللہؒ کے فلسفہ سے مطابقت رکھتی ہیں۔

چند متفرق واقعات

(۱) جمعیۃ علماءِ ہند کی کل ہند سالانہ ۱۹۴۲ء کانفرنس لاہور میں ہو رہی تھی۔ اس کے سلسلہ میں مختلف شہروں میں جلسے ہو رہے تھے۔ گوجرانوالہ میں بھی جلسہ ہوا۔ اس میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ علماءِ ہند اور مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانویؒ صدر جمعیت علماء صوبہ پنجاب بھی۔ اجلاس شروع ہوا حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ

کا تعارف کرانا چاہا، دو چار الفاظ ہی کہے تھے کہ مولانا سندھیؒ بڑی تیزی سے تشریف لائے اور مفتی نعیم صاحب کو ہاتھ سے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا اور یہ کہا کہ پیچھے ہٹ جاؤ میں خود اپنا تعارف کراؤں گا۔ بہرحال جلسہ ختم ہوا تو مولانا سندھیؒ، مولانا عبدالعزیز محدثؒ گوجرانوالہ جو دو برس پہلے فوت ہو چکے تھے۔ ان کے کمرہ میں جا بیٹھے اور دوسرے معززین شہر بھی جن میں شیخ غلام رسول صاحب صدر انجمن بھی تھے جو بہت متدین قسم کے انسان تھے اور بہت عبادت گذار تھے۔ آنریری مجسٹریٹ بھی رہ چکے تھے۔ وہ بھی وہاں بیٹھے تھے اتنے میں وہاں کمرے میں مولانا کی نظر مولانا نانوتویؒ کی ایک کتاب پر پڑی اسے اٹھایا پلٹا اور پھر مولویوں پر برسنا شروع کر دیا بے نقط سنائیں۔ بڑے غصے اور جوش سے۔ جب ان کا جوش کچھ کم ہوا تو جناب شیخ غلام رسول صاحب نے عرض کیا کہ حضرات آپ ان علماء کو برا بھلا کہتے ہیں جس سے ان کی تحقیر ہوتی ہے۔ اور ہم لوگ تو دین کی وجہ سے ان کی قدر کرتے ہیں۔ مولانا جوش سے فرمایا کہ خاموش رہو، تمہیں کیا معلوم اگر میں ان مولویوں کو گالی نہ دوں گا تو اور کون دے گا۔ اگر میں ان کی تربیت نہیں کروں گا تو اور کون ان کی تربیت کرے گا۔ مجھے ان پر غصہ آتا ہے کہ انہوں نے مولانا نانوتویؒ کی کتابوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ مولانا کا یہ جذبہ محض اخلاص اور علماء کے ساتھ ہمدردی پر مبنی تھا۔

(۲) ایک مرتبہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنیؒ کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ چائے نوش فرما رہے تھے کوئی بات کی تو حضرت مدنیؒ نے اس بات کی تردید فرما دی۔ حضرت سندھیؒ ناراض ہو گئے اور چائے کی پیالی آدھی وہاں ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے دیکھا حضرت سندھیؒ اسی طرح پھر تشریف لائے اور حضرت مدنیؒ کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کوئی ناراضگی کی بات ہی نہیں ہوئی۔

(۳) ایک دفعہ کسی جلسہ اور اجتماع میں حضرت سندھیؒ اور حضرت مدنیؒ دونوں موجود تھے حضرت سندھیؒ نے کوئی بات فرمائی تو حضرت مدنیؒ نے اس کی تردید کر دی حضرت بھڑک اٹھے اور رد شروع کر دیا۔ اتنے میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اُٹھے اور انہوں نے دونوں بزرگوں کی باتوں کو اس طرح بیان کیا کہ دونوں میں تطبیق ہو گئی، گویا کوئی تعارض تھا ہی نہیں، اور لوگ بھی بڑے مطمئن ہوئے۔ اس پر مولانا سندھیؒ بڑے خوش ہوتے اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تحسین و آفرین کرنے لگے۔ اور فرمانے لگے کہ ہمیں ایسے لوگوں کی اور ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو بات سمجھ بھی سکتے ہیں اور سمجھا بھی سکتے ہیں۔

(۴) ایک موقع پر مولانا سندھیؒ کو شدید طور پر کچھ مال کی ضرورت تھی کسی شخص نے عین موقع پر کچھ نقدی پیش کی۔ حاضرین میں سے بعض کا خیال تھا کہ حضرت سندھیؒ اس کی کچھ تعریف کر دیں اور حوصلہ افزائی فرمائیں لیکن حضرت سندھیؒ فرمانے لگے، تم مجھے شرک میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے اور اسی نے اس شخص کے دل میں یہ بات ڈالی ہے میں صرف اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کروں گا!

(۵) کابل میں جب انگریز کے خلاف جنگ ہوئی اور کابل کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے نتیجے میں افغانستان انگریز کے تسلط سے آزاد ہو گیا، لیکن اثناء جنگ ایک محاذ پر جس میں مولانا سندھیؒ بھی شریک تھے۔ اس محاذ پر شکست ہوئی تھی جس کا مولانا سندھیؒ کو بڑا افسوس تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ شاید اس میں ہماری کوتاہی کو دخل ہے۔ اس لیے اس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو سزا دے رکھی تھی۔ رات کو چارپائی پر سوتے نہیں تھے۔ جن کے ہاں مہمان ہوتے تھے۔ ان کی خاطر داری کے لیے تھوڑی دیر تک چارپائی پر لیٹ کر پھر زمین پر اتر کر سوتے تھے۔!

(۶) ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

(اقبال)

جیسے اشعار سُن کر مولانا عبید اللہ سندھیؒ غصے میں آجاتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کا خوف کرو۔ فضول باتیں کرنا چھوڑدو، کون سا عالم اسلام کس مسلمان ملک کو تمہاری فکر ہے۔ دیکھو میں ترکی میں جلاوطن برطانیہ کا باغی۔ وطن سے کوئی مالی مدد نہیں آسکتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری ترکی آئے انہوں نے ترک ارباب اقتدار سے میرا ذکر کیا اور کہا کہ اسے مالی مدد دینی چاہیے۔ اس کی اعانت کرو۔ یہ ہمارا آدمی ہے۔ ڈاکٹر انصاری سے وعدہ کرلیا گیا، لیکن کسی نے کچھ نہیں کیا (افادات وملفوظات ص ۵۷) احقر عرض کرتا ہے کہ دراصل اتحاد عالم اسلامی اور پان اسلام ازم قسم کی تحریکات کے ذریعہ تعلقات اور اسی طرح ربط وضبط خلافت کے ختم ہوجانے کے بعد ناممکن تھے۔ کوئی ملک اور اس کے باشندے کسی دوسرے ملک کو کھل کر فوجی یا کسی قسم کی نمایاں مدد واعانت نہیں کرسکتا ہر ملک اپنے ملکی اور وطنی حیثیت میں رہتے ہوئے ہی کوئی کام کرسکتا ہے مسلمانوں کو کافر طاقتوں نے ایسا بے دست وپا اور بے بس کردیا ہے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ ظفر حسن ایبک نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ ترکی سے خلافت اسلامیہ کے مٹ جانے کے بعد مولانا سندھیؒ اس کوشش میں تھے کہ کم از کم ترکی میں ایک بین المسلمین یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنے کے لیے ترکی حکومت سے اجازت مل جائے، تاکہ اس طرح وہ اسلامی شیرازہ کو ایک حد تک پھر قائم کریں، لیکن ترکی گورنمنٹ نے اس کی اجازت نہ دی۔ مولانا کو انتہائی پریشانی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

(۷) مولانا سندھیؒ کس قدر متواضع اور خلوص سے بھرے ہوئے تھے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا سندھیؒ سے ملنے جامعہ ملیہ تشریف لائے۔ مولانا سندھیؒ نے انہیں بڑی محبت اور عزت واحترام سے اردگرد کا ماحول دکھایا۔ (اس مقام سے ہمایوں کا مقبرہ، پرانا قلعہ اور دوسری تاریخی عمارتیں نظر آتی تھیں) پھر دونوں بزرگوں نے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگی۔ مولانا مدنیؒ جانے لگے، تو مولانا سندھیؒ

دروازے کی طرف لپکے اور آپ کے جوتے سیدھے کرنا چاہتے تھے۔ مولانا مدنیؒ نے فرمایا حضرت آپ کیا کرتے ہیں مجھے گنہگار نہ کیجیے، لیکن مولانا سندھیؒ ان کے جوتے سیدھے کیے بغیر نہ رہے (افادات وملفوظات صـ۸۴)

اسی طرح کا ایک واقعہ اور پیش آیا، سید محمد میاں دیوبندیؒ۔ مولانا سندھیؒ سے ملنے آتے انہیں بڑی محبت سے مولانا سندھیؒ نے اپنے ساتھ بٹھایا، خیر خیریت پوچھی، پھر جب وہ جانے لگے تو مولانا سندھیؒ نے کوشش کی کہ ان کے جوتے سیدھے کریں، لیکن انہوں نے توبہ توبہ کرتے ہوئے بڑھ کر خود اپنے جوتے پہن لیے اور چلے گئے۔

(افادات ملفوظات صـ۸۵)

سرور صاحب نے جب مولانا سے پوچھا تو مولانا نے فرمایا کہ یہ بات حضرت حاجی امداد اللہؒ کی نسبت کی وجہ سے تھی۔ (کیونکہ سید محمد میاں صاحبؒ کے جدِّ امجد سید محمد عابدؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے رفیق تھے۔ دار العلوم دیوبند کے بانی ارکان میں سے تھے، بلکہ سب سے پہلے دار العلوم دیوبند کے لیے چندہ انہوں نے ہی دیا تھا۔ اس نسبت کا مولانا سندھیؒ اس قدر احترام کرتے تھے۔ باوجودیکہ سید محمد میاں صاحب ان سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔

(۸) ایک دفعہ مولانا سندھیؒ کسی اسٹیشن پر کھڑے تھے ان کے پاس اس وقت اتنے ہی پیسے تھے جن سے انہوں نے ٹکٹ خرید لیا تھا۔ جیب خالی تھی۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی آیا اور اس نے مولانا سے سوال کیا کہ میں کمزور آدمی ہوں فلاں جگہ جانا ہے۔ ٹکٹ خریدنے کی طاقت نہیں، میری مدد فرمائیں۔ مولانا سندھیؒ نے وہ خریدا ہوا ٹکٹ اس شخص کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور خود وہاں سے اپنی منزل کی طرف پیدل روانہ ہو گئے۔ اس قسم کا ایک واقعہ حضرت مولانا عبید اللہ انور مرحوم نے بھی سنایا تھا کہ وہ کسی سفر میں مولانا سندھیؒ کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ وہاں بھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔

نیشنلزم

افسوس کا مقام یہ ہے کہ نیشنلزم یا قومیت کو کفر قرار دینے والے حضرات قرآن کے منشا پر توجہ نہیں دیتے۔ اسی لیے کہ جس طرح بین الاقوامیت یا انٹر نیشنلزم فطرت کے مطابق ہے۔ اسی طرح نیشنلزم یا قومیت بھی عین فطرت ہے۔ ایک کو کفر قرار دینا اور دوسرے کو ایمان یہ کہاں کا انصاف ہے، حالانکہ ایسا نیشنلزم جو دین کے انکار پر مبنی نہ ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں اور ایسا نیشنلزم جو انکار خدا یا ایمان کی نفی پر مبنی ہو، وہ کفر ہے اگر سرمایہ داری اور اسلام اکٹھے ہو سکتے ہیں اور آج تک مسلمان اس کو اکٹھے کرتے چلے آرہے ہیں، تو اسی طرح نیشنلزم اور اسلام بھی اکٹھے ہو سکتے ہیں اور سوشلزم اور اسلام بھی اکٹھا ہو سکتا ہے۔ جب تک اس کی تہ میں انکار خدا یا دہریت اور ایمان کی نفی موجود نہ ہو مسلمانوں نے جس طرح ملوکیت اور سرمایہ داری اور ڈکیٹر شپ کی لعنتوں کو اپنا رکھا ہے اور اس کو ترک کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ باوجودیکہ ان نظاموں کی خرابیاں تباہیاں اور مفاسد کو اچھی طرح جانتے ہیں اور بجز موت یا ہلاکت کے ان کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جس طرح امام ولی اللہؒ نے فرمایا ہے۔

كالمخنث يعلم ان الخنوثة	یعنی جیسے کہ مخنث خوب جانتا ہے کہ ہیجڑا
أسوءُ حالات الانسان	پن انسان کے حالات میں نہایت ہی بدترین
ولكن لا يستطيع الاقلاع	حالت ہے، لیکن وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔

عنها - ! (حجۃ اللہ البالغہ ص ۳ باب اختلاف الناس فی البرزخ)

پہلے بھی یہی حال مسلمانوں کا رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اشتراکیت تو اصلاً غیر فطری اور نامکمل نظام ہے جو اپنے عبوری اور تجرباتی دور میں ہی ناکامی کی طرف لوٹ گیا ہے۔ اس کا مستقبل بھی تابناک نہیں، بلکہ تاریک ہے۔ اسی طرح قومیت یا وطنیت جو مع الایمان ہو۔

وہ اسلام میں جائز ہے۔ ملوکیت اور ڈکٹیٹرشپ کو بھی مسلمانوں نے جمع کیا ہے۔ تو سوشلزم اور وطنیت کیسے کفر ہو سکتی ہے۔ فلسفہ چھانٹنا اور لمبے لمبے مضامین لکھنا مستشرقین کی عبارتوں کو یقینی علم سمجھنا اور علمائے حق اور اہلِ علم نے اگر کوئی بات کی ہو تو اس کو کفر اور ضلالت سے تعبیر کرنا کہاں کا انصاف ہے اور کہاں کی دیانتداری ہے۔ ذہنی آوارگی اور بے ہنگم قسم کی آزادی اور دینی حقائق میں تشکیک تو مودودی صاحب اور ان جیسے متجددین حضرات ہی کا کام ہے۔

وحدۃ الوجود اور وحدتِ ادیان کو ایک ہی مسئلہ قرار دینا سراسر بے انصافی اور تعدی نہیں اور کیا ہے؟ وحدۃ الوجود کا نظریہ تو چند ایک صوفیا کرام کو چھوڑ کر تمام کا مسلک رہا ہے اور علم حقائق سے بحث کرنے والے بزرگوں نے بھی اس سے کام لیا ہے۔ دراصل ربط الحادث بالقدیم یا ربط المخلوق بالخالق کی مشکل بحث سامنے آتی ہے تو اس مسئلہ میں کلام کرتے ہیں، چنانچہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مختلف اہلِ علم اور صوفیا کرام نے بہت سے طریق بیان کیے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب دمغ الباطل میں ان طرق میں سے ۲۴ طرق بیان کیے ہیں۔ انہی میں ایک طریق وحدۃ الوجود ہے۔ جو جمہور صوفیا کرام کا مسلک رہا ہے اور انہی طرق میں ایک وحدۃ الشہود بھی ہے جو بعض بزرگانِ دین کا مسلک تھا اور جس کو مجدد الف ثانیؒ نے زیادہ تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کو راجح قرار دیا ہے۔ یہ طریق چونکہ اکثر لوگوں کے لیے زیادہ قابلِ فہم ہے اور وحدۃ الوجود چونکہ زیادہ مشکل ہے اور اس کی بعض تعبیریں تنزیہ باری تعالیٰ کے خلاف واقع ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا اس سے بعض نے گریز بھی کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور مابعد الطبیعات اور ذاتِ باری تعالیٰ اور عالم صفات و جبروت و لاہوت عالم ارواح و مثال کے ابحاث۔ پھر صفاتِ باری تعالیٰ کی بحث اور ایسے ہی باریک مسائل سے بحثیں تمام اکابر صوفیا اور سلف نے کی ہیں اور سب نے

نقطہ عدل اور صحیح بات کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سلوک و تصوف و حقائق کے فنون کی کوئی کتاب بھی ان مسائل سے خالی نہیں۔ وحدۃ الوجود کی وہ تعبیر جس کو شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے اتباع نے اختیار کیا ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔

ابن عربیؒ کے کلام میں البتہ کچھ مشتبہ باتیں بھی پائی جاتی ہیں جن کی یہ بزرگ تشریح و توجیہ کرتے ہیں۔ وحدۃ الوجود کا عقیدہ اور توجیہ صحیح ہے اور قابل قبول ہے، البتہ اس کی کوئی ایسی تشریح قابل قبول نہیں ہوگی جس میں ذات باری تعالیٰ کی تنزیہ میں کچھ خرابی معلوم ہو۔ غلط توجیہات و معانی کو بزرگوں کی طرف منسوب کرنا اور پھر ان کی تردید کرنا یہ بات حق و انصاف کے خلاف ہے اور جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ ان کے بارے میں اپنی ہی عقل ناقص کو دخیل قرار دینا اور خود ساختہ فیصلہ کر دینا امانت و دیانت کے خلاف ہے۔

وحدۃ الوجود کے عقیدہ و مسلک سے ندوی حضرات غیر مقلدین اور امام ابن تیمیہؒ کے پیروکار اور بعض نقشبند یہ بھی بہت گھبراتے ہیں اور پھر سلف و بزرگان دین کے خلاف شرک و الحاد کی نسبت کرنے سے بھی تحاشی نہیں کرتے، یہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کے زمرہ میں آئے گا اور اتباع ظن ہوگا۔ ایسی باتوں کو فکلوه الیٰ عالمہ کرنا مناسب ہوگا، یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ ان سے گریز ہی کرنا چاہیے۔ ہاں جن کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی ہے۔ نقل صحیح اور کشف مستقیم سے بہرہ ور ہیں اور جو حقائق کو اپنی نورانی عقل اور فہم مستقیم سے سمجھتے ہیں اور نقل صحیح کے مطابق جانتے ہیں یہ ان کا کام ہے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مولانا داؤد غزنویؒ سے پوچھا تھا کہ مولانا شیخ ابن تیمیہؒ شیخ ابن عربیؒ کا رد و تکفیر کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، تو مولانا داؤد غزنویؒ نے بہت اچھی بات کہی کہ ڈاکٹر صاحب ابن عربیؒ اور ابن تیمیہؒ دونوں بزرگ اور بڑے لوگ ہیں۔ ہم خورد ہیں۔ ہمیں وہی باتیں کرنی چاہئیں

جو ہمارے لائق ہیں، ان کا معاملہ اُن کے ساتھ ہے، ہمیں ان کے معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

مولانا مودودی مرحوم کا ذکر

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم ..... نے بھی مولانا سندھیؒ پر کرم فرمائی کی ہے پہلے تو خوب ان کی توصیف و تعریف کی ہے اور ان کے علم و فضل کا وسیع پیمانہ پر اعتراف کیا ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ جیسا صاحبِ فراست آدمی میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ ان کے علم و فضل میں کوئی شبہ نہیں۔ ایسے وسیع النظر عالم اب کہاں؟

مولانا سندھیؒ مرحوم جن کی وفات زمانہ حال کا ایک قومی سانحہ ہے۔ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے مقصد اور تخیل کے پیچھے اپنا پورا سرمایہ زندگی لگا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے احترام پر مجبور ہیں جو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے مولانا مودودی صاحب نے مولانا سندھیؒ کی برہمی اور مستقل مزاجی کا ذکر بھی کیا ہے کہ ان کے نظریات کے خلاف جو بات کرتا تھا اس پر وہ مشتعل ہو جاتے تھے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا سندھیؒ اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا جتنا زبردست جوش اور ولولہ رکھتے تھے انہیں سمجھانے کی اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ ان کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا جو ان کی بات کو سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھائے۔ یہی خدمت ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے انجام دی۔ پھر اس کے علاوہ مولانا مودودی صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے نیشنلزم اور بین الاقوامیت پر جرح کی ہے کہ مولانا نے ان دونوں کو اکٹھا کرنے کے لیے ایک وحدت ادیان کا فلسفہ وضع کیا ہے اور دوسری طرف مخصوص مذہبی شرائع و قوانین اور تہذیبی صورتوں کو قومی خصوصیات قرار دے کر ان کے ترک و اختیار کی آزادی تمام قوموں کے لیے ثابت کرتے ہیں؛ چنانچہ انہوں نے یہی

کیا۔ وہ چند مطلق (بے صورت) صداقتوں کو اصل دین قرار دے کر کہتے ہیں کہ وہ تمام ادیان اور تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور قرآن دراصل انہیں کی طرف دعوت دینے آیا ہے، پھر ان شرائع اور سنن کو جو قرآن اور اسوۂ محمدی میں مقرر کی گئی ہیں اور جن پر عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ میں مذہبی معاشرتی تمدنی اور سیاسی زندگی کی تشکیل کی گئی تھی۔ محض قومی رسوم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان رسوم کو عالمگیر قانون زندگی بنانا مقصود نہ تھا بلکہ دین مطلق کے اندر ان رسوم کو قومی حالات وضروریات کے مطابق ڈھالنے اور بدل لینے کی گنجائش ہے۔

تخیل کی بے پایاں وسعتوں کو لیے ہوئے مولانا سندھیؒ جب تاریخ اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں خلفائے راشدین، بنو اُمیہ، بنو عباس، اکبر اور اورنگ زیب سب یکساں قابلِ قدر اور قابل تعریف نظر آتے ہیں۔ اگر ہم حسن ظن سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے نظام فکر کے بیشتر اجزا ایسے تھے جو ان کا اصل عقیدہ ومسلک نہ تھے بلکہ انہوں نے یہ ایک جدید علم کلام محض اس لیے مرتب کیا تھا کہ ان کے نزدیک موجودہ زمانہ میں دین کی دعوت انہی اصولوں پر پھیلائی جا سکتی تھی، لیکن اس حسن ظن کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ جدید فلسفہ وکلام قطعی غلط اور سراسر ضلالت ہے! اور اگر دین کی دعوت پھیلنے کی بس یہی ایک صورت رہ گئی ہے، تو اس طرح اس کے پھیلنے سے نہ پھیلنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقہ سے تھا جو اپنی گروہ بندی کی عصبیت میں حد کمال تک پہنچا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سب کچھ فرما گئے اور لکھوا اور چھپوا بھی گئے اور پھر بھی تنقید کی زبانیں بند اور تعریف کی زبانیں تر رہیں۔ ورنہ کہیں انہوں نے اس طبقہ خاص سے باہر جگہ پائی ہوتی، تو ان کا استقبال سرسید اور علامہ مشرقی سے کچھ کم شاندار نہ ہوا ہوتا۔ (ترجمان القرآن جولائی تا اکتوبر ۱۹۴۴ء) (شخصیات صـ ۲۲۵)۔

لہٰذا، یہ خدا کا بندہ کثیر المعلومات اور وسیع المطالعہ شخص تھا، لیکن اس کا علم کسی اصل اصیل کی طرف راجع نہیں تھا۔ بلکہ یہ خود رو زوابت میں سے، تھا۔ اس شخص نے جب دینی عقائد اور متفق علیہ مسائل میں کلام کرنا شروع کر دیا اور مفتی بن کر بعض مسائل میں غلط فتوے دینے شروع کر دیئے تو علماء نے اس کو مشورہ بھی دیا کہ آپ فتویٰ نویسی نہ کریں یہ آپ کے بس کا روگ نہیں، لیکن اس شخص نے علماء کے مشورہ کو قبول نہ کیا تمام مسائل میں اپنی رائے کو یقینی اور مجتہدانہ خیال کیا۔ حالانکہ اس کا میدان اسلام کے اجتماعی مسائل یا معاشی اور اقتصادی مسائل تک محدود رہتا تو شاید قوم کو کسی قدر فائدہ ہوتا اور امت بھی خلفشار سے بچ جاتی۔ سیاسی اجتماعی، اقتصادی یا معاشی یا دورِ جدید کے بعض پیدا کردہ مسائل میں یہ اپنی رہنمائی کو کام میں لاتے، تو شاید فائدہ ہوتا، لیکن اس نے مکمل چودھراہٹ کا خیال اپنے سر میں جما لیا تھا۔ اس لیے اس نے علماء حق کی تردید و تخطیہ شروع کر دیا جس سے ملت کا بہت نقصان ہوا اور بہت سی طاقت رائیگاں گئی۔ یہ طاقت اگر باطل کے مقابلہ میں صرف ہوتی تو قوم کی فلاح و بہتری کا سامان پیدا ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور علماء حق کو اس کی فاسد فکر اور گمراہ کن نظریات کی تردید میں بہت کچھ اقدام کرنا پڑا اور ان کے پیروکار بالکل ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی فرقہ بن کر رہ گئے، چنانچہ اس دور کے بڑے بڑے اہل حق اور اہل اللہ نے ان کے فکری فساد کی شہادت دی اور ان کا رد کیا، چنانچہ ابوالاعلیٰ مودودی کے استاذ الاستاذ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ نے ان کے متعلق رائے دی۔

سوال: مودودی صاحب کے زیر اثر جو جماعت اسلامی ہے۔ اس میں شرکت کرنا ان سے تعلق رکھنا ان کی تصانیف پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: مودودی جماعت کے افسر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کو میں جانتا ہوں وہ کسی معتبر اور معتمد علیہ عالم کے شاگرد اور فیض یافتہ نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی نظر اپنے

مطالعہ کی وسعت کے لحاظ سے وسیع ہے تاہم دینی رجحان ضعیف ہے۔ اجتہادی شان نمایاں ہے اور اسی وجہ سے ان کے مضامین میں بڑے بڑے علماء اسلام بلکہ صحابہ کرامؓ پر بھی اعتراضات ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اس تحریک سے علیحدہ رہنا چاہیے اور ان سے میل جول ربط و اتحاد نہ رکھنا چاہیے۔ ان کے مضامین بظاہر دلکش اور اچھے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان میں ہی وہ باتیں دل میں بیٹھتی جاتی ہیں جو طبیعت کو آزاد کر دیتی ہیں اور بزرگانِ اسلام سے بدظن بنا دیتی ہیں۔ (کفایت اللہ کان اللہ لہ دہلی)

(کفایۃ المفتی صفحہ ۳۲۸ ج ۱)

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا زکریا صاحبؒ مولانا احمد لاہوریؒ، حضرت عبدالحق نافع گل صاحبؒ مولانا تھانویؒ اور ان کے مکتبہ فکر کے تمام علماء اور مفتیان کرام نے مودودی صاحب کی گمراہ کن تحریروں کی نشاندہی کی مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا مدنیؒ تو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے۔ الغرض کہ طبقہ علماء میں ان کے عقیدہ یا فکر کی کسی نے بھی تصویب نہیں کی اور اگر کسی نے کی ہے تو اغراض کی بنا پر تھی۔ بعض مودودی حضرات کہتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی تحریرات کے ذریعہ بہت خیر پھیلائی ہے، لیکن بقول مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ انھوں نے اگرچہ اپنی تحریروں کے ذریعہ بہت خیر پھیلائی ہے، لیکن شر بھی بہت پھیلایا ہے، اس قدر جس کی تلافی ممکن نہیں۔

جمہوریت میں بھی بہت سی باتیں لازم کر دی گئی ہیں جو اسلام میں جائز نہیں، لیکن اس سے مطلق جمہوریت کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ جتنی باتیں اس میں اسلام کے خلاف ہوں گی۔ ان کو ہی ناجائز و حرام یا مکروہ گردانا جائے گا۔ اسی طرح صنعت و حرفت تجارت شراکت اور مختلف کمپنیوں میں بھی بہت سی چیزیں ناجائز دخیل ہو گئی ہیں۔ ملٹری اور فوجی سسٹم میں بہت سی غیر شرعی باتیں داخل ہیں۔ زراعتی ایسوسی ایشنوں میں

ایسی اشیاء داخل ہیں تو بالکلیہ ان تمام شعبوں کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جتنی خرابی ہوگی اس کی اصلاح ضروری ہوگی۔ لادینیت الحاد و دہریت تو ان کے ساتھ لازم نہیں، تاکہ کلیتہً حرمت کا حکم کیا جائے۔ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ "اگر کسی عمل میں عوارض غیر مشروع لاحق ہوں تو ان عوارض کو دور کرنا چاہیے، نہ یہ کہ اصل عمل سے انکار کیا جائے۔ ایسے امور سے منع کرنا خیر کثیر سے باز رکھنا ہے (شمائم امدادیہ ص۶۸)

ایک چیز کی ایک حد ہوتی ہے اس کو اسی حد پر رکھنا چاہیے، چنانچہ یہ حدیث اس بات پر روشنی ڈالتی ہے۔

فسیلة انها قالت سمعت ابی	فیلہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے اپنے
(واثلةؓ بن الاسقع)	والد (واثلہؓ بن الاسقع) سے سنا
یقول سالت رسول اللہ	وہ کہتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم	علیہ وسلم سے سوال کیا کہ حضور یہ
فقلت یا رسول اللہ امن	فرمائیں کہ کوئی شخص اپنی قوم سے
العصبیة ان یحب الرجل	محبت کرتا ہے تو یہ تعصب میں شمار
قومه۔ قال لا۔ ولکن	ہوگا۔ فرمایا نہیں۔ اپنی قوم سے محبت
من العصبیة ان ینصر الرجل	کرنا عصبیت نہیں۔ عصبیت تو یہ ہے
قومه علی الظلم۔	کہ اپنی قوم کی ظلم پر حمایت کرے۔

(مسند احمد ص۱۰۷ ج۴)

قومیت میں مومن اور کافر مشترک ہو سکتے۔ فاسق اور صالح بھی، قومیت میں اشتراکیت رکھ سکتے ہیں۔ قرآن میں بہت سے انبیاء علیہم السلام کی قوموں کا ذکر ہے۔ قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم شعیب، قوم موسیٰ، قوم عیسیٰ اسی طرح قوم تبع، دین وملت میں اشتراک نہیں ہو سکتا۔ امت مومن وکافر کا اشتراک ہو سکتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے معاہدہ میں یہ الفاظ شامل ہیں۔

ان یھود بنی عوف اُمّۃ مع المؤمنین للیھود دینھم و للمسلمین دینھم۔	کہ بنی عوف کے یہود اہلِ ایمان کے ساتھ ایک اُمّت ہیں۔ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر۔!

(سیرت ابن ہشام صفحہ ۵۰۳ ج ۱)

مومن آپس میں دینی رشتہ اخوت میں منسلک ہیں جیساکہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے انما المؤمنون اخوۃ (حجرات) کہ مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان المؤمن اخوالمؤمن۔ ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے۔ قومیت یا قوم باعتبار نسب کے ہوتی ہے جیساکہ قریش اوس۔ خزرج وغیرہ اور پیشے کے اعتبار سے بھی قومیت ہوتی ہے جیساکہ قصاب، درزی، کمہار، حجام، نورباف (جولاہے) دھوبی موچی وغیرہ اور باعتبار مذہب اور دین کے بھی قوم ہوسکتی ہے۔ جیساکہ قوم مومن۔ قوم کافر وغیرہ باعتبار رنگ کے مثلاً سیاہ فام قوم سفید فام قوم وغیرہ باعتبار لسان کے بھی ہوسکتی ہے۔ جیساکہ پشتون قوم، بلوچی قوم، سندھی قوم، پنجابی قوم، بنگالی قوم وغیرہ۔ اوطان کے اعتبار سے بھی قومیتیں ہوتی ہیں۔ جیساکہ موجودہ دور میں ہیں جیساکہ ترکی۔ انگریز۔ فرانسیسی جرمن۔ چین۔ جاپان۔ ہندی۔ روسی۔ ایشیائی۔ افریقی۔ امریکی۔ پاکستانی وغیرہ۔

حضرت مولانا سندھیؒ علما کی نظر میں

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ

سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سندھیؒ کے بارہ میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کا خیال ذکر کیا جائے جو اصلاً ایک حکیم الامت اور غیر سیاسی شخصیت تھے۔ سیاسی اور پولیٹیکل معاملات میں قطعاً دخل نہیں دیتے تھے اور ہمہ وقت تعلیم و تربیت تصنیف و فتاویٰ نویسی بیعت و ارشاد مسائل کا حل، سلوک و تصوف کے گہرے اور عمیق مسائل کا حل اور وعظ و نصیحت ہی ان کا میدان عمل تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ارشد خلفاء اور تربیت یافتہ تھے۔ مولانا شیخ الہندؒ کے شاگرد۔ دیوبند کے اوّلین فضلاء میں سے تھے۔ کانپور میں خوب جم کر پندرہ سال تدریسی خدمات انجام دیتے رہے پھر چھوڑ کر تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ جو حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی طرف منسوب تھی اس میں بیٹھ کر ساری زندگی دین کی خدمت کرتے رہے۔ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی کافی عرصہ تک سرپرستی بھی فرماتے رہے۔ ان کی تحریرات اور تصانیف رسائل تفاسیر سلوک و تصوف۔ قراۃ و تجوید کی کتابیں تمام برِصغیر میں بے حد مقبول و معروف ہیں اور خلق خدا نے ان سے خوب فائدے اٹھائے۔ بیعت و ارشاد سے بھی بے شمار مخلوق خدا کو فائدہ پہنچا۔

بذاتہ حضرت تھانویؒ ایک مرشد برحق خدا پرست متقی عالم دین تھے۔ مگر انگریز کے خلاف ملکی تحریکات کے خلاف تھے۔ ان کے خیال میں انگریز سے ٹکر لینا تقریباً ناممکن تھا۔ اس لیے وہ یہی مناسب سمجھتے تھے کہ اس سے الگ رہ کر جس قدر دین کی خدمت ہو سکے وہ انجام دی جائے۔ مولانا انگریز کے طرفدار قطعاً نہیں تھے اور نہ انگریز کو پسند کرتے تھے، لیکن اصحاب رخصت کی طرح اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور رخصت پر عمل پیرا تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا تھانویؒ کے ایک بھائی مظہر علی انگریز کے (سی آئی ڈی) کے محکمہ میں تھے اور انہوں نے آزادی پسند مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچایا ہے، لیکن مولانا تھانویؒ اس بھائی کے زیر اثر نہیں تھے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔ ہمیں مولانا تھانویؒ کی کسی تحریر سے یا ان کی زندگی کے تعلق سے اس بارہ میں قطعاً کوئی ایسی چیز نہیں نظر آئی جس سے اس کا شبہ پڑتا ہو۔ ہندوؤں کی نہایت متعصب اور گندہ تنگ نظری اور شرکیہ رسومات اور اوھام و رسومات باطلہ کو وہ بہت زیادہ خطرناک سمجھتے تھے اور اپنی تحقیق و صوابدید کے مطابق انگریزوں سے ٹکر لینے میں مصلحت نہیں سمجھتے تھے اور اس کے برخلاف مولانا شاہ عبدالعزیزؒ سے لے کر مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ، سید احمد شہیدؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا شیخ الہندؒ اور ان کے دیگر تلامذہ اور بعض دیگر علماء کرام انگریز کے تسلط کو اور اس کی غلامی کو بہت خطرناک اور مضر خیال کرتے تھے اور واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ انگریز کے تسلط کے بعد ایشیار کے لوگوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس قدر نقصان پہنچا کہ تاتاریوں کا حملہ بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہو کر رہ جاتا ہے۔ انگریز کی منحوس غلامی اور تسلط نے مسلمانوں کی سلطنتیں حکومتیں اور ان کے مذہب و دین علوم و فنون صنعت و حرفت و معاشرت تمدن و تجارت اقتصادیات و معاشیات اخلاق و اعمال تمام چیزوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا خلافت کو تہس نہس کیا اور مسلمانوں سے خوب انتقام لیا۔ بقول سید جمال الدین افغانیؒ انگریز ایسی سخت اور خطرناک قوم ہے جو دادا کا انتقام پوتے سے لیتی ہے۔ رجال کار کو قتل و معدوم کرنے

کے ساتھ ساتھ جو اہانت و ذلت کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ انگریز نے روا رکھا۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور پھر یہ تمام ظالمانہ کارروائیاں تہذیب و قانون عدل و انصاف کے نام پر انجام دی گئیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بھی انگریز نے نقصان پہنچایا ہے، لیکن وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں عشر عشیر بھی نہیں۔ مسلمانوں کو اس واسطے ہدف بنایا گیا کہ ان کے ہاتھ سے انگریز نے اقتدار و حکومت چھینی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو تحقیر و تذلیل کا خوب خوب مورد اور ہدف بنایا گیا، تاکہ مسلمان پنپ نہ سکیں۔ انگریز نے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے بعد ایشیا اور افریقہ کے دیگر کمزور ممالک پر قبضہ جما لیا۔ یہاں تک کہ ایک وقت برطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا اور مشہور تھا کہ اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کے ظلم و جور کی وجہ سے اس کو زوال کی گھاٹ میں اتار دیا اور وہ سکڑ کر اپنے انگلینڈ کے جزیرہ میں ہی رہ گیا اور مشرقی افریقہ کے اکثر ممالک بھی اس کے قبضے سے آزاد ہو گئے۔ اور باقی ماندہ آزاد ہو رہے ہیں۔ ہندو تو مسلمانوں کا کبھی بھی حریف نہیں رہا۔ اس کو انگریز نے ہی بڑھا کر مسلمانوں کے مقابلہ میں کھڑا کیا، لیکن عیسائی طاقت خلفاء راشدین کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں کے حریف اور اعدا چلے آ رہے ہیں۔ ابتدا میں رومی عیسائیوں کے ساتھ پھر قرون وسطیٰ میں صلیبی جنگوں کی شکل میں اور قرونِ آخیرہ میں فرانس۔ برطانیہ، جرمنی اور روسی عیسائیوں نے اور آج کل امریکی عیسائی اور یہودی مسلمانوں کو ذلت ناک عذاب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ان کے شر سے مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ مسلمانوں کو غلام بنا کر اس قدر سست کر دیا ہے کہ ان کی آزادی کا احساس تک نہیں اور وہ اپنے دینی اقدار قرآن و سنت اور اعلیٰ اخلاق سے عاری ہو چکے ہیں۔ اپنی تاریخ اور حیرت انگیز کارناموں کو بھی انگریز نے ان کے ذہنوں سے محو کرنے کی بھر کوشش کی ہے اور اکثریت اسی کا شکار ہے ان کے پاس اپنا کوئی پروگرام اور آئیڈیا نہیں۔ ہر چیز میں ان کو غیروں کا دستِ نگر بنا دیا

ہے اور ان کی ملی غیرت کو یکسر ختم کر دیا ہے۔ لہو و لعب کے فنون میں اور عیاشی اور فحاشی کے پروگراموں میں ان کو ایسا پھنسا دیا ہے کہ اس سے باہر نکلنے کا امکان کم ہے اور جب تک مسلمان امریکہ، فرانس، برطانیہ اور روس کی غلامی میں رہیں گے، وہ اپنا کوئی کام نہیں کر سکتے اور نہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور جب تک وہ ان کی ہر قسم کی غلامی سے آزاد نہیں ہوں گے وہ کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عزت آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے جو فطری حالت ہے اور غلامی غیر فطری حالت ہے۔ پھر اقتصادی اور اخلاقی غلامی تو انتہائی خطرناک ہے۔ انسانی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے لوگ محتاج ہو کر ہر ذلت کا کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور عزت کا کوئی کام نہیں کر سکتے اور نہ اس کے بارے میں کچھ سوچ سکتے ہیں۔ انسان کی ذہنی مرعوبیت اور غلامی اس کو پستی میں دھکیل دیتی ہے۔ اجب ذہن اور فکر ہی اپنی نہ رہے تو انسان ہمیشہ دوسروں سے مانگی ہوئی چیزوں پر ہی گزارا کرتا رہتا ہے، لیکن یہ مانگی ہوئی چیزیں کب تک اس کے پاس رہیں گی۔ ع هيهات ماللعاديات دوام۔ مانگی ہوئی چیزیں ہمیشہ نہیں رہ سکتیں۔ آج تمام عالم کے مسلمانوں کو کون سمجھائے کہ خدا کے بندو ان لعینوں کی غلامی سے اپنے آپ کو باہر نکالو۔ تمہارا ایک مضبوط دین ہے۔ ایک پائیدار شریعت و قانون ہے۔ تمہاری اپنی ایک معتدل اور بہت اشرف معاشرت ہے اور تمہاری شاندار ایک تاریخ ہے فاين تذهبون کدھر جا رہے ہو۔ تمہارے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس کا آئین و قانون ابدی اور لازوال ہے۔ اس سے بہتر کوئی قانون کوئی آئین تمام صفحہ ہستی پر موجود نہیں۔ تمہاری عورتوں کو انگریز نے بے حیا اور تمہارے نوجوانوں کو مخنث بنا کر رکھ دیا ہے اور تم اس کو اعلیٰ درجہ کی ترقی و خیال کرتے ہو۔ یاد رکھو جو قوم قرآن کریم کے پروگرام کو نہیں پکڑے گی، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی نہ فلاح پا سکتی ہے۔ اگر جمال الدین افغانیؒ نے اپنی ساری زندگی اس بات کو سمجھانے میں کھپا دی تھی کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو کہ انگریز ان کا دشمن ہے۔ اس سے ہوشیار رہیں، تو اسی طرح حضرت مولانا سندھیؒ نے اپنی ساری زندگی اس نقطہ پر مرکوز رکھی کہ مسلمانوں کو کسی طرح

قرآن کا پروگرام سمجھ میں آجائے اور وہ اپنی نشاۃ ثانیہ میں اپنے مقام کی طرف لوٹ سکیں یہ ان کا مقام تھا اور ان جیسے دیگر علماء کا۔ حضرت تھانویؒ اور ان کے اتباع و مریدین حقیقت میں بہت اچھے لوگ سے مخلص تھے اور تعلیم و تربیت کو ہی وہ ابتدا اور انتہا سمجھتے تھے۔ ظواہر ارکان اسلام کی تعمیل اور سنن و مستحباب کی پابندی فرائض و واجبات کو ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے برصغیر میں جابجا مدارس دینیہ قائم کیے اور بعض نے خانقاہی نظام کے ذریعہ کچھ اصلاحی پروگرام رکھے۔ بعض نے سکولوں اور کالجوں میں جاکر کچھ نہ کچھ کام کیا۔ بعض نے حکمت و طبابت کے پیشے سے کام لے کر لوگوں کو دین و مذہب کے قریب کیا۔ بعض نے تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بنا کر اپنے مشن کو قائم رکھا۔

(۱۲) مولانا تھانویؒ کے مریدین و متبعین علماء کرام میں بہت سے اچھے لوگ تھے مولانا بشیر احمد عثمانیؒ، قاری محمد طیب صاحبؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولوی ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا اطہر علی بنگالیؒ، استاذ العلماء، مولانا خیر محمد جالندھریؒ، صوفی کامل حضرت مولانا محمد حسن امرتسریؒ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور اس طرح کے بے شمار علماء کرام نہایت اچھے لوگ تھے اور اپنی ہمت و طاقت کے مطابق دین و مذہب کی خدمت کرتے رہے۔ دینی تعلیم اور تصنیف ارشاد و بیعت وغیرہ کے ذریعے یقیناً ان لوگوں نے بے بہا خدمات انجام دی ہیں، لیکن پولیٹیکل معاملات میں یہ لوگ بالکل صفر تھے اور انگریز جیسی چالاک ڈپلومیٹک اور ظالم حکومت سے ٹکر لینا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی اور نہ یہ لوگ قید و بند جیل خانوں کی سختیاں برداشت کرنے کی ہمت و طاقت رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا کام فتویٰ نویسی تالیف و تصنیف تعلیم و تدریس و عظ و ارشاد بیعت و تلقین تھا اور یہ لوگ اپنے اپنے فن میں کامل تھے اور بہت سے لوگوں کے لیے مرجع و مورد تھے۔ سیاسی معاملات کی پیچیدگیوں سے بے خبر، یہ نیک لوگ مسلم لیگ جیسی جماعت کے جھانسے میں آگئے مسلم لیگ

اگرچہ اچھے اور بُرے لوگوں کا ایک مجموعہ تھا۔ اس لیے کہ آغاخانی شیعہ، سنی، رافضی، اثنا عشری۔ عام شیعہ اور قادیانی لاہوری مرزائی، خانقاہی لوگ اہل شرک و بدعت اور جاگیردار انگریز کے دور کے نواب، انگریز پرست اور جدید تعلیم یافتہ کلرک قسم کے لوگ، کمیونسٹ ذہن کے لوگ اور عوام سب ہی اس میں شامل تھے، لیکن مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ میں اکثر و بیشتر بے دین اقتدار پسند چوہدراہٹ کے طالب لوگ ہی تھے جو مذہب کو اپنے اقتدار کے لیے استعمال کرنا خوب جانتے تھے۔ سادہ مزاج علماء کرام، سادہ لوح عوام کو اپنے ساتھ ملانے کا فن خوب جانتے تھے اور اُدھر انگریز سے ان کا ربط و ضبط اور مفاد بھی وابستہ تھا کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلاف و خلفشار کے دور میں دین و مذہب کو جس طرح بے دردی سے ان لوگوں نے اپنے حصولِ اقتدار کے لیے زینہ بنایا، یہ علماء کرام اس کا قطعاً اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ جب حصولِ اقتدار کی منزل آ گئی، تو یہ جغادری لوگ اپنی منزلِ مقصود کے پالینے کے بعد۔ ان علماء کو کیا جانتے تھے یا ان کی رائے اور مشورہ کی کیا وقعت تھی ان لوگوں کے نزدیک یا اسلام و دین کو کون جانتا تھا، ادھر جس قسم کا نظام حکومت انگریز نے ان کے سپرد کیا۔ یہ علماء اس سے قطعاً ناآشنا تھے۔ یہ اپنی سادگی سے یہ سمجھتے تھے کہ انقلاب آئے گا، تو لوگ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی اور دیگر علوم اسلامیہ کی طرف رجوع کریں گے اور ہماری ضرورت پڑے گی۔ وہاں تو یہ سلسلہ تھا ہی مفقود۔ وہاں برطانیہ کا لا اور یورپ کا قانون وہی تربیت وہی دستور و قانون اور اس قسم کے تربیت یافتہ لوگ درکار تھے، وہ اپنا کام کر گئے۔ لیکن غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے نہ ان حضرات کی کوئی تعلیم و تربیت تھی اور نہ ہمت و طاقت اور نہ مصائب کو انگیخت کرنے کی جرأت۔ غلامی ایک ایسی ملعون بیماری ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم جب فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئی تھی، تو وہ کتنی پست ہمت تھی۔ اللہ کے نبی کی بات پر بھی کان نہیں دھرتے تھے اور اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ سے لب کشائی کرتے تھے۔ جب تک ان سے

اس غلامی کے دور کی پست ہمتی، سستی، کاہلی اور کام چوری کی عادت دُور نہ ہوئی۔ اس وقت تک وہ جہاد میں شریک نہ ہو سکے اور اس اثناء میں ستر سال گزر گئے۔ انگریز کی غلامی سے ہمارے ہم وطنوں اور اہل مذہب کو آزادی کے چالیس سال گزرے ہیں اور ابھی ہماری قوم کا روز اوّل ہی ہے۔ ہمارے اندر آزادی کی خصلتیں ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں۔ خدا جانے کب تک یہ نحوست دور ہو گی اور لوگ آزادی کی قدر و حکمت کو معلوم کریں گے اور اس کے لیے قربانی کرنے کے لیے مجموعی طور پر تیار ہوں گے۔ اِکّے دُکّے افراد کی ہمت و جوانمردی سے یہ مسائل حل نہیں ہوتے۔ جب تک کہ اکثریت کے اندر یہ جوشِ ایمان و جذبہ حریّت اور اخلاقِ عالیہ کی قدریں زندہ نہ ہوں۔ خود غرضی، جاہ پسندی رفاہیت بالغہ، خوش حالی، تعیش، لہو و لعب سے محبت، فرائض سے غفلت، غیروں کی دست نگری، چودھراہٹ، جھوٹا مذہبی غرور، فرقہ واریت اور تکبر، خود پسندی، ملوکیت، سرمایہ داری، ڈکٹیٹرشپ، ظلم و تعدی، غیروں کے آلہ کار رہنے کی باتیں ہوں گی تو کامیابی بھی ناممکن ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک مقالہ بنام (دعاۃ الامۃ وھداۃ الملۃ) (امت کے داعی اور ملت کے ہادی) لکھ کر، ۷ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کو مؤتمر الانصار کے اجلاس ثانی میرٹھ میں پڑھ کر سنایا۔ یہ مقالہ فل سکیپ کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس وقت القاسم میں شائع ہوا تھا۔ اس کی فوٹو کاپی ہمارے پاس موجود ہے جو ہمیں مولانا سندھیؒ کے تلمیذ علامہ محمد صدیق صاحب آف یزمان سے حاصل ہوئی ہے۔ اس مقالہ کے آخر میں حضرت مولانا تھانویؒ نے مولانا سندھیؒ کے بارہ میں لکھا ہے "اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اس مختصر مضمون میں صرف اجمالی خاکہ ضرورت و حالت دار العلوم کا کھینچا گیا ہے۔ اس کے بعد میں مولانا عبید اللہ صاحب ناظم جمعیۃ الانصار سے درخواست کرتا ہوں کہ زبانی یا اپنی تحریرات سابقہ یا حال کے ذریعے سے جو کہ اسی مضمون میں لکھی گئی ہوں۔

وہ ان ہی کی توجہ کی برکت ہے اور میں یہ بات براہ تکلف نہیں کہتا، بلکہ یہ ایک واقعہ ہے جو مجھ پر گزرا ہے کہ جب مجھ سے مولوی صاحب موصوف نے اس بات میں کچھ لکھنے کو فرمایا، واقعی میں خالی الذہن تھا۔ ایک صفحہ کے لائق بھی ذہن میں مضمون نہ تھا اور مولوی صاحب نے فرمائش کی بیس صفحہ کی۔ میں نے عذر بھی کیا، مگر وہ دوبارہ فرمانے سے قبول کرنا پڑا، لیکن متردد تھا کہ کیا لکھوں گا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عبارت کہ وہ بھی مجھ کو مولوی صاحب ہی سے ملی تھی۔ میرے پاس کل سرمایہ یہ تھا۔ مگر جب لکھنے بیٹھا غالباً پانچ گھنٹہ میں یہ بیس صفحہ لکھے گئے۔ میرا اعتقاد یہ ہے کہ اس فضل خداوندی کے ظاہری دو سبب ہوئے۔ ایک مدرسہ دیوبند کی مقبولیت، دوسرا مولوی صاحب کی توجہ کی برکت، اس کے چاہیے یہ معنی نہ ہوں کہ مولوی صاحب، صاحبِ تصرف ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ صاحبِ خلوص ہیں خلوص کی ایسی تاثیرات متعدیہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۲۰ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۰ھ مقام تھانہ بھون

خانقاہ امدادیہ

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت تھانوی کے قلب میں مولانا سندھیؒ کے بارے میں گہرے نقوش ثبت تھے۔ ان کے بے پناہ خلوص اور دارالعلوم دیوبند کی فلاح اور ملتِ اسلامیہ کی خیر خواہی اور بہتری کے بارے میں ان کی ہر وقت توجہ، انہماک اور بے پناہ قربانیاں، اور سعی پیہم، یہی لگن مولانا سندھیؒ کو آخر وقت دامن گیر رہی۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مولانا سندھیؒ کیا کہتے تھے اور ان کی شخصیت اور کارنامے کیا تھے۔ اس بارے میں

حضرت مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "نقش حیات" لکھی ہے جس کی ۲ جلدیں ہیں اس میں حضرت مدنیؒ نے اپنے حالات اور کارناموں کا تو زیادہ تر اخفا کیا ہے، زیادہ اپنے شیخ و مربی استاذ العلماء اور امام الانقلابیین حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کے حالات زیادہ تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ مولانا شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کی خدمت میں سالہا سال رہ کر بے انتہا اخلاص ومحبت کے جذبات اپنے سینہ میں رکھتے ہوئے ان سے تربیت حاصل کی تھی اور یہ کامل ہستیاں وہ حضرات ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کرکے تھانہ بھون وغیرہ کے علاقوں سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا، مگر خدا تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ ان حضرات کی کوششیں اس وقت کامیاب نہ ہوسکیں (اور انگریز کا منحوس تسلط برصغیر پر قائم ہوگیا) لیکن ان حضرات کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ سلگتی رہتی تھی اور اسی لیے مولانا شیخ الہندؒ انگریزی اقتدار کے خاتمہ اور فنا کردینے کے جذبات مستقل طور پر اپنے اندر رکھتے تھے، لیکن حالات کی ناسا عدت وسائل کی کمی، اگر ایک طرف سدِ راہ تھی، تو دوسری طرف انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور شرمناک وحشت و بربریت اور مظالم انتہائی مایوس ومضطرب کرتے تھے اور بعض اوقات خیال کرتے تھے کہ نتائج وعواقب سے بے نیاز ہوکر سربکف اور کفن بردوش ہوکر میدانِ عمل میں نکل آئیں، لیکن پھر حالات کی نزاکتیں اور اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن جاتی تھیں۔ بہت غور وفکر کرنے کے بعد قادرِ مطلق پر اعتماد وبھروسہ کرکے کام شروع کر دیا۔ شروع شروع میں بہت زیادہ مشکلات قیاس واندازہ سے زائد سامنے آئیں۔ احباب واقارب مار آستین بن گئے۔ ناصح وخیر خواہ بن کر سدِ راہ بنے اور ایسا ہونا قدرتی اور یقینی تھا، کیونکہ انگریز نے اس قدر بندش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا بھی ۱۸۵۷ء کا منظر پیش کرتا تھا۔

آزادی اور انقلاب کا خواب بھی بتہ پانی کرتا تھا۔ ہوم رول اور حکومت خود اختیاری کی خواہش زبان پر لانا برق جہاں سوز سے کم تباہ کن نتائج نہیں رکھتا تھا۔ برطانوی تشدد اور مظالم نے قلوب اور دماغوں کو اس قدر مرعوب کر رکھا تھا کہ بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ پاتے تھے جس قدر انگریز کا خوف ان پر مستولی تھا خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن پر شبہ کرنا بھی بے دینی اور کفر سمجھا جا سکتا تھا۔ چاروں طرف سی آئی ڈی کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ہم خیال، ہم زبان یا ہم فعل ہو سکتا ہے۔ ہر شخص آزادی کے ذکر سے بھی کان پر ہاتھ رکھتا تھا۔ مولانا شیخ الہندؒ ایسے طوفانوں میں اور ایسے خوفناک سمندروں میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر داخل ہوئے اور لوگوں کو ہم خیال اور رفیق سفر بنانے لگے۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ چونکہ ناامید اور مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور مولویوں اور پیروں سے امید نہ رکھنی چاہیے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی) وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے بہت زیادہ خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس لیے (مولانا شیخ الہندؒ) اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھدار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے جن میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی ہیں۔ (مولانا مدنیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی وحریت جہاد وانقلاب کے سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا سندھیؒ کا ذکر کیا) مولانا عبید اللہ صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور نومسلم شاگرد تھے بعرصہ دراز تک خدمت میں رہے تھے۔ سمجھ اور حافظہ نہایت اعلیٰ پیمانہ کا اور ہمت واستقلال بے نظیر، قدرت نے عطا فرمایا تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیمی کام کرتے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے عقائد وخیالات پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے۔ اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک وشبہات

دین اسلام سے دُور ہو جائیں اور وہ سچے اور پکے مسلمان ہو جائیں۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ دہلی تشریف لے گئے اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ صاحب سے ملاقات کی اور تذکرہ فرمایا کہ "جب کہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم رہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے۔ اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنا دیں گے" مولانا عبیداللہ صاحب کی سمجھ میں مولانا شیخ الہندؒ کی سکیم آگئی اور وہ عالی ہمتی اور جوان مردی سے تمام ہولناک خطروں کو پس پشت ڈالنے اور تمام مصائب کو جھیلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ (مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں) کہ رولٹ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ مولوی عبیداللہ نے (مولانا) محمود حسن کے خیالات پر اثر ڈالا۔ حالانکہ مولوی عبیداللہ تو تعلیمی جد وجہد میں منہمک اور مشغول تھے۔ میں نے ان کو ادھر سے کھینچ کر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا۔ حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو مکمل طور پر اپنا ہم خیال اور ہم عمل بنا لیا۔ چونکہ ان کے بہت سے احباب اور جان پہچان والے سندھ، پنجاب، سرحد وغیرہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے معتمد علیہ حضرات کو بار بار سفر کر کے ہموار اور استوار کیا اور اس تحریک کا ممبر بنایا اور دہلی میں رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہونے لگے۔ مولانا شیخ الہندؒ ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم مولانا شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلامؒ وغیرہ حضرات کے لیے بھی مولانا سندھیؒ واسطہ اور ذریعہ بنے حضرت شیخ الہندؒ نے بار بار مولانا سندھیؒ کو فرنٹیئر یاغستان سندھ وغیرہ بھیجا اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس اسکیم کو جاری کیا۔ اس کے بعد مولانا مدنیؒ نے صفحہ ۱۴۱ سے لے کر ۱۸۱ تک مولانا سندھیؒ کے متعلق تفصیلات اور ان کے کارنامے ذکر کیے ہیں اور یہ زیادہ تر مولانا سندھیؒ کی تحریرات سے ماخوذ ہیں مولانا سندھیؒ کی ذاتی ڈائری، مولانا سندھیؒ کا سیاسیات میں داخل ہونا اور سیاسی پروگرام کو چلانا اور اس دوران تعلیم و تدریس اور تصنیف کا شغل جاری رکھنا۔ پھر ۱۹۱۵ء کو دیوبند

سے سندھ واپس آنا اور مولانا شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل کی طرف ہجرت کرکے کابل کے حکمرانوں سے مل کر ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی تدابیر کانگرس کی شاخ کا قیام اور اس کا انڈین کانگرس کے ساتھ الحاق ہندوستانی مشن روسی مشن اور کابل میں ہندوستان کی عارضی حکومت کا قیام ۔ امیر حبیب اللہ خان کا قتل، امان اللہ خان کی حکومت کا قیام اور پھر انگریز کے ساتھ جنگ اور افغانستان کا انگریز کے تسلط سے آزاد ہو جانا ۔ پھر مولانا سندھیؒ اور ان کے رفقاء کا انگریز کی سازش سے افغانستان میں نظر بند ہونا اور پھر وہاں سے اخراج، روس اور ترکی کا سفر اور تمام واقعات بالاجمال ذکر کیے گئے ہیں۔ امیر امان اللہ خان نے مولانا شیخ الہندؒ کی وفات پر تعزیتی اجلاس میں جو تقریر کی تھی اس میں وعدہ کیا تھا "مولانا محمود الحسن یک کار را شروع کردند من او را پورا میکنم" یہ در اصل ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کا وعدہ تھا۔ انگریز اس کو کب برداشت کر سکتے تھے ۔ سازش کرکے امان اللہ خان کو سلطنت سے برخاست کر دیا ۔ اس مقام میں مولانا مدنیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی کے مشن کے جن حضرات کا ذکر کیا ہے ان میں سب سے پہلے مولانا عبید اللہ سندھیؒ (۲) حاجی ترنگ زئی صاحبؒ جو مولانا نجم الدینؒ کے خلیفہ اور وہ عبد الغفور صاحب سواتی کے خلیفہ تھے (۳) مولانا سیف الرحمٰن قندھاری افغانیؒ تلمیذ حضرت گنگوہیؒ (۴) مولانا منصور انصاریؒ مولانا عبد اللہ انصاری کے فرزند اور حضرت نانوتویؒ کے نواسے تھے (۵) مولانا سید عزیز گل کاکاخیل (۶) مولانا احمد اللہ پانی پتیؒ (۷) مولانا ظہور محمد خان سہارنپوری (۸) شیخ عبد الرحیم سندھیؒ (۹) مولانا ابو سراج غلام محمد دین پوریؒ (۱۰) مولانا ابو الحسن تاج محمود امروٹی (۱۱) مولانا محمد صادق کراچیؒ (۱۲) مولانا فضل ربی پشاوریؒ (۱۳) مولانا محمد اکبر یاغستانیؒ (۱۴) مولانا فضل محمود ضلع پشاورؒ (۱۵) عبد الغفار خانؒ (۱۶) ڈاکٹر انصاری (۱۷) مولانا محمد احمد چکوالیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خسر (۱۸) حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوریؒ (۱۹) مولانا محمد مبین خطیب جامع مسجد

دیوبندیؒ (۲۰) مولانا محمد ابراہیم راندیریؒ۔
یہ تمام حضرات تحریکِ آزادی کے اہم ترین ارکان تھے جن کے اجمالی حالات حضرت مدنیؒ نے تحریر فرما دیے ہیں۔

حضرت مدنیؒ کا ایک تعارفی مضمون

مولانا عبید اللہ سندھیؒ مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہوئے ہیں جس کی بناء پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت الامر کو شائع کر دیا جائے تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط و تفریط سے بچ جائیں اور جن باتوں کو مذکورہ ذیل معروضات کے خلاف دیکھیں۔ اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پُرزور اپیل ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات اور نصب العین کی قدر کرتے ہوئے، جوان کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تا دمِ مرگ ان کو ملک بہ ملک پھراتا رہا تھا۔ رائے قائم فرمائیں۔ مولانا عبید اللہ مرحوم ذکی الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی ابتداءِ عمر سے واقع ہوئے تھے۔ عنفوانِ شباب کی غلط کاریوں اور لغو بے معنی حرکات جو کہ اس زمانہ میں نوجوانوں میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ مرحوم میں ان کا وجود نہ تھا۔ ان کا تمام زمانہ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا۔ کتب بینی اور مشاغل علمی میں انہماک رکھتے تھے حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ العزیز ان کی ذکاوت علمی دلچسپی اور استقامت ہی کی بناء پر ان سے زیادہ مانوس رہتے تھے۔ ابتداء ہی سے ان کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے علماء رحمہم اللہ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔ مرحوم ان کی کتابوں اور رسائل کو بغور اور جد وجہد کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ تا ایں کہ اکثر مضامین ان کتب کے ان کو ازبر ہو گئے تھے۔ دار العلوم دیوبند میں کتابیں ختم کرنے کے بعد ان کا سندھ

کے علمی مراکز میں قیام رہا اور اس زمانہ کے وہاں کے اکابر سے تعلق شدید رہا۔ انہوں نے علم ظاہر کے مشاغل کے ساتھ تصوف کے مراحل میں بھی مدتوں دوڑ دھوپ اور تگ ودو جاری رکھی۔ جن کا اثر ان پر نمایاں ظاہر ہوتا تھا جن لوگوں نے ان کو ۱۳۲۶ھ اور اس کے مابعد کے زمانہ میں دیکھا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً" نہایت ساکت وصامت رہتے تھے۔ فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز اور مشاغل قلبیہ اور معارف علمیہ میں منہمک، عبادات اور اعمال صالح کے دلدادہ، بزرگان دین اور اکابر امت کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت مند اور متادب پائے جاتے تھے۔ ان کی ہر ہر حرکت اور سکون اور ہر ہر قول وعمل سے متانت اور رزانت ٹپکتی تھی قرآن پاک کی خدمت اور احادیث نبویہ اور کتب دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت وتعلیم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ ان پر زر ومال، جاہ وعزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے اور جاہ دنیاوی اور عزت فی الخلق کو لاشیئ محض خیال کرتے تھے۔ امرا اور اہل دولت سے ان کو وابستگی تو درکنار نفرت تامہ تھی۔ غربا، اور فقرا، طلبہ اور اہل اللہ سے ان کو انس عظیم تھا۔ دن رات اسی اصلاح عقائد واعمال کی ترقی کی فکر اور امت مسلمہ کی مغربی زہر آلودہ تعلیم اور الحاد وبے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت مشغلہ اور نصب العین تھا۔ اسی نصب العین کے ماتحت دارالعلوم کی ترقی کے لیے وہ سندھ سے دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے انہوں نے جمعیۃ الانصار قائم کی اور اسی کے لیے انہوں نے دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآن کی بنا ڈالی۔ اس زمانہ میں ان کا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا اسی نصب العین کے زیر سایہ رہتا تھا، مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگ طرابلس اور بلقان کی روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے۔ جنہوں نے سابقہ جنگ روم اور روس اور جنگ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کے غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت

زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں اور بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے غیرت مند دل میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر باغیرت مسلمانوں نے اسی تاثیر قوی کے ماتحت ہلالِ احمر کے لیے چندہ کی تحریک کی جس پر مسلمانانِ ہند نے عموماً لبیک کہا۔ مگر اس پر باخبر حلقوں اور سمجھدار طبقوں میں اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور نہ قلق و اضطراب میں کوئی کمی ہوئی۔ ادھر مضامین الہلال نے جو اس زمانہ میں نہایت پُر زور اور پُر اثر تحریر کے ساتھ شائع ہوتے تھے، یقین دلا دیا کہ برطانوی سامراج نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے، بلکہ اس کو عالم وجود سے بھی مٹا دینا چاہتا ہے۔ اس لیے بجز آزادی ہندوستان کوئی صورت ممالک اسلامیہ کی امداد اور خود مسلمانانِ ہند بلکہ تمام اہلِ ہند کی مشکلات کے حل ہونے کی نہیں ہو سکتی۔ انہی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سرشار ہو رہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کر دیں اور مجبور کر دیا کہ خود بھی سربکف ہو کر آزادی کے میدان میں کود یں اور دوسروں کو بھی کودائیں۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ صاحب کو بیدار کرتے ہوئے اس قدر متاثر کیا کہ مولانا عبیداللہ صاحب اپنے سابق نصب العین سے تقریباً ہٹ گئے اور آزادئ ممالک اسلامیہ بالخصوص آزادئ ہند ان کا نصب العین ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں اب ان کی زندگی اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، سوچ و بچار صرف آزادئ ہندوستان اور آزادئ ممالک اسلامیہ ہو گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جنگ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہی بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں، چنانچہ اپنی اپنی بساط کے موافق تگ و دو کرنے لگے، بالآخر اسی تاثیر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ جذبۂ آزادی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور اس قدر اس میں غلو ہو گیا کہ اگر اس کو جنون کا درجہ دیا جائے، تو یہ بے جا نہ ہو گا۔ افکار تھے تو ان

کے، زبان پر ذکر تھا تو اس کا، تدبیریں تھیں تو دن رات اسی کی، اعمال تھے تو اسی کے، کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیب اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمع کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیب اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شمعوں کو بجھا دیا اور ان کی حسرت ویاس کی کوئی حد باقی نہ رہی، تاہم چونکہ فطرت نے ان کو لوہے کا قلب اور نہ تھکنے والا دماغ دیا تھا۔ وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ شدید مایوسی بھی ان کے اعضاء کو بے کار نہ کر سکی۔ جب امیر امان اللہ سریر آرائے سلطنت ہو گئے۔ تو موصوف نے اپنی جدوجہد کا مرکز ان کی ذات ستودہ صفات کو قرار دیا۔ افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی سکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا، چنانچہ ایک مشہور جنگی انگریز قسم کا قول ہے کہ "یہ کامیابی افغانستان کی نہیں ہے، بلکہ عبید اللہ کی فتح ہے"۔ یقیناً جو سکیم جنگ کی تیار کی تھی۔ وہ اگر بروئے کار آجاتی اور خیانتیں نہ ہوتیں، تو عظیم الشان کامیابی ہو جاتی، مگر مشرقی کمان کی خیانت نے تمام کی کرائی محنت تقریباً برباد کر دی۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔ یہ دوسرا سخت صدمہ تھا جو کہ مولانا عبید اللہ صاحب کے بے چین اور مضطرب کو مشرقی کمان کی شکست اور خیانت سے لگا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کی سرگرمیاں اور ان کی ذہنی رسائی اور اعلیٰ درجہ کی سکیمیں ایسی نہ تھیں کہ وہ برطانوی لوگوں کو ان کی طرف سے مطمئن رکھتیں۔ بالآخر ان کو کابل بلکہ افغانستان سے نکل جانا پڑا۔ حالانکہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کی جا چکی تھی۔ یہ تیسرا دھکا تھا جس کا صدمہ ان کے قلب اور دماغ کو اٹھانا پڑا۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں ترکی حکومت کو شکست اور عراق، شام، فلسطین، حجاز، یمن اور نجد وغیرہ کا خلافتِ اسلامیہ سے جدا ہو جانا اور صلیبی اقتدار کے ماتحت آجانا کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس نے ہر مسلمان کے قلب پر نہایت زہریلے سانپ لوٹا دیے۔ بالخصوص اصحاب حمیت اور باغیرت مسلمانوں

کو تو انتہائی تکلیف پیش آئی۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کے قلب و دماغ پر اس کا جو کچھ اثر ہوا۔ وہ سوائے خداوند کریم کے کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ وہ چوتھا عظیم صدمہ تھا جسے ان کے قلب اور دماغ کو برداشت کرنا پڑا۔ مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول، وغیرہ پہنچے اور سالہا سال ان سخت سے سخت سرد اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ اعزاد اقربا ساتھ نہ تھے، یار اور احباب، ہمدردی کرنے والے موجود نہ تھے۔ مال و متاع جس سے غربت اور مسافرت کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ موجود نہ تھا۔ نیز خبر گیری اور امداد کی جھلک بھی نہ تھی۔ استاد مرحوم (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) جن کا سہارا ظاہری شمار کیا جا سکتا تھا۔ مالٹا میں قید تھے۔ پے درپے مہینوں فاقے کرنے پڑے میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ برف کے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکلیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کس پرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم صدمات اور جانگداز احوال میں مولانا کا زندہ واپس آ جانا قدرت کے عجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے۔ وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلی ہیں، مگر مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں۔ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائب عظیمہ غیر تناہیہ نے اگرچہ مولانا مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی۔ تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر و تحمل، حلم و بردباری استقلال اور گراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر، غور اور جرأت طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامین عالیہ اور سیاسیات مدینہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے۔ وہ تقریباً کافور ہو گئے۔ مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز پہنچے اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف

حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، حلم بردباری، وہ سکون و سکوت جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے۔ سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے، باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد امور وطرز ہوتے ہیں۔ ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان متضاد اموریں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا جس کی بنا پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے اور کیوں نہ ہو، جو ناساز احوال اور گوناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے۔ ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوتے۔ ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شئون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے، چنانچہ یہ دماغی اختلال نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستان پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس پوزیشن اور رتبہ کو مولانا مرحوم کے لیے حاصل نہ ہونے دیا جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ مولانا کا کلام ان کی شدت ذکاوت اور مہارت علمی کی بنا پر پہلے بھی بہت زیادہ دقیق ہوتا تھا جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم و فہم کو بھی غیر معمولی غور و فکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے قابل اور غیر معمولی دماغ اس آخری دور میں بھی جب کہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا۔ برس ہا برس کی جد و جہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر ایسے سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے جو اہلِ فکر کے لیے دعوت فکر و نظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحابِ فہم حضرات اصولی طور پہ پرکھ کر صحیح نتائج

کا استخراج کر سکتے ہیں، مگر اب اس حادثہ کی بنا پر اور بھی زیادہ الجھنیں پیدا ہونے لگیں، چنانچہ مشاہدہ ہے۔ بنا بریں تمام اہل فہم اور اربابِ قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ اور ضروریاتِ دین اور عقائد واعمال اہل سنت والجماعت کے زرّین قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں اور علیٰ ہذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابر دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ اس کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضرات اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں یا اصول سے سلف صالحین اور ان کے اصول وقوانین مسلمہ اہل سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں اور اس کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں واللہ الموفق ربنا ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه (آمین)

یہ مضمون حضرت مدنیؒ کا صرف حضرت سندھیؒ کا تعارف ہی نہیں بلکہ یہ ایک آئیڈیل (IDEAL) مضمون ہے جس سے حضرت سندھیؒ کے مسلک اور رجحانات سیاسیہ کا پوری طرح وضوح ہو جاتا ہے۔ یہ تنقید بھی نہیں ہے، کیونکہ مدنیؒ مولانا سندھیؒ پر تنقید نہیں کرتے، بلکہ یہ مولانا سندھیؒ کی بعض ان باتوں کی صفائی ہے جو عوام کے لیے یا ناواقف حال لوگوں کے لیے باعثِ تشویش ہو سکتی ہیں یا شکوک وشبہات کو ابھارتی ہیں۔ کیونکہ حضرت سندھیؒ کا مسلک وہی ہے جو اکابر واسلاف کا ہے۔ ان کا ذہن، فکر، عمل، اخلاق، سب وہی ہے جو اکابر وسلف کا ہے۔ ان کے نظریات خواہ وہ سیاسی ہوں اقتصادی یا معاشی ہوں یا سائنسی ٹیکنالوجی، فلسفہ حکمت خواہ وہ مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتے ہوں یا صنعت وحرفت اور اجتماعی زندگی

کے بارہ میں ہوں، وہ سب امام ولی اللہ اور ان کے خاندان کے بزرگوں اور علمائے دیوبند کے اکابر حضرت نانوتویؒ، گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور حاجی امداد اللہؒ کے جو نظریات ہیں وہی حضرت سندھیؒ کے ہیں۔ اگر کوئی چیز ان کے خلاف ہے تو وہ شاذ ہے اور وہ از قسم توضیحات و تشریحات یا تفہیمات کے سلسلہ کی چیز ہے نہ کہ عقیدہ و مسلک کی چیز جیسا کہ امام ولی اللہؒ نے اس بارہ میں حجۃ اللہ البالغہ میں اس حقیقت کو اس طرح واضح فرمایا ہے:"

وھانا بریٔ من کل	آگاہ رہو کہ میں بری اور بیزار
مقالۃ صدرت مخالفۃ	ہوں ہر ایسی بات سے جو اللہ تعالیٰ
لاٰیۃ من کتاب اللہ	کی کتاب کی کسی آیت کے خلاف
او سنۃ قائمۃ عن	ہو یا سنت قائمہ کے خلاف ہو جو
رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
علیہ وسلم او اجماع	ثابت ہے یا ان زمانوں کے علماء
القرون المشہور لھا	کے اجماع اور متفق علیہ خیالات
بالخیر او ما اختارہ جمہور	کے خلاف ہو جن کی خبر دی گئی ہے اور
المجتہدین، ومعظم	مسلمانوں کی سواد اعظم یا جس کو جمہور
سواد المسلمین، فان	مجتہدین نے اختیار کیا ہو، اگر اس قسم
وقع شیئ من ذالک	کی کوئی چیز میری تصانیف و تحریرات
فانہ خطاء رحم اللہ	وغیرہ میں آگئی ہو تو وہ غلط ہی قرار
من ایقظنا من سِنَتِنا	دی جائے گی۔ اللہ رحم فرمائے اس
او نبّھنا من غفلتنا	پر جو ہم کو ہماری اس کوتاہی سے
(حجۃ اللہ البالغہ ص ۹)	بیدار کرے گا۔

لہ کے بارے میں بہتر ہی

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا معیار ہے جس کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور گمراہیوں سے بچنے کا یہی طریق ہے۔ اسی اصول پر خود حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض شذوذ کو ترک کیا گیا ہے اور بڑے بڑے علماء مجتہدین اصحاب بصیرت کی آراء شاذہ کو رد کر دیا گیا ہے۔ ابن ہمامؒ ابن تیمیہؒ مولانا نانوتویؒ اور گذشتہ ادوار کے تمام عبقری اور نابغہ حضرات کی آراء شاذہ کو مذہب و مسلک نہیں بنایا گیا۔ ان آراء سے صرف علمی تحقیقی طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بہت سی باتیں ہمارے خیال میں آتی رہتی ہیں، لیکن جب نظر کرتے ہیں تو ان کو بطور عقیدہ و مسلک نہیں اختیار کرتے۔ ہم کہتے ہیں کہ مسلک وہی ہے جو جمہور علماء و مجتہدین کرام نے اختیار کیا ہے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ

(از عبدالرحمٰن کوندو)

حضرت مولانا شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ پہلی عالمگیر جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے زمانہ میں اس تمنا سے بے تاب ہو رہے تھے کہ انجام کار یہ ہنگامہ کوئی ایسی شکل اختیار کر جائے جس کے نتیجے میں ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک انگریزی امپریل ازم سے نجات حاصل کر لیں اور ہندوستان کی چھینی ہوئی آزادی و خودمختاری ایک بار پھر واپس مل جائے۔ ۱۹۱۴ء سے ہی آپ نے ارادہ کیا کہ آپ عالمگیر جنگ کے نتائج سے آزادئ ہند کا مقصد حاصل کرنے کی کوئی سبیل نکالیں۔ اس سلسلہ میں چونکہ انگریزوں کے خلاف شریک جنگ طاقتوں خاص کر ترکی اور جرمنی سے رابطہ پیدا کرنا ضروری تھا جس کے ذرائع مفقود تھے

اس لیے آپ کی نظر کابل کی طرف اٹھنے لگی اور آپ کے ذہن میں یہ تجویز پرورش پانے لگی کہ اگر ایک طرف افغانستان کو انگریزوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر لیا جائے اور دوسری طرف صوبہ سرحد کے آزاد قبائلی علاقوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے بچے ہوئے مجاہدین کے ذریعے صوبہ سرحد کے عوام اور نیم آزاد جنگ جو قبائل کو آمادۂ جہاد کر لیا جائے تو شاید جس وقت انگریز پر اتحادیوں کا دباؤ بڑھ رہا ہو، اس وقت ہندوستان کے شمال مغرب کی طرف سے ایک اچھا سا بھرپور حملہ ہندوستان کو برطانوی امپیریل ازم کے پنجے سے چھڑا لینے میں کارگر ثابت ہو سکے گا۔ حصول آزادی کا یہی منصوبہ تھا جس کو بروئے کار لانے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو کابل، مولانا منصور انصاریؒ کو قبائلی علاقوں میں بھیجا اور ترکی حکومت سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کے لیے حرمین و حجاز کا سفر کیا اور دارالعلوم کی تعلیمات کی صدارت کا کام جو آپ کا اوّلین اور دوامی فریضہ تھا۔ اس کے لیے اس موقع پر آپ کی نظرِ انتخاب اپنے تلمیذِ خاص اور محرمِ اسرار مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ پر پڑی، جن کو آپ اپنے علوم اور فیضان کا خازن بنا چکے تھے اور جو آپ کی تدریسی خصوصیات کو فنافی الشیخ کی حد تک اپنے سینے میں سمیٹ چکے تھے[1]

اس پس منظر کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض یافتہ علماء میں سے نہایت ممتاز اور غیر معمولی

---

[1] مولانا سندھیؒ خود بھی حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے بارہ میں بڑی اونچی رائے رکھتے تھے، مولانا عبدالعزیز محدثؒ آف گوجرانوالہ (جو خود بھی مولانا شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے) فرماتے تھے کہ مولانا انور شاہؒ ہمارے دور کے بے نظیر عالم ہیں۔ اگر کوئی اس پر قسم اٹھائے تو حانث نہیں ہوگا۔ (سواتی)

دل و دماغ رکھنے والی دو شخصیتیں تھیں اور دونوں کے فطری رجحانات کو دیکھتے ہوئے مُشفق استاذ نے دونوں کو دو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لیے تربیت دے کر تیار کیا تھا۔ جہاں مولانا سندھیؒ کے انقلابی ذوق و شوق کو دیکھ کر انہیں سیاسی انقلاب کے میدان کا شہسوار بنا دیا تھا۔ وہاں شاہ صاحب کے مخصوص رجحانات کو پیشِ نظر رکھ کر انہیں تدریسی و تعلیمی مرشد و مربی بننے کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ وہلی کے امینیہ اور بارہمولہ کے فیضِ عام کے تجربوں کے بعد دارالعلوم دیوبند میں اونچے درجہ کے مدرسین میں شامل کر کے ان کی بے نظیر قابلیتوں کو جانچ لیا تھا اور دارالعلوم میں اب اپنی جانشینی کے قابل بنانے کے لیے ان میں علم و عمل کے شعلے اس حد تک فروزاں کر دیے تھے کہ جب استاذ نے اس شاگرد کو نازک وقت میں اپنی مسند حوالہ کر دی تو کسی کو اس پر حیرت نہ ہوئی۔ اس طرح حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا سندھیؒ اگرچہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں تھے مگر اپنے مربی کی سکیم کے مطابق اپنے پھول اور پھل کے لحاظ سے دو مختلف قسم کی ہستیاں بن کر تیار ہو گئے تھے۔ چونکہ دونوں بے حد ذہین تھے۔ اس لیے طالب علمی کے زمانہ میں بھی اور فراغت کے بعد بھی دونوں کے درمیان ذہنی قرب تھا۔ ان کی ملکوتی فطرت کی وجہ سے دنیا سے بے نیازی اور بلند مقاصد کے لیے ہمہ تن فدائیت و محویت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے بحصّہ وافر نصیب ہوئی تھی۔ متاہل زندگی سے آزاد رہ کر مقاصد عالیہ کے لیے ہمہ تن وقف ہو جانا بھی ایک ایسا مشترک وصف تھا جو دونوں نے اپنا رکھا تھا (مولانا سندھیؒ کو آخر عمر تک بے خانگی اور تجرد[1] پر کاربند رہے)، البتہ حضرت شاہ صاحبؒ آگے چل کر اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر تجرّد سے اس وقت دستبردار ہوئے جب آپ کی عمر قریباً ۴۴ سال

---

[1] یہ بات درست نہیں اس لیے کہ مولانا سندھیؒ آخری عمر تک تجرد پہ کاربند نہیں رہے۔
بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

کو پہنچ چکی تھی) یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان دونوں فاضل ہستیوں کے درمیان اونچے درجے کے مسائل کبھی کبھی زیر بحث آ جائیں اور کہیں کہیں رائے کا اختلاف بھی ہو جائے اور ایسا ہو ہی جایا کرتا تھا۔ خاص کر مابعد الطبیعات کی دنیا کے مسائل کی فلسفیانہ موشگافیوں میں کبھی دونوں کے درمیان بحث و تکرار کا سلسلہ ہوتا تھا آخر ایسے دو بڑے عبقری عالموں سے یہ توقع کون رکھ سکتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر ہر نکتے میں ایک دوسرے سے متفق رہیں گے۔ بتایا جاتا ہے کہ دونوں کے درمیان اس قسم علمی مباحثات کے دوران کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ کش مکش ہو جاتی تھی جو بحث و مباحثہ میں ایک فطری بات ہے مگر مخلصین بحث کے بعد ہمیشہ اس قسم کی تیزی کے لیے ایک دوسرے سے معافی خواہ ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن جب ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھیؒ ناگاہ کابل چلے گئے، تو اغلباً جاتے وقت آپ شاہ صاحبؒ سے مل بھی نہ پائے اور شاہ صاحبؒ کو یہ خیال ستانے لگا کہ اگر اس طویل جدائی کے وقت باہمی درشت کلامی کی، ایک دوسرے سے معافی مانگ لی ہوتی جو بحث و مباحثہ کے دوران سرزد ہو جایا کرتی تھی، تو یہ امر متقین کے شیوۂ کریمانہ کے مطابق رہتا۔ برسوں تک یہ احساس حضرت شاہ صاحبؒ کے قلب نازک کے لیے بے چینی کا موجب رہا۔ اس مدّت میں مولانا سندھیؒ کابل سے واپس آ جانے کے

بلکہ مولانا سندھیؒ نے دو مرتبہ نکاح مسنون کیا، پہلی دفعہ شیخ حبیب اللہ مرحوم (والد ماجد مولانا احمد علی لاہوریؒ) کی بیوہ سے نکاح کیا تھا، اس سے مولانا سندھیؒ کا ایک لڑکا بھی ہوا تھا، لیکن وہ بچپن میں ہی فوت ہو گیا تھا، دوسری دفعہ مولانا سندھیؒ کا نکاح سکھر کے ایک بزرگ ماسٹر محمد عظیم خان یوسف زئی کی دختر سے ہوا، جو مولانا امروٹیؒ کی کوشش سے ہوا تھا، اس سے مولانا کی ایک بچی بھی ہوئی، مولانا کی وہ دوسری بیوی جب وہ کابل میں تھے فوت ہو گئی تھی اور اس بیٹی کا نکاح مولانا غلام محمد دین پوریؒ سے ہوا جس سے مولانا ظہیر الحق دین پوری ہوئے۔ (سواتی)

بدلے اور بھی آگے دور تک بڑھتے ہی چلے گئے۔ کبھی ماسکو اور لینن گراڈ میں، کبھی برلن میں، اور کبھی قسطنطنیہ اور انگورہ میں جہاں تک چٹھی پہنچنے کے امکانات بھی کالعدم ہو گئے تھے۔ اسی دوران مولانا سندھیؒ کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا، جب آپ آزادیٔ وطن کے عشق میں بے تابی اور اضطراب سے اس مرض کے نئے نئے علاج سوچتے ہوئے مارکس ازم کو بھی ہندوستان کی مشکلات کا حل اور غلامی کی بیڑیوں سے نجات کا ایک راستہ سمجھ کر اس پر غور کرنے لگے، لیکن چونکہ آپ کے ذہن کی ساخت وہ تھی جس کی آبیاری حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن وسنت کے آبِ حیات سے کی تھی اور جس کا سانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے خمیر سے بنایا گیا تھا اس لیے آپ لاملوکی ولاکلیسا کی حد تک تو مارکسزم کو مفید سمجھنے پر آمادہ ہو سکتے تھے، لیکن مارکس ازم کے تیسرے "لاء" یعنی لَا اِلٰہ کو کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتے تھے اور اِلَّا اللہ سے دستبرداری آپ کے لیے ناممکناتِ حیات میں تھی، اس لیے آخرکار مارکس ازم کو ایک طرف رکھ کر آپ نے نہ صرف ہندوستانی عوام کی، بلکہ دنیا بھر کے بنی نوع انسان کی تمام قسم کی غلامیوں کی نجات کو "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ" میں تلاش کرنا شروع کیا اور اس مقصد کے لیے جب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفۂ انقلاب کو اٹھا کر سامنے رکھا تو آپ کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ کو محسوس ہوا کہ جس چیز کو میں زمانۂ جدید کی نعرہ بازیوں میں تلاش کر رہا تھا وہ اپنے ہی خزانے میں موجود ہے۔ چنانچہ آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تمام تصانیف بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات وفیوض الحرمین وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا اور لینن کے روس اور کمال اتاترک کے ترکی کو پس پشت پھینک کر آپ واپس آکر مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے اور ولی اللّٰہی فلسفۂ انقلاب پر تحقیقات کرنا شروع کر دی۔ اس نئے مطالعہ کے بعد آپ نے سیاست کے کچھ جدید نظریات مرتب کیے جن کی تفصیلات میں جانا اس

وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے
کہ جس زمانے میں مولانا سندھیؒ مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ولی اللٰہی نظریات پر مبنی انقلاب
کے پروگرام کی نوک پلک درست کر رہے تھے اور ابھی ہندوستان میں آپ کی واپسی پر
پابندیاں عائد تھیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے آنے جانے والے حاجیوں کے ذریعے
آپ کے ساتھ رابطہ پیدا کیا اور پہلی فرصت میں خط لکھ کر مولانا سندھیؒ کے ساتھ سینہ صفائی
کی اور ان سے معذرت طلب کی۔ واقعی یہ احتیاط اور یہ حوصلہ حضرت شاہ صاحب جیسے
عالمِ ربانی اور محدثِ بے نظیر کو ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا سیّد حسین احمد
مدنیؒ اپنی خود نوشت "سوانح عمری" "نقشِ حیات" جلد دوم ص ۲۴۴ کے حاشیہ پر یوں
رقمطراز ہیں۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ مرحوم نے مولانا سندھیؒ کے نام مکہ معظمہ
کے قیام کے زمانہ میں پیغام بھیجا تھا کہ "قیامِ دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے
میں آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ کے لیے کوئی رنج نہیں
ہے۔ امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے"۔ ممکن ہے حضرت شاہ صاحبؒ اور
مولانا سندھیؒ کی یہ مراسلت اور بھی آگے بڑھی ہو، لیکن اس کی تفصیلات ہمیں معلوم
نہیں ہیں۔ بہر حال مولانا سندھیؒ نے قریباً بارہ سال مکہ مکرمہ میں گزارے اور وطن کی واپسی
پر اگر وہ شاہ صاحبؒ کو بقیدِ حیات پاتے تو نہ جانے دونوں کے تعاون سے ملت کی
کتنی امنگیں پوری ہوتیں۔ ۲۵ سال کی طویل جلاوطنی کے بعد مولانا سندھیؒ ۱۹۳۹ء میں
ہندوستان واپس تشریف لائے، تو دیوبند کی مجالسِ علمیہ میں اور دوسرے مواقع پر ہمیشہ
نہایت وقیع الفاظ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ذکر فرماتے تھے اور حضرت موصوف کے
متعلقین کے ساتھ بھی اپنے گہرے اور مشفقانہ تعلق کا اظہار بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت
شاہ صاحبؒ کے بڑے فرزند مولانا ازہر شاہ صاحب اپنی کتاب "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ"
میں تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۹ء میں جب مولانا (سندھیؒ) کی واپسی کی تحریک اٹھی تو

دیوبند مولانا سے اپنے قدیم تعلقات کی بنا پر خاص طور پر اپنے اس گم شدہ فرزند کی بازیابی کا خواہش مند تھا اور ہم سب کی خواہش تھی کہ جس مردِ مجاہد کے عزم و حوصلہ کی بہت سی داستانیں ہم نے اپنے ماحول میں سُنی ہیں، اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں، آخر ایک دن شام کو معلوم ہوا کہ مولانا دہلی سے بغیر کسی اطلاع کے دیوبند پہنچے اور لوگوں نے انہیں اس حالت میں پایا کہ وہ اسٹیشن سے مدرسہ میں پہنچ کر مدرسہ کی مسجد میں شکرانہ کی دو نفلیں پڑھ رہے تھے۔ دیوبند میں آنے کی اطلاع آپ نے پہلے اس لیے نہیں دی تھی کیونکہ یہاں وہ اپنے استقبال اور شان و شوکت کو پسند نہیں فرماتے تھے، دوسرے دن مولانا صبح کے وقت راقم الحروف کے گھر پر تشریف لائے (میں نے) دیکھا کہ ایک بوڑھا انسان سب سے آگے ہے اور اس کے پیچھے پچاس ساٹھ آدمیوں کا ہجوم ہے۔ میں نے مولانا کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے پہچان نہیں سکا، مولانا نے میری حیرت کو ختم کرنے کے لیے پیش قدمی فرمائی اور ارشاد ہوا "عبید اللہ سندھیؒ" اور پھر مجھے سینہ سے لگایا پیشانی پر بوسہ دیا، مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ میرے رفیقِ درس اور رفیقِ فکر مولانا انور شاہ صاحب کاشمیریؒ کی نشانی ہیں۔ میری والدۂ محترمہ مولانا سے اس وقت سے نیاز رکھتی تھیں۔ جب مولانا دیوبند تشریف فرماتے تھے، والدہ نے چائے کا انتظام کیا، چائے کے وقت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور کئی اور بزرگ بھی موجود تھے۔ مولانا بڑی بے تکلفی اور سادگی سے چائے پیتے جاتے تھے، اسی مجلس میں انہوں نے بڑی شفقت سے مجھ سے فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں اردو کے ایک رسالہ میں تمہارا مضمون ہم نے پڑھا تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمہیں کام کرنے کے ڈھنگ بتا دیں گے۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت یہ جھگڑا میرے بس کا نہیں، آپ خانہ بدوش آدمی ہیں۔ ۲۵ سال کے بعد اب گھر واپس آئے ہیں، کابل، روس، ترکی اور حجاز کی زمین ناپتے رہے۔ فقر و فاقہ میں آپ کی بسر ہوتی ہے اپنا عیش و عشرت و آرام آپ نے تج دیا ہے، میں غریب ان مصیبتوں کو جھیلنے کے لیے

حوصلہ کہاں سے لاؤں گا، مولانا اس پر ہنس دیئے۔ اللہ اللہ! عجیب لوگ تھے جو خود کو مٹا کر قوم کو بنا گئے، جنہوں نے اپنی ساری زندگی، زندگی کی ساری راحتیں زندگی کے سارے ولولے زندگی کا سارا عیش اپنے مقصد پر قربان کر دیا۔

حضرت مولانا سندھیؒ کا معرکۃ الآرا خطاب

۲۴ سالہ جلاوطنی کے بعد مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تاریخی خطاب

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کیا تو اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور یہاں کے جلیل القدر راہنما مجبور ہو گئے کہ وہ ترکی کو بچانے کے لیے جو کچھ بھی ان سے ہو سکے کر گزریں اسی موقع پر حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کسی نہ کسی طرح بچ بچا کر ہندوستان سے کابل پہنچے۔ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔ اس کے پورے ۲۴ برس بعد ۱۹۳۹ء میں مختلف ممالک سے ہوتے ہوئے (آخر میں مکہ مکرمہ سے) حضرت مولانا مرحوم وطن واپس لوٹے اور آ کر اپنے اہلِ وطن کو یہ پیغام دیا کہ محض وطن اور خاندان کی محبت مجھے اس عمر میں ہندوستان کھینچ کر نہیں لائی۔ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں زندگی کے معلوم نہیں کتنے دن اور ہیں مجھے اگر آرام اور سکون کی خواہش ہوتی تو عمر کے یہ آخری دن حرم پاک ہی میں اطمینان سے گزارتا اور اس مقدس سرزمین میں سپردِ خاک ہونا پسند کرتا۔ میں اس بڑھاپے میں اور اس قدر ضعف اور کمزوری کے باوجود آپ لوگوں کے پاس اس لیے پہنچا ہوں کیونکہ آپ سے کچھ کہنا ہے۔" آپ کے بزرگوں نے مجھے باہر بھیجا تھا۔ باہر رہ کر جو کچھ بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکتا تھا۔ میں نے کی۔ اسی اثناء میں میں نے بہت کچھ دیکھا اور عجیب عجیب حالات سے مجھے گزرنا پڑا۔ میں جو

کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں اُسے غور سے سنو۔ میں نے اپنی زندگی کے چوبیس برس ہندوستان سے باہر گزارے ہیں۔ اس طویل مدت میں میں نے محض ملکوں کی سیاحت نہیں کی اور چیزوں کو صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا، بلکہ بڑی بڑی مہموں میں خود شریک رہا ہوں۔ اس جدوجہد میں کبھی اپنے ارادوں میں کامیاب رہا، تو اکثر بڑی تلخ اور جانگداز ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ مجھے سلاطین اسلام کے مشوروں میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا اور میں ان سپہ سالاروں کا رفیق بھی رہا جو بڑی بڑی سلطنتوں کے رکنِ رکین تھے اور جن کے ہاتھوں دنیا کے عظیم الشان معرکے سر ہوئے۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے علاوہ میں جس ملک میں گیا اور جہاں بھی رہا۔ میں نے وہاں کی ہر چیز آنکھوں کر دیکھی۔ میں نے ان ملکوں کی پچھلی تاریخ کا مطالعہ بھی کیا اور وہاں کے رہنے والوں کے موجودہ حالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ میرا یہ مطالعہ سرسری نہیں اور میری باتوں کو تم وقتی تاثرات اور عارضی ہیجانات کا نتیجہ نہ سمجھنا میرے پیچھے تجربات اور مشاہدات کی ایک وسیع دنیا ہے اور میں نے اقوام کی تاریخ کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میرے حالات مجھ سے کرید کرید کر پوچھو اور میرے نتائج کو توجہ سے سنو اور ان پر غور کرو۔ میں کوئی بات تم سے چھپانا نہیں چاہتا۔ میرا علم، میرا مطالعہ، میرے تجربات اور میرے افکار وقفِ عام ہیں۔ میری آنکھوں نے زندگی کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میرے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہوئیں، بادشاہ، سپہ سالار اور امراء بُری طرح قتل کیے گئے۔ وہ طبقے جو علم و حکمت اور عزت و دولت کے نشے میں ذہنی مسرتوں اور جسمانی آسودگیوں میں مست تھے۔ زمانے کی ایک ٹھوکر میں ذلت کے عمیق گڑھوں میں گرتے ہوئے نظر آئے، نہ کوئی ان کے علم کا قدر دان رہا اور نہ ان کی عزت کا پرسانِ حال، میں نے پرانے تمدنوں کی بنیادوں کو اپنی نظروں سے کھدتے دیکھا اور وہ نظامِ فکر جن کو ان کے ماننے والے لازوال جانتے تھے اور ان میں ایک ذراسی تبدیلی ان پر گراں گزرتی تھی۔ میں نے ان نظاموں کے محترم و معتدر

علمبرداروں کو اپنے وطنوں سے دور محرومی و بےکسی میں دربدر خاک چھانتے دیکھا ہے۔ میں نے انسانی نسلوں کو فنا ہوتے، بستیوں کو اجڑتے، تمدنوں کو مٹتے اور مذہب اور اہل مذہب کو بڑی سفاکی سے کچلے جاتے دیکھا ہے، خدا جانتا ہے کہ وہ چیزیں جو مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں اور جن کے لیے میں نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا ہے ان چیزوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتے دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہوا اور ان دردناک مناظر سے میرے دل و دماغ پر کیا گزری۔ بہرحال خدا تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس قدر کرب اور اتنی اذیت جھیلنے کے بعد بھی میرے ہوش و حواس بجا رہے۔ میں نے زندگی کے ان انقلابات کو برابر دیکھا، اور ان پر غور و خوض بھی کرتا رہا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ جلاوطنی کے آخری ایام میں توفیقِ الٰہی مجھے دیارِ حرم میں لے آئی اور وہاں میں تقریباً ۱۲ سال تک رہا۔ اس طویل مدت میں مجھے اپنے تجربات، تاثرات اور جو کچھ اس وقت تک دیکھا، پڑھا اور سُنا تھا۔ ان پر یکسوئی سے غور کرنے کا موقع ملا۔ آپ لوگ یقین کریں کہ جہاں تک میری عقل اور سمجھ کی پہنچ تھی۔ میں نے اپنے افکار کو اس طویل مدت میں خوب جانچا، پرکھا اور ان کے حسن و قبح میں تمیز کی۔ میں نے اپنے افکار کو جتنی بھی تاریخ میں جانتا تھا، اس کی کسوٹی پر کسا۔ خود اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی صوابدید کی اور جو کچھ علمِ دین، حکمت اور تقویٰ مجھے میسّر تھا اور اپنے مرشدوں اور استاذوں کے فیض سے جو بھی بصیرت عطا ہوئی تھی۔ اپنے افکار کو ان کے روبرو پیش کر کے اپنے نفس کا بھی محاسبہ کیا اور ان کے افکار کا بھی پورا پورا جائزہ لیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جسے ہندوستان کے مسلمانوں کے اہلِ علم کا بہت بڑا طبقہ اپنا امام اور استاذ مانتا ہے۔ ان ایسے عظیم المرتبت عالم، حکیم، محدث مجتہد اور خداشناس بزرگ کے علم و حکمت کے ترازو میں اپنے افکار کو تولا، چنانچہ حرمِ اقدس کی برکتوں اور رحمتوں سے بھری ہوئی سرزمین میں ایک طویل عرصہ تک غور و تامل کرنے کے بعد جب مجھے اس بات

پر پورا اطمینان ہوگیا کہ جن افکار و خیالات اور طریق کار کی طرف میری جستجو نے میری راہنمائی
کی ہے۔ اس سے نہ تو خدانخواستہ میرے اسلام کو گزند پہنچے گا اور نہ میری قوم کو اس کی وجہ
سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے، بلکہ مجھے اس پر پورا یقین تھا کہ اگر میرے وطن والے ان ہی
راہوں پر چلتے رہے جن پر وہ اب تک چلتے رہے ہیں اور جس عالم بے خبری میں وہ اب
تک پڑے ہوئے ہیں، اسی عالم میں مست رہے تو نہ ان کا اسلام بچ سکے گا اور نہ ان کی قومی
حمیت اور ملی حیثیت برقرار رہ سکے گی۔ جب مجھے اس حقیقت پر پورا یقین حاصل ہوگیا
اور اس یقین نے کچھ کرنے اور فکر کو عمل میں لانے پر مجبور کر دیا، تو میں نے وطن واپس
آنے کا تہیہ کر لیا۔ یہ تک مجھے واپس وطن آنے کے لیے اپنے دشمنوں کے سامنے جھکنا
پڑا، لیکن میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اس اعترافِ شکست کے صدمے کو برداشت
کیا، کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو کبھی بھی آپ لوگوں سے آج یوں باتیں نہ کر سکتا، جو کچھ میرے
دل و دماغ میں تھا، اسے میں ایک سربستہ راز کی طرح اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا اور
آپ لوگوں کو ان حقائق سے آشنا نہ کر پاتا، جن تک خدا معلوم کیسی جسمانی مشقتوں، دماغی
کاوشوں اور جان کاہیوں کے بعد پہنچا تھا، جن میں میرے خیال میں آپ لوگوں کے لیے
دنیا و آخرت دونوں کی فلاح تھی۔ میں ایک عالمگیر انقلاب کے سیلاب کو اپنی آنکھوں
سے اٹھتا دیکھ آیا ہوں، انقلاب کے اس سیلاب نے کئی ایک ملکوں کو اپنی دار و گیر میں
لے لیا ہے اور جو ملک اب تک بچے ہوئے ہیں، وہ اس سیلاب کے ریلے سے زیادہ عرصہ
تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ یہ سیلاب موسمی جھکڑ نہیں کہ آیا اور نکل گیا۔ یہ عہدِ حاضر
کے تاریخی تقاضوں کا قدرتی نتیجہ ہے۔ انقلاب کا یہ سیلاب پیچھے ہٹنے والا نہیں، دیوار
چین ہو یا سدِ مارب، یہ سیلاب سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا، دنیا
ایک نئے طوفانِ نوح سے دوچار ہوا چاہتی ہے، بادل گھر چکے ہیں، گھٹائیں برسنے ہی
کو ہیں، طوفان کو اٹھتے اب زیادہ دیر نہیں لگے گی، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں نہ تو ان

طوفانوں کی خبر ہے اور نہ تم یہ جانتے ہو کہ اگر یہ طوفان بہہ نکلے، تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ تمہارے علماء ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اگر کبھی دیکھتے ہیں تو پس، کتابی، نظر سے وہ زندگی سے کٹ چکے ہیں۔ اس لیے جن علوم کو وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، ان علوم میں اس بنا پر نہ تو خود میں کوئی زندگی کی رمق باقی ہے اور نہ وہ علوم پڑھنے اور پڑھانے والوں میں زندگی کی حرارت و تڑپ پیدا کرتے ہیں، تمہارے سیاستدان، بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں، لیکن ان کی نظر خاص طبقوں سے آگے نہیں بڑھتی، وہ قوم اور وطن کا نام لیتے ہیں، مذہب اور کلچر کا زور دیتے ہیں، لیکن ان کی قوم وطن، مذہب اور کلچر کا تصور یا تو سرے سے موہوم ہے یا ان کا اطلاق ایک خاص طبقے کے اغراض اور مصالح پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ صرف اپنے آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ زمانہ ان کے اشاروں پر سدا حرکت کرتا رہے گا اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی طرف ہی تکتے رہیں گے

قوم کے متوسط طبقے ہیں کہ وہ روزمرہ کی مادی ضرورتوں اور رسمی مذہب کے چند معمولات کے سوا جن سے انہیں تھوڑا بہت اطمینان مل جاتا ہے کسی اور چیز سے واسطہ نہیں رکھتے، باقی رہے عوام، قوم کا غالب حصّہ قوم کے جسم کے ہاتھ اور پاؤں ان کو تم نے، عوام کالانعام کہہ کر صدیوں سے چارپایوں کے درجہ پر رکھ چھوڑا ہے تم نے اپنی ایک محدود دنیا بنا رکھی ہے۔ اس دنیا میں تم شاداں و فرحاں ہو، اور کسی اور طبقے قوم اور فکر اور خیال کو خاطر میں نہیں لاتے، تمہیں ساون کے اندھے کی طرح خیر سے اپنے اہلِ علم، مجدّدِ دین، اور اصحابِ امراء کے طفیل ہر طرف خزاں میں بھی ہریاول ہی ہریاول نظر آتی ہے۔ بہار کا عہد کبھی کا گزر چکا، تم خوش اعتقادی میں اپنے ہاں اب تک بہار ہی کا عمل دخل دیکھ رہے ہو، دنیا میں زلزلے آرہے ہیں، لیکن تم گھروں کے اندر آنکھیں بند کیے پڑے ہو، زندگی کی قہرمانی قوتیں اپنی پوری شدت میں انسانیت کے بطن سے

کوہِ آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلی ہیں، ان کے ہاتھوں پرانی دنیا جو کچھ بھی گزرے کم ہے۔ جس آنے والے انقلاب کی میں تمہیں خبر دے رہا ہوں۔ میں یورپ کے ایک بڑے حصّے میں اس انقلاب کو بروئے کار آتا دیکھ آیا ہوں، اس انقلاب نے اس سرزمین کی جس طرح کایا پلٹ کی اور غالب گروہ نے جس سفاکی سے اپنے حکمرانوں کو تہہ تیغ کیا، میں اس کے اسباب اور نتائج خوب سمجھ چکا ہوں، لیکن یہ انقلاب بس اسی ملک تک محدود نہیں رہے گا تم اس انقلاب کی قوت، وسعت، شدّت اور سفاکی اپنی موجودہ زندگی میں محسوس تک نہیں کر سکتے، اس انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھو، یقیناً یہ حشر برپا کر کے رہے گا، تاکہ انسانیت کے لیے خدائے ذوالجلال کی طرف سے ایک نئے "نشتر" کا سامان ہو سکے۔ ہوا یہ کہ انسانیت کی بڑی تعداد کو اب تک ایک گروہ نے دبائے رکھا یہ مختصر گروہ کل قوت اور اقبال کا مالک تھا، انسانیت کی یہ بڑی تعداد کسان اور مزدور کماتے اور اوپر کا یہ مختصر گروہ ان کی کمائی کو اپنا حق سمجھتا، جو کماتے تھے ان کو کھانے کو نہ ملتا اور جو ان کی کمائی پر رہتے تھے، وہ کمانا ذلت کا نشان سمجھتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ کماؤ طبقے پسماندہ ذلیل ہو گئے اور کھاؤ طبقے دولت اور اقتدار کے نشے میں انسانی اخلاق سے گزر گئے اور مجموعی طور پر ساری انسانیّت کو گھن لگا، غضب یہ ہوا کہ اس دور میں علم، کلچر اور مذہب کے جو معیار بنے ان کے پیشِ نظر بھی بس اسی مختصر گروہ کی خوشنودی رہی۔ ان سے اگر سکون واطمینان ملتا تو زیادہ تر ان لوگوں کو، اور ذہن کو جِلا ہوتی تو ان کی، تہذیب وتمدّن کی برکتیں پھیلتیں، تو صرف ان کے گھروں یا محلوں تک، کسانوں اور مزدوروں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ انہیں کسی بات کا ہوش بھی نہ رہتا، اور کبھی کبھار ان کے شعور کی آنکھیں کھل جاتیں، تو انہیں سلانے کے لیے خواب آور دواؤں کی کمی نہ تھی زمانہ مدتوں اسی طرح چلتا گیا اور محنت کش طبقے نسلاً درنسلاً اپنے بھائیوں کے ہاتھوں سے یہی دکھ اُٹھاتے رہے، لیکن ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی غیرت

جوش میں آئی اور اس سے اپنے بندوں کی یہ بُری حالت زیادہ دیر نہ دیکھی گئی، چنانچہ انسانی ذہن کو یہ توفیق عطا ہوئی کہ وہ مشین ایجاد کرے، اس مشین سے صنعت و حرفت کا دور شروع ہوتا ہے، بے شک یہ دور بھی اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لایا اور مشینوں کو چلانے والوں پر سالہا سال تک مشینوں کے مالکوں نے بڑے بڑے ستم توڑے لیکن اب یہ مشینیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ایک بے پناہ قوت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ مزدور متحد اور منظم ہو رہے اور آگے چل کر یہ ہوگا کہ زمین پر کام کرنے والے کسان بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے، یہ انقلاب جسے میں نے اپنی آنکھوں سے برسرکار دیکھ آیا ہوں۔ انسانیت کے ان پس ماندہ طبقوں کو للکار رہا ہے کہ اٹھو! غاصبوں سے اپنا حق چھینو اور جو ظلم پر جی رہے ہیں انہیں نیست و نابود کر دو، اس انقلاب کا نعرہ یہ ہے کہ مزدور اور کسانو، محنت کشو! مستقبل تمہارا ہے، تم محنت کرتے ہو اور تمہاری محنت ہی کا نتیجہ، یہ سر بفلک عمارتیں، رزق کی یہ فراوانی، آرام و آرائش کے یہ ذرائع اور دنیا کی یہ ساری ثروت اور دولت ہے، جس سے تم اب تک محروم رکھے گئے ہو، دراصل یہ کل متاع تمہاری ہے۔ اٹھو اپنے آپ کو منظم کرو، آگے بڑھو اور جو تمہارا حق ہے، اس پر قبضہ کر لو۔ اس میں جو شخص آڑے آئے اسے مٹا دو، جو علم، کلچر، مذہب اور اخلاق تمہارے سدِ راہ ہو، اس کا انکار کر دو، وہ علم ناقابلِ اعتبار ہے، وہ کلچر بے کار اور فرسودہ ہے وہ مذہب غلط ہے اور اخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے۔ اس انقلاب نے اپنا ایک فلسفہ بھی وضع کیا۔ اس فلسفہ سے محنت کشوں کو ایک ایسا حربہ ہاتھ آ گیا ہے جس کا توڑ بڑے بڑوں سے بھی مشکل سے بن آتا ہے، اس فلسفے کی نظری حیثیت جو کچھ بھی ہے، وہ تو ہے ہی۔ لیکن عملاً اس کا مقابلہ اس لیے بھی مشکل ہے، گو انقلاب کا یہ فلسفہ خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے، لیکن اس کا دعویٰ اور کوشش یہ ہے کہ ساری کی ساری خلقِ خدا بغیر کسی رنگ، نسل، ملک یا مذہب کی تمیز کے آزادی مساوات اور اقتصادی خوشحالی کی نعمتوں

سے یکساں فیض یاب ہو۔ یہ فلسفہ مظلوموں کو انصاف کی امید دلاتا ہے۔ اس سے ذلیل اور پس ماندہ انسان عزت اور اقبال کے خواب دیکھنے لگتے ہیں، کم ہمتوں میں جرأت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے، اور اتفاق یہ ہے کہ آج اس زمانے میں ان مظلوموں، پس ماندوں اور کم ہمتوں ہی کی کثرت ہے اور خدا کی بیشتر مخلوق دکھوں اور روگوں ہی میں گرفتار ہے۔ لہٰذا اگر تم نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بے کس طبقوں کی خبر نہ لی اور انہیں اسی حال میں رہنے دیا، جس میں کہ وہ صدیوں سے جان توڑ رہے ہیں اور تمہارے اوپر کے طبقے حسب سابق جونک بن کر ان کا خون چوستے رہے، اور ان کو تم نے اب بھی اس بھوک، جہالت ذلت اور عفونت کی دلدلوں میں بدستور مرنے سڑنے دیا تو یاد رکھو کہ انقلاب کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ تمہارے ملک کے ان بدنصیب طبقوں کو دوسرے ملکوں کی طرح تمہارا جانی دشمن بنا دے گا اور اگر تمہاری غفلت سے ان کی دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی، تو اس کے شعلے تمہیں تو جلا کر خاک سیاہ کریں گے ہی، لیکن اس کے ساتھ تمہارے علم، کلچر اور مذہب کی بھی خیر نہ ہوگی، اس قسم کے انقلاب اور اس کے لادینی فلسفے کے ہولناک نتائج سے بچنا چاہتے ہو تو انقلاب کے کسی ایسے دینی فلسفے کو اختیار کرو جس کے ذریعے تم خدا کو مانتے ہوئے خدا کی مظلوم مخلوق کو خوش حال بنا سکو، انسانیت اب زیادہ دیر تک ظلم نہیں سہہ سکتی، اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے اگر لادینی فلسفہ انقلاب کے علمبردار اپنے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی کی دعوت دیتے ہیں تو ساری انسانیت کو خدا کی ایک ہی مخلوق ماننے والے اور اسے ہر ذی روح کا رازق اور رب جاننے والے کوئی ایسا فکر کیوں پیش نہیں کرتے جس سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی ہو، ہر ظلم مٹ جائے، ہر حقدار کو اس کا حق ملے، ذلت و نکبت کا خاتمہ ہو اور کوئی بندہ اپنے رب کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کیا جا سکے اور جس طرح ایک خاندان کے سب افراد آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح مجموعی انسانیت جس کی حیثیت فی الواقع

عیال اللہ کی ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے یکساں متمتع ہو، چنانچہ میں انقلاب کے اس قسم کے دینی فلسفے کا پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ انقلاب کا میرا یہ پیغام تمہیں لادینی انقلاب کے ضرر رساں اثرات سے محفوظ رکھ سکے گا۔ محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کا آنا یقینی ہے تم نے اگر محنت کشوں کے اس انقلاب کو دینی نہ بنایا تو پھر یہ انقلاب حتمی طور پر لادینی فلسفے کے ذریعے ہوگا۔!

مولانا عبید اللہ سندھیؒ چند مشاہدات

از مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ایم اے سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ نے خاص طور پر نئی دنیا کے عظیم مدنی نمبر کے لیے ذیل کا مضمون تحریر فرمایا تھا۔ جس میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے بعض منور گوشوں کو ایک معتبر مؤرخ اور ناقد کی نظر سے حضرت مولانا نے اپنی چشم بینا سے دیکھا اور اپنے تاثرات کو بہترین الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا۔ ان کے علم و فضل اور مجاہدانہ کارناموں کا ذکر لوگ بڑے جوش و خروش سے کرتے تھے اور ان کو سن سن کر دل میں جذبہ اور ولولہ اٹھتا تھا کہ اے کاش مولانا اس زندگی میں کہیں مل جائیں اور آنکھیں ان کے دیدار سے شاد کام ہوں۔ آخر خدا نے دل کی یہ مراد پوری کی۔ ۳۹ء میں اچانک سنا کہ مولانا تیئس برس کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان تشریف لا رہے ہیں اور جہاز سے کراچی اتر کر

سیدھے دہلی تشریف لائیں گے۔ اب ایک ایک گھڑی گننی شروع کر دی اور مولانا کی آمد کا سخت بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا۔ ہم سب لوگ مولانا کے استقبال کے لیے دلی اسٹیشن پر پہنچے۔ علماء اور ملک کے زعماء جس طرح رہتے تھے اس کے پیش نظر میں نے اس وقت مولانا کی نسبت جو تخیل قائم کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ عمامہ سر پر ہوگا، جبہ زیب تن ہوگا۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم از کم ہمراہ ضرور ہوگا۔ دو تین بھاری بھاری سوٹ کیس ایک بھاری بیڈنگ۔ دو تین تھرماس کی بوتلیں، تین چار بھاری اور وزنی ناشتہ دان ساتھ ہوں گے۔ چہرہ پر تمکنت اور وقار ہوگا۔ لیکن جب ٹرین پہنچی تو یہ تمام تخیلات اوہام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درجوں میں گھومتے پھر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا۔ ایک صاحب ننگے سر، صرف کھدر کا کرتہ اور پاجامہ پہنے اور ایک سفید کھدر کی چادر گلے میں ڈالے ہوئے ایک دم میں تھرڈ کلاس سے پھدک کر پلیٹ فارم پر آ کھڑے ہوتے۔ پہچاننے والوں نے پہچانا اور ان کی طرف لپکنا شروع کر دیا معلوم ہوا کہ یہی مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہیں۔ سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے۔ عمر ۶۵ اور ۷۰ کے درمیان ہوگی، مگر جسم مضبوط اور گٹھا ہوا آنکھوں میں غیر معمولی چمک، پیشانی پر مجاہدانہ عزم وہمت کے کس بل اور آواز میں طنطنہ اور چہرہ پر بزرگانہ معصومیت کے ساتھ ایک ایسا جلال کہ گویا ایک سپاہی ایک میدان جنگ سے منتقل ہو کر ایک دوسرے میدان جنگ کی طرف آ گیا اور اس نے ایک دوسرا اور نیا مورچہ سنبھال لیا ہے۔ لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان اتاریں، مگر وہاں سامان کہاں تھا، جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا۔ بس وہی ان کا سامان تھا اور باقی خدا کا نام۔ میں نے دنیا میں علما بھی دیکھے ہیں اور درویش بھی۔ تارکین دنیا بھی دیکھے اور کسانوں اور مزدوروں کے غم میں مرنے والے بھی، لیکن دنیا اور اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی بے نیازی اور مکمل قسم کا قلندر آج

تک نہ کوئی دیکھا ہے اور نہ شاید دیکھوں گا۔ دلی پہنچنے کے بعد مولانا نے ابتداءً قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں کیا تھا۔ یہ جگہ میرے پڑوس میں تھی۔ اس لیے مغرب کے بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حسبِ معمول حاضر ہوا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں رخصت ہوا، تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرہ سے نکل آئے اور سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بڑی موٹر ہمارے پاس آکر رُکی۔ موٹر کا دروازہ کھلا تو اس میں کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون باہر نکلے۔ انہوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے جس کے لیے آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ مولانا نے پوچھا کب؟ سیٹھ صاحب نے کہا، بس ابھی۔ سیٹھ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مولانا فوراً لپک کر ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ نہ کمرہ میں واپس گئے اور نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کمرے کا دروازہ بند کیا۔ میں ان کے اس انداز پر حیران رہ گیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا اگر کمرہ میں واپس جاتے بھی تو لیتے کیا۔ وہاں ان کا سامان تھا ہی کیا۔ وہاں جو بستر پڑا ہوا تھا یا کچھ برتن رکھے ہوئے تھے، تو وہ جامعہ کے مہمان خانہ کے تھے۔ مولانا کا کچھ نہ تھا۔ قرول باغ کے مہمان خانہ میں چند روز قیام فرمانے کے بعد مولانا جامعہ نگر اوکھلا میں منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پابندی کے ساتھ اوکھلے سے آکر دلی کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے جنوب مغرب میں حکیم نابینا مرحوم کا مشہور مطب تھا اور اس مطب سے بالکل متصل ہمارے ایک دوست مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی کا بڑا مکان تھا جس کے ایک وسیع کمرہ میں ادارۂ شرقیہ کے نام سے مولانا موصوف نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ اس ادارۂ شرقیہ میں جمعہ کی نماز کے بعد سے لے کر عصر تک احباب کا اچھا خاصا اجتماع رہتا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر سیدھے یہیں تشریف لاتے تھے اور عصر تک رہتے

تھے۔ چند روز کے بعد ہم لوگوں کی درخواست پر مولانا نے اس مجلس میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینا شروع کر دیا۔ درس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ کتاب کی کوئی اہم بحث نکال لی اور اس پر تقریر شروع کر دی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد ہم لوگ سوالات کرتے تھے اور مولانا ان کے جوابات دیتے تھے۔ اس مجلس میں دیوبند کے فضلائے جو دلی میں مقیم تھے، وہ اور ان کے علاوہ جامعہ ملیہ کے کچھ اساتذہ اور چند اور ارباب علم شریک ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ کیا ہوا ؟ مولانا سندھیؒ حسبِ معمول اوکھلے سے دلی آئے۔ جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی اور پھر ادارۂ شرقیہ میں تشریف لاکر حسبِ معمول حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا۔ اس وقت چہرہ پر نہ تکان کا کوئی اثر تھا اور نہ آواز میں کسی قسم کا اضمحلال اور ضعف کمال بشاشت اور توانائی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضر حواسی کے ساتھ حصّہ لیا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا، تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہو گئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی ضرورت سے میں چتلی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک بھٹیارہ کی دوکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں کھانا بھی بہت معمولی، یعنی دو آنہ کا سالن اور ایک آنہ کی روٹی میں نے کہا، حضرت یہ بے وقت کھانا کیسا تھا ؟ فرمایا: "اوکھلے میں کھانا تیار نہ تھا۔ اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس لیے کھانا کھائے بغیر ہی چلا آیا تھا۔" یہ تو خیر ہوا ہی اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس واقعہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ گرمیوں کے کسی مہینہ میں پیش آیا تھا اور چونکہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلی کی آمد و رفت کا بس کا کرایہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہ تھے۔ اس لیے اس روز مولانا سخت تپش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے سے دلی آٹھ میل پا پیادہ آئے اور اسی طرح آٹھ میل پا پیادہ واپس تشریف لے گئے۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے نہ از خود ہم سے کچھ کہا اور نہ چہرہ دیکھ کر کوئی سمجھ سکا، بلکہ جامعہ نگر کے ایک صاحب نے جو بس میں سفر کر رہے تھے

مولانا کو پیدل آتے ہوئے دیکھ لیا تھا ان سے جب مجھ کو یہ معلوم ہوا تو میں نے مولانا سے دریافت کیا اور مولانا نے اس کی تصدیق کی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ اس روز مولانا پیدل آنا تھا اس لیے اوکھلے سے ان کو بہت پہلے روانہ ہونا تھا اور چونکہ اس وقت تک کھانا تیار ہوا نہیں تھا اس لیے دلی میں عصر کے بعد کھانا کھایا اور چونکہ جیب میں صرف تین آنہ پیسے تھے جو بس کے کرایہ کے لیے کافی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلی تک کا سفر پیدل کیا۔ ایک مرتبہ میری موجودگی میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب اعثمانیؒ نے مولانا سے پوچھا کہ "حضرت! آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نوکر بھی رکھا ہے؟ حسب عادت بپھر کر بولے "مفتی جی! آپ یہ کیا پوچھتے ہیں۔ کیا کوئی انسان بھی کبھی انسان کا نوکر ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے۔ میری خدمت بھی میرے دوست احباب کرتے تھے اور میں ان کی خدمت کرتا تھا اسی نشست میں مفتی صاحب نے پوچھا"

حضرت! بتیس برس کی جلا وطنی کے زمانہ میں آپ پر عیش و مسرت کے بھی کچھ دن آئے ہیں؟ فرمایا۔ مفتی صاحب یقین کیجئے۔ اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے۔ جس میں میں چین اور آرام سے سویا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے پر بتیس برس کے بعد میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکا ہوں۔ مولانا ہمیشہ ننگے سر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا دلی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا۔ "مولانا آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ فوراً لال قلعہ کی طرف اشارہ کرکے کچھ غصہ اور کچھ حسرت کے ملے جلے لہجہ کے ساتھ فرمایا "میری ٹوپی تو اس دن سر سے اتر گئی، جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب جب تک یہ مجھ کو واپس نہیں مل جاتا۔ میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں ٹوپی سر پر رکھوں"۔ مولانا کافی عمر رسیدہ تھے عمر کا بڑا حصہ جلا وطنی کی تکالیف اور مصائب میں بسر کیا تھا اور بے زر و سرمایہ تھے، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کی روشنی میں انہوں نے اس پر مسلسل غور و فکر کیا تھا

کہ اسلام کو دنیا کے موجودہ اقتصادی، سماجی، اور سیاسی حالات میں کس طرح ایک عالمگیر طاقت بنایا جائے جس کا کہ وہ دین فطرت ہونے کے باعث بجا طور پر مستحق ہے اور جو اس کا طبعی حق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اسلام کے اجتماعی، اقتصادی اور سماجی نظام کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا اور دوسری جانب انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو دنیا میں عظیم الشان صنعتی انقلاب ہوا اور اس انقلاب کے جو اثرات انسانی فکر و تخیل اور عام معاشرہ پر پڑھ رہے ہیں۔ ان سب کا دیدہ دری اور عمیق بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا اور اس کے بعد انہوں نے ایک نتیجہ پر پہنچ کر اپنا ایک مستقل فکر قائم کیا تھا، مولانا کا یہ فکر بڑا مستحکم اور غیر متزلزل تھا اور اس پر ان کو کامل درجہ کا وثوق اور اعتماد تھا۔ جلا وطنی کی واپسی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے بڑا اہم اور مقدس مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کے اس فکر کو سمجھیں اور اس کی بنیاد پر سوسائٹی کی از سر نو تشکیل و تعمیر کریں۔ چنانچہ انہوں نے وطن آنے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں جو مقالات و مضامین لکھے اور جو رسالے تالیف کیے۔ ان کے عمق اور ضخامت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی فکر کو عام کرنے اور اپنے ہم خیال پیدا کرنے کی کیسی دھن تھی، لیکن افسوس ہے کہ مولانا کو اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا جتنے بڑے مفکر اور مخلص تھے۔ اتنے بڑے نہ تو مقرر تھے اور نہ اتنے بڑے انشا پرداز بات بہت گہری اور پتہ کی کہتے تھے، مگر انداز بیان کچھ ایسا گنجلک اور اشتباہ انگیز ہوتا تھا کہ بعض اچھے اچھے اہل علم اور مفکرین بھی ان سے بدظن ہو جاتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فکر میں اس درجہ پختہ تھے کہ کسی مسئلہ پر بحث و گفتگو کے وقت ان کا لب و لہجہ درشت اور غیر مصالحانہ ہو جاتا تھا۔ مولانا خود بھی کبھی کبھی اس کا اعتراف کرتے اور اس پر افسوس کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی بڑی تمنا اور آرزو تھی کہ میں کسی طرح ان سے سبقاً سبقاً حجۃ اللہ البالغہ پڑھ لوں اور پھر ان کے ارشادات کی روشنی میں

حجۃ اللہ البالغہ کی شرح اپنے الفاظ میں لکھ ڈالوں۔ اس اہم کام کے لیے مجھ ایسے ہیچمدان مولانا کی نظر میں انتخاب میری سب سے بڑی خوش قسمتی تھی۔ اس بناء پر میرے لیے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں فوراً اس کے لیے آمادہ ہو گیا اور قرار داد یہ ہوئی کہ مولانا روزانہ مغرب کے بعد اوکھلے سے دلی آئیں گے اور مسجد فتح پوری کے ایک حجرہ میں شب بھر قیام کریں گے۔ ادھر میں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے مکان قرول باغ سے فتح پوری میں آجاؤں گا اور وہاں مولانا مجھ کو دو تین گھنٹے درس دیں گے۔ دوسرے دن میں مولانا کی تقریر درس کو اپنے الفاظ میں قلمبند کر کے ان کو دکھا دوں گا۔ یہ قرار داد ہو چکی تھی اور ابھی اس پر عمل شروع نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو پنجاب کا سفر پیش آگیا۔ فرمایا کہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ جلد واپس آجاؤں گا اور آتے ہی یہ پروگرام شروع ہو جائے گا۔ لیکن آہ کسے خبر تھی کہ مولانا کا دلی سے یہ سفر آخری سفر تھا جس سے واپس آنا مقدر نہیں تھا۔ پنجاب اپنی صاحبزادی کے پاس گئے تھے جو لاہور میں تھیں۔ وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ہی بیمار ہوئے اور اس قدر شدید کہ جانبری ممکن نہ ہوئی اور واصل بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا مشیت ایزدی میں کسی کو کیا مجال دم زدن ہے۔ آج مولانا دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنی تحریروں کا جو گراں بہار ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں، وہ اس لائق ہے کہ اسلامیات کا ہر طالب علم اس کا غور و فکر سے مطالعہ کرے۔ اس سے فکر کی نئی راہیں سامنے آئیں گی اور تنازع للبقاء کے موجودہ دور میں ایک ایسی روشنی ملے گی جو ہمت اور عزم پیدا کرے گی۔

محمّد رحیم دہلوی

نے "انقلابی مولوی" کے نام سے ایک ۳۲ صفحات کا کتابچہ ۱۹۳۹ء میں شائع کیا تھا جس میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی سوانح حیات کا کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ حصہ

حضرت مولانا سندھیؒ نے خود اپنی بعض تحریرات میں بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً ذاتی ڈائری اور التمہید وغیرہ میں۔ جناب محمد رحیم صاحب نے مولانا سندھیؒ کا تعلیمی آغاز اور مسئلہ توحید کا سمجھنا اور پھر اسلام قبول کرنا، حقیقت یہ ہے کہ کتاب تحفۃ الہند اور تقویۃ الایمان شاہ شہیدؒ اور احوال الآخرۃ پنجابی مولانا بارک اللہ لکھوی تینوں کتابوں کی مدد سے مولانا نے ایمان اور توحید کا مسئلہ خوب سمجھ لیا تھا اور اسلام لانے میں تاخیر نہیں کی۔ ایمان لانے کے بعد مولانا کا اپنے وطن میں رہنا ناممکن تھا۔ اس لیے مولانا نے سندھ کی طرف ہجرت کی۔ سندھ میں بھر چونڈی والے بزرگ سید العارفین مولانا حافظ محمد صدیقؒ صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ موصوف کی خدمت میں حضرت سندھیؒ کا پہنچ جانا ان کی ازلی خوش قسمتی تھی۔ حضرت کے سامنے اظہار اسلام اور پھر حضرت کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور حضرت کی خدمت میں رہنے سے مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ میرے لیے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کے لیے ہو سکتی ہے۔ حضرت بھر چونڈیؒ نے ایک دن لوگوں کے مجمع میں فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے ہم کو ماں باپ بنایا ہے۔ اس بات کا اثر ساری زندگی مولانا پر رہا۔ مولانا نے اسلام اور اسلامی سوسائٹی سے کبھی بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کیا۔ حضرت حافظ محمد صدیقؒ نے جو آپ کے لیے دعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ عبیداللہ کا واسطہ کسی راسخ العقیدہ عالم سے پیدا کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا مستجاب فرمائی اور مولانا بالآخر دارالعلوم دیوبند میں مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کی خدمت بابرکت میں پہنچ کر فیض یاب ہوتے۔ حضرت حافظ صدیق بھر چونڈیؒ کی طرح مولانا شیخ الہند عظیم انقلابی عالم دین اور عظیم مرد مومن تھے۔ حضرت بھر چونڈیؒ کا ایک واقعہ عرض کر دوں۔ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں ایک غیر مقلد عالم دین آپ کی ملاقات کے لیے آیا۔ ملاقات کے بعد نماز کا وقت تھا۔ حضرت بھر چونڈیؒ نے اس غیر مقلد عالم دین کو نماز پڑھانے کے لیے اپنے مصلیٰ پر

کھڑا کر دیا۔ لیکن آپ کے کسی سندھی مرید نے اس کو برداشت نہ کیا اور وہ حضرت کا مصلی اس غیر مقلد عالم دین کے پاؤں سے نکال کر بھاگ گیا۔ حضرت بھرچونڈیؒ نے دیکھا کہ مصلی پاؤں کے نیچے سے نکال لیا گیا ہے۔ حضرت بھرچونڈی نے اپنے سر پر جو پگڑی باندھی ہوئی تھی، اس سے ایک مصلی جتنا کپڑا پھاڑ کر اس غیر مقلد عالم دین کے پاؤں کے نیچے بچھا دیا اور پھر فرمایا کہ مولانا اب نماز پڑھائیں۔ یہ مصلی اٹھانے والا نا سمجھ ہے سواتی) مولانا سندھیؒ نے دہلی، رامپور، کانپور میں کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند میں تکمیل کی اور بعض علم حدیث کی کتب گنگوہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر حاصل کی۔ ۱۳۰۸ھ میں دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد مولانا سندھیؒ جب سندھ پہنچے تو مولانا سید العارفین کی آٹھ دن پہلے وفات ہو چکی تھی۔ مولانا سندھیؒ بہت افسردہ ہوئے لیکن حضرت بھرچونڈیؒ اپنے دو بڑے جانشینوں میں مولانا غلام محمد دین پوری اور مولانا تاج محمود امروٹیؒ کو وصیت فرما گئے تھے کہ عبید اللہ کا خیال رکھنا۔ ان دونوں حضرات نے اپنے پیر و مرشد کی وصیت کے مطابق مولانا سندھیؒ کی پوری تربیت و تکمیل میں کمال درجہ کی محنت کی۔ مولانا سید تاج محمود امروٹیؒ نے مولانا سندھی کے مطالعہ کے لیے ایک بہت بڑے کتب خانہ کا انتظام کیا جس میں ہر قسم کی کتابیں مہیا کی گئیں اور مولانا تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ پورے اطمینان کے ساتھ ۱۳۱۵ھ تک مطالعہ کرتے رہے۔ مولانا سید تاج محمودؒ نے مولانا سندھیؒ کا اپنے ایک معتقد ماسٹر محمد عظیم یوسف زئی کی لڑکی سے نکاح بھی کرا دیا۔ سندھ میں اس دور کی نمایاں شخصیات حضرت مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث اور مولانا ابو التراب صاحب العلم الرابع کی علمی صحبتیں رہیں۔ ان سے بھی مولانا سندھیؒ استفادہ کرتے رہے۔ ۱۳۲۷ھ میں جب جمعیۃ الانصار کی تشکیل کی گئی۔ تو مولانا شیخ الہندؒ نے مولانا سندھیؒ کو سندھ سے دیوبند طلب کیا اور جمعیت کا کام ان کے سپرد کیا اور آپ نے بطور ناظم پورے چار سال تک جمعیت کا کام پوری دل جمعی سے انجام دیا۔ اس کام میں

آپ کی رفاقت کے لیے مولانا محمد صادق سندھیؒ اور مولانا ابو محمد احمد لاہوریؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ بھی آپ کے ساتھ شریک کار تھے۔ مولانا شیخ الہندؒ نے مولانا سندھیؒ کو ایک جوہر قابل سمجھ کر ہندوستانی سیاست سے اور پھر عالمی سیاست سے اور قوت متسلط برطانوی سیاست سے پوری طرح آگاہ کیا اور اپنے مشن کے ایک نہایت ہی اہم رکن کی طرح تمام باتوں سے آگاہ کیا اور پھر آپ نے مولانا کو افغانستان جانے کا اشارہ کیا جس کی تعمیل میں مولانا سندھیؒ نے بڑی قربانی دی اور حضرت شیخ الہندؒ کے مشن کو پورا کیا۔ مولانا سندھیؒ کا کابل میں رہنا اور پھر وہاں سے روس جانا اور وہاں سے ترکی پہنچنا اور تقریباً چار سال تک وہاں کام کرنا اور پھر مجبوراً آپ کا حجاز مقدس اور مکہ مکرمہ پہنچنا اور وہاں علمی خدمات انجام دینا۔ یہ تمام واقعات تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ جو مختلف کتابوں میں آپ ان کو پڑھ سکتے ہیں۔!

خلافت کے زوال کا مولانا سندھیؒ پر بہت اثر تھا۔ وہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے زوال پذیر ہونے سے بہت افسردہ تھے۔ اس لیے وہ اپنے وطن مکہ مکرمہ سے کبھی واپس نہ آتے۔ اگر ان کے سامنے مسلمانوں کی ہمدردی اور اسلام کی تقویت کا سوال نہ ہوتا مولانا محض آخری عمر میں اس لیے وطن واپس آنے کے لیے تیار ہو گئے کہ اب لادینیت اور لامذہبیت کا انقلاب پورے زور وشور سے دنیا میں اُبھرے گا اور اگر مسلمانوں نے قرآن کریم کے پروگرام کو شاہ ولی اللہؒ کے پیش کردہ حکمت اور فلسفہ کے طریق پر سمجھنے کی کوشش نہ کی تو مسلمان ختم ہو جائیں گے۔ مولانا سندھیؒ نے جب پوری کوشش سے افغانستان کو آزاد کرایا، تو امیر امان اللہ خان والی افغانستان اور انگریزوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اس انقلابی مولوی کا بڑا دخل تھا، چنانچہ انگریزی سفیر سر ہمفری ڈائس نے محمود طرزی (وزیر خارجہ کابل) کے سامنے اس کا اعتراف کیا تھا کہ یہ معاہدہ افغانوں اور انگریزوں کے درمیان نہیں ہوا بلکہ عبیداللہ اور انگریزوں کے درمیان ہوا ہے۔ مسلمانوں کے اجتماعی

پروگرام کو اور ان کی ملی اور سیاسی بہتری اور ان کی اقتصادی زبوں حالی اور ان کے ملٹری اہم کی کمزوری اور ان کے صنعتی اور ٹیکنالوجی ضعف کو دور کرنے کے لیے اور قرآن کے پروگرام کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے اور غلامی کی لعنت سے نفرت دلانے کے لیے مولانا نے مراجعت وطن اختیار کی۔ مولانا فرماتے تھے کہ قرآن کو سمجھنے والا انسان کبھی غلام نہیں ہو سکتا۔

ظفر حسن ایبک

کی آپ بیتی جو تین جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ جناب ظفر حسن ایبک (کیپٹن آرٹلری) (ریٹائرڈ) ٹرکش آرمی استنبول۔ یہ کتاب اشرف پریس لاہور میں طبع ہوئی ہے اور منصور بک ہاؤس کچہری روڈ لاہور نے اسے تقسیم کیا۔ اس کتاب کا اوّل حصہ و دوم ظفر حسن کی اپنی سوانح حیات اور ہجرت کے واقعات کے علاوہ مولانا سندھیؒ کی مکمل سیاسی مساعی پر مشتمل ہے۔ مولانا کی سیاسی جہود کا اتنا مکمل خاکہ کسی اور کتاب یا تحریر میں نہیں جتنا اس کتاب کی دو جلدوں میں مذکور ہے۔ ظفر حسن پانی پت کرنال کے ایک متوسط زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لاہور گورنمنٹ کالج میں گریجوایش کر رہے تھے۔ جب کہ جنگ بلقان کے خونخوار واقعات اس سے قبل پیش آ چکے تھے اور برطانیہ کی تمام اتحادی طاقتوں کی ٹرکی خلافت پر حملہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے بالعموم اور برصغیر کے حساس مسلمان نوجوانوں کے لیے بالخصوص انتہائی الم ناک تھا۔ مسلمان نوجوانوں کا خون کھولتا تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے ترک مسلمان بھائیوں کا کسی نہ کسی طرح دفاع کر سکیں اور اپنے ذمہ سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ظفر حسن اور ان جیسے دوسرے کئی ایک جذباتی نوجوان انگریز کی عملداری سے نکل کر بڑی مشکلات اور بے حد صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد سرحدی علاقوں میں آزاد قبائل کے مختلف مراکز اور مجاہدین کے مرکزوں سے ہوتے ہوئے کسی نہ

کسی طرح افغانستان پہنچے۔ ظفر حسن صاحب نے اپنے ابتدائی خاندانی حالات اور پھر تعلیمی احوال ذکر کرنے کے بعد انگریزوں کے مظالم اور مسلمانوں کی طرح طرح کی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور پھر سفر کابل کے حالات اور وہاں کی داستان ذکر کی ہے۔ ظفر حسن اور ان کے دیگر رفقاء اپنی تعلیم یہاں نامکمل چھوڑ گئے تھے۔ اس کا بھی انہیں مستقبل میں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ یہ تمام داستان انتہائی دلچسپ اور عبرتناک ہے۔ ظفر حسن تقریباً بارہ سال تک مولانا سندھیؒ کے ساتھ رہے ہیں اور مولانا سے قرآن کریم بھی پڑھا اور مولانا شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ اور حکمت کا بھی ایک معتد بہ حصہ حاصل کیا۔ مولانا کے مشیر اور سیکرٹری اور معاون اور خادم رہے تھے اور برصغیر کی آزادی کے سلسلہ میں مولانا سندھیؒ کی جو کوششیں تھیں، ان میں ایک ذمہ دار فرد کی طرح ظفر حسن بھی شریک کار رہے۔ مولانا سندھیؒ کے کابل میں سات سال اور روس میں ایک سال اور ترکی میں چار سال کے عرصہ میں ظفر حسن برابر مولانا کی تربیت اور رفاقت میں رہے اور بہت کچھ مولانا سے سیکھا۔ مولانا سندھیؒ افغانستان پہنچ کر امیر حبیب اللہ خان مرحوم سے لے کر ان کے فرزندان سردار عنایت اللہ خان سردار نصر اللہ خان اور امیر امان اللہ خان اور ان کے دوسرے اعزّہ میں سے سردار نادر خان تک سب سے تعلق رہا ہے۔ ان سب کی ذہنیت اور ماحول اور کاموں سے مولانا سندھیؒ پوری طرح آگاہ تھے اور ان کے ساتھ تعاون کی صورتیں بھی ہوتی تھیں اور ان سے کام بھی لیا جاتا تھا اور انگریزوں کی ڈپلومیسی اور سازشوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ سردار امان اللہ خان کو انگریزوں کے ساتھ ٹکرانے اور آمادہ بجنگ کرنے میں مولانا سندھیؒ کا بڑا ہاتھ تھا اور سردار نادر خان سپہ سالار کی معیت میں ٹل کے علاقہ میں انگریزوں پر حملہ اور حکمتِ عملی سے فتح حاصل کرنا جس میں نادر خان کے ساتھ ظفر حسن برابر شریک رہے۔

مولانا سندھیؒ جب ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے، تو وہ ہندوستان میں آزادی خواہ

حضرت حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد سے مل کر آئے تھے اور مولانا سندھی نے ان حضرات کو مولانا شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل جانے کی اطلاع دی تھی۔ ان حضرات نے مولانا سندھیؒ کے کابل جانے کے مقصد کو پسند کیا تھا اور انہیں اپنا نمائندہ مان لیا تھا۔ مولانا سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے پہلے ہی کچھ لوگ برصغیر کی آزادی کے سلسلہ سے تعلق رکھنے والے پہنچ چکے تھے۔ شیخ ابراہیم تو اقتصادیات کے ماہر تھے اور مولوی محمد علی قصوری اور مولانا کے عزیز مولانا عزیز احمد صاحب جو مولانا لاہوری کے چھوٹے بھائی تھے اور مولانا سندھی کے خادم جو کابل روس ترکی اور حجاز کے سفر میں آپ کے ساتھ رہے۔ اس وقت قاضی القضات مولانا عبدالرزاق دیوبند کے تعلیم یافتہ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان کے توسط سے افغانستان کے سرداران مولانا شیخ الہندؒ کے افکار سے باخبر تھے۔ افغانستان میں کچھ غیر مسلم حضرات بھی راجہ مہندر پرتاب اور ڈاکٹر متھرا سنگھ اور کچھ دوسرے حضرات بھی تھے مولانا برکت اللہ بھوپالی بھی ہندوستان کی آزادی خواہ حضرات میں سے تھے۔ ان حضرات کے نقطۂ نگاہ اس میں مختلف تھے۔ کوئی انتہا پسند تھے، کوئی غدر پارٹی کے ممبر تھے۔ کوئی کسی طرح انگریزوں کے منفر رہتے ان میں ہندوستان کی آزادی ایک قدر مشترک تھی۔ ان میں زیادہ تر حصہ مسلمانوں کا تھا۔ کابل میں عارضی جلاوطن حکومت جو تشکیل دی تھی۔ اس کا صدر راجہ مہندر پرتاب کو بنایا گیا تھا اور وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی مولانا سندھیؒ کو اس کا وزیر داخلہ نامزد کیا گیا تھا۔ اس حکومت کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی مختلف حکومتوں سے دوستانہ تعلقات و روابط پیدا کیے جائیں اور انگریزوں کے خلاف اپنی اتحادی قوت پیدا کی جائے۔ اس حکومت کے تحت مختلف ممالک میں وفود بھیجے گئے۔ روس، ترکی، جاپان، جرمنی وغیرہ بعض وفود کو کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور بعض تو بہت ناکام رہے، چنانچہ ایک وفد کے رکن ڈاکٹر متھرا سنگھ اور شیخ عبدالقادر کو روسیوں نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالہ

کر دیا۔ متھراسنگھ چونکہ بم کیس کا مجرم تھا اور پھانسی کی سزا اس کے لیے انگریزوں نے تجویز کی تھی۔ وہ فرار ہو گیا تھا۔ وہ تو انگریزوں کے ہاتھ لگتے ہی پھانسی پر لٹکا دیے گئے اور شیخ عبدالقادر جیل میں بھی تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جنگ عظیم کے خاتمے پر جیل میں ہی وفات پا گئے۔ دوسرا وفد جو ترکی جانا چاہتا تھا۔ وہ مشہد میں روسیوں کے ہاتھ پڑا۔ اس وفد میں میاں عبدالباری اور شجاع اللہ تھے جن کو بہت اذیتیں دی گئیں اور آخر میں انگریزوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ آخر ان کو ہندوستان لے گئے۔ میاں عبدالباری کے عزیزوں نے بڑی مشکلوں سے ان کی ضمانت دے کر ان کو جیل سے رہا کرا لیا اور کچھ راز بھی انگریزوں نے ان سے اگلوا لیے۔ لیکن وہ ۱۹۴۲ء تک اپنے شہر میں ہی نظر بند رہے۔ ظفر حسن ایبک ۱۸۹۵ء شہر کرنال میں پیدا ہوئے تھے۔ ظفر حسن کے علاوہ لاہور کے مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے حضرات جنہوں نے اس تحریک میں حصہ لیا اور ترک وطن کیا۔ میاں عبدالباری شیخ عبدالقادر، عبدالمجید خان، اللہ نواز، شیخ عبداللہ، عبدالرشید، غلام حسین، عبدالخالق محمد حسن، خوشی محمد، عبدالحمید، رحمت علی، شیخ شجاع اللہ تھے۔ کابل میں انگریزوں کی سازش کے نتیجہ میں مولانا سندھیؒ کا رہنا مشکل ہو گیا، لہٰذا انہیں افغانستان کو خیر باد کہنا پڑا مولانا جب روس پہنچے۔ اپنے رفقاء کے ساتھ خوشی محمد جو کابل میں رہتے ہوئے مولانا سندھیؒ نے اس کے ساتھ بہت احسانات کیے تھے۔ یہ شخص روسی کمیونزم کے نظریات کا قائل تھا۔ یہ شخص مولانا سندھیؒ کو کہنے لگا کہ اگر کمیونسٹوں کی تائید میں حصہ نہ لیں گے، تو روس میں روٹی بھی نہ مل سکے گی، کیونکہ وہاں تو مذہبی پیشواؤں اور پابند مذہب لوگوں کے لیے رہنا بھی ممکن نہیں۔ مولانا سندھیؒ کو اس بات سے بہت رنج ہوا کہ ایک شخص ایک زمانہ میں ان کا شاگرد رہ کر ان سے استفادہ کرتا رہا۔ آج وہ اپنے ماتحت رہ کر مولانا کو کام کرنے پر مجبور کرتا ہے اور غلط نظریات کا حامل بنانا چاہتا ہے۔ ظفر حسن نے اس موقع پر اپنی کمائی ہوئی تمام پونجی مولانا سندھیؒ کی خدمت میں پیش کر دی۔ ظفر صاحب کہتے ہیں کہ

ان واقعات کے علم پر مجھے قلق ہوا کہ ہمارے مرشد جنہوں نے ہمیں دینی اور دنیوی تعلیم و تربیت دی تھی۔ آج بے مائیگی کی وجہ سے ایسے شخص کے محتاج ہو گئے۔ مولانا ہمارے استاد تھے۔ مجھے قرآنی تعلیم سے فیض پہنچایا تھا اور میرا کیریکٹر بنانے میں میری مدد کی تھی میں ان کی جتنی بھی خدمت کرتا کم تھی، آپ بیتی میں ظفر حسن صاحب ایک مقام میں لکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں کمیونسٹ تعلیم کے وہ پہلو جو اسلامی احکام اور عقائد کے خلاف تھے۔ وہ بھی قبلہ مولانا (سندھی) صاحب پر واضح ہو گئے تھے۔ میرے دل میں اس مضر تعلیم کی وجہ سے اسلام کے بارے میں جو شک وشبہ اور ذہنی تشویش پیدا ہو سکتی تھی۔ میں اس کو قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں عرض کر کے ان سے اس کا شافی اور اطمینان بخش جواب اور صورت حال پوچھ لیا کرتا تھا۔ اس لیے خداوند کریم کے فضل سے میرے ایمان میں کوئی کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا۔ (آپ بیتی ج ۲ ص ۳)

کمیونسٹ اور مذہب

کمیونسٹوں کا مذہب کے بارے میں ایک مشہور مقولہ ہے جو انہوں نے کارل مارکس کی تعلیم سے لیا ہے۔ اس مقولہ کو روسیوں نے ماسکو کے (سرخ میدان) میں ایک نمایاں جگہ پر کندہ بھی کرا دیا ہے۔ مقولہ یہ ہے RELIGION IS THE OPIUM OF THE PEAPLE (یعنی مذہب لوگوں کے لیے افیون ہے) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ مذہبی عقیدے لوگوں پر ایسی غشی طاری کر دیتے ہیں کہ وہ غاصبوں سے اپنے حقوق طلب کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ مذہب ذاتی عقائد رکھنے کو جائز قرار دینے کی وجہ سے (کارل مارکس کے نظریے کے مطابق) مالداروں کی حمایت کرتا ہے اور ان کے مال پر غریبوں اور ناداروں کو دست درازی کرنے سے روکتا ہے اور اسی طرح ان لوگوں کو اپنے حقوق طلب کرنے سے منع کرتا ہے۔ قبلہ مولانا صاحب نے اس زہریلے نظریے

کو رد کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ اسلامی قانون وراثت دولت کو صرف چند ایک لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہونے نہیں دیتا۔ زکوٰۃ مالداروں پر ایک ایسا ٹیکس ہے کہ اس کے ذریعے سوسائٹی کے محتاجوں کو مدد دی جاتی ہے۔ ایک روز ہمیں یونیورسٹی میں پڑھایا گیا کہ ذاتی ملکیت کو جو مذہب بھی جائز سمجھے۔ وہ قدامت پسند ہے کیونکہ وہ غریبوں کو مالداروں کا غلام بناتا ہے اور ان کا استحصال (یعنی EXPLOITALION) کراتا ہے۔ اس لیے ایسے مذہب کا قلع قمع ہونا چاہیے۔ ہندو مت میں ذاتی ملکیت کھلم کھلا موجود ہے۔ اس لیے بنیرجی اس سبق کے بعد کچھ کھسیانا سا ہوگیا، کیونکہ وہ اب ہندو مت کی کبھی تائید اور حمایت نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر اس نے اسلام پر حملہ کرنا چاہا اور اس غرض سے مجھ سے پوچھا کیا اسلام ذاتی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔ میں نے جواب دیا ہاں دیتا ہے۔ اس پر اس نے اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دینے کو بڑے اطمینان سے کہا پھر تو ہم کو ہندوستان سے ہندوازم کے ساتھ اسلام کو مٹا دینا ہوگا۔ میں اس وقت اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا اس لیے اس سے میرے دل میں اسلام کے متعلق ذرا شبہ پیدا ہوگیا۔ شام کے وقت اپنی عادت کے مطابق ہوٹل لوکس جا کر میں قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بنیرجی کا اعتراض اور اسلام پر جو اس نے حملہ کیا تھا۔ اس کو ان کی خدمت میں عرض کیا اور اس کا جواب ان سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (توبہ) یعنی اللہ نے مومنوں کے مال کو اور ان کی جانوں کو ان سے جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کو اپنی جان اور ذاتی مال سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور ان کو خداوند کریم آخرت میں اس کے عوض جنت دے گا۔ یعنی اسلام میں ذاتی ملکیت کا اصول ضرورت کے وقت بالکل اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک ایسا مذہب نہیں جس میں

ذاتی ملکیت کے اصول کا ہمیشہ قائم رکھا جانا ضروری ہوتا اگر ضرورت پیش آتے اور زمانہ کا حال ایسا ہو جائے کہ اس میں ذاتی ملکیت قائم رکھنے کی وجہ سے مسلمان اپنے مذہب کو اور اپنے ایمان کو خطرے میں دیکھیں تو ذاتی ملکیت کے اصول سے دستبردار ہو سکتے ہیں اور اس اصول کو بدل سکتے ہیں۔ لہٰذا اسلام ایک قدامت پسند مذہب نہیں جو مالداروں کو بے مایہ گان کی استثمار (EXPLOITION) کی اجازت دے یا اس کا موقع دے قبلہ مولانا صاحب کی اس تفسیر سے مجھے بہت اطمینان ہوا اور میرا اسلام پر ایمان اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اس سے بنیرجی کو ایک ایسا جواب ملا کہ وہ لاجواب ہو گیا۔ ایک روز ہمارے پروفیسر نے کہا کہ سوویٹ نظام حکومت قائم کرتے ہوئے ہمیں سب سے زیادہ مخالفت کسانوں کی طرف سے پیش آئی، کیونکہ وہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر رکھنا چاہتے تھے اور زراعتی کومون (AGRICULTURAL COMMON) (یعنی مشترک ملکیت والی زراعتی کو اوپاریتیف) بنانا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی مذہب ان کو اس خیال سے ہٹانے کے لیے مذہبی احکام نہیں پیش کرتا۔ اس لیے سارے مذاہب رجعت پسند ہیں۔ لہٰذا صفحۂ ہستی سے مٹائے جانے کے لائق ہیں۔ سبق کے بعد شام کو ہوٹل لوکس جا کر میں نے پروفیسر کے اس نظریے کا قبلہ مولانا صاحب سے ذکر کیا اور پوچھا کیا اسلام بھی زمین کی ملکیت منفرد اشخاص کو دینا چاہتا ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ نہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ایران فتح کیا تو عرب فاتحین نے ایران کی زمینوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر ان پر قبضہ کرنا چاہا، کیونکہ انہوں نے اپنی قوت بازو سے ان کو حاصل کیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو ایسی اجازت نہ دی اور ساری زمینوں کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا اور فاتحین کو صرف ان زمینوں کی کاشت کا حق عطا فرمایا۔ میں نے اگلے روز یونیورسٹی میں حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا اور اس اسلامی قانون کا ذکر اپنے اسی پروفیسر سے کیا۔ اس پر وہ بہت اچنبھے میں پڑا اور کہنے لگا اگر

کوئی شخص ہم کو اسلام کے یہ احکام پہلے بتلاتا تو ہمارا کام بہت آسان ہو جاتا اور ہم کسانوں کو اپنی انقلابی صفوں میں بڑی آسانی سے داخل کر لیتے اور ہماری حکومت ان کی مخالفت سے بچی رہتی۔ (آپ بیتی ج۲ صنہ۳ تا ج۲ ص۴۲)

مولانا سندھیؒ کی سیاسی سوجھ بوجھ

مولانا سندھیؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو سیاسی سوجھ بوجھ عطا فرمائی تھی اور اس کے نتیجہ میں مولانا نے نہایت مشکل حالات میں برصغیر کی آزادی کے لیے جو کام کیے ہیں۔ وہ ان ہی کا حصہ ہیں۔ چنانچہ ماسکو کے قیام کے دوران مولانا سندھیؒ نے تین مرتبہ بڑی مشکل سے روسی وزیر خارجہ مسٹر چچرن (CHICHREN) سے ملاقاتیں کیں اور اسے اپنے مقصد کے لیے ہموار کیا۔ چنانچہ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ قبلہ مولانا صاحب نے انڈین نیشنل کانگرس (INDIAN, NATIONAL, CONGRESS) سے جو ان کا تعلق بحیثیت پریذیڈنٹ کانگرس کابل کے تھا (PRESIDENT, CONGRESS, KABUL) اس کا ذکر کر کے چچرن سے کہا کہ وہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کا قلع قمع کرنے کے لیے روس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں، لیکن یہ تعاون روسی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پارٹی کے بجائے روسی گورنمنٹ سے اس بارے میں گفتگو کر کے ایک سمجھوتے پر پہنچنا ان کا مقصد ہے۔ اس راستہ کی تمام مشکلات کا ذکر جناب ظفر حسن صاحب نے آپ بیتی میں تفصیل سے کیا ہے۔ مولانا جب روس سے ترکی پہنچے، تو وہاں بھی وہ اپنے کام میں مصروف رہے، ۱۹۲۴ء میں جو پروگرام مولانا نے برصغیر کی آزادی اور وہاں کے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے سلسلہ میں پیش کیا تھا۔ وہ اگرچہ ہندوستان میں ممنوع قرار دیا گیا تھا، انگریزوں نے اسے ہندوستان میں شائع نہیں ہونے دیا۔ وہ پروگرام آج بھی اپنی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ جب کہ برصغیر کو آزادی حاصل کرنے کے بعد چالیس سال

کا عرصہ گزر چکا ہے اور برِ صغیر کے باشندے انگریز کی غلامی سے آزاد ہو کر آپ امریکہ کی آغوش میں چلے گئے ہیں اور اس کے بعد مسلمانوں نے روس کی روش کا بھی پوری طرح تجربہ کر لیا ہے

نظام توافق

پارٹی ہندوستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندوستان میں واحد قومیت کو پیدا کرنے کی کوشش کو اساس زندگی مانے گی، بلکہ ملک میں نظام توافق (فیڈرل سسٹم) پر حکومت قائم کرے گی جس کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی تین قدرتی حصّوں سے متشکل ہونے کی وجہ سے ان حصّوں کو ایسے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا، جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو اور جہاں ایک ہی قسم کے رسم و رواج اور ایک ہی تمدن رکھنے والے لوگ آباد ہوں۔ ان صوبوں کو بعد میں ایک (جمہوری ملک) قرار دیا جائے گا جس کی جمہوری حکومت کو معاملاتِ خارجہ، معاملات جنگ اور خارجی تجارت کے سوا اپنے تمام اُمور پر اختیار حاصل ہو گا۔ (مثلاً اس طرح شمال مغربی ہندوستان) (مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور گجرات، جیسے جمہوری ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ مشرقی اور جنوبی ہندوستان بھی اسی طرح کے جمہوری ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ جمہوری ملک مرکزی وفاقی (فیڈرل) حکومتِ ہند میں شامل ہونے سے پہلے اگر چاہیں تو اپنے تمدن اور رسم و رواج کی وحدت کی بنا پر باہم مل کر خود ایک دفاقی نظام میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان آپس میں مل کر اور ایک دفاقی نظام بنا کر مرکزی حکومت ہند میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور جنوبی ہند کی جمہوری حکومتیں اگر چاہیں باہم مل کر، مرکزی حکومت میں داخل ہو سکتی ہیں۔

مجلس قانون سازی

ان جمہوریتوں میں ہر عاقل بالغ مرد اور عورت کو حق انتخاب دیا جائے گا، لیکن ہر اجتماعی طبقہ (SOCIAL CLASS) یعنی کسان، مزدور، دماغی کام کرنے والے لوگ تاجر اور کارخانہ دار، مجلس قانون سازی میں اپنی آبادی کے تناسب سے اور اپنے ہی طبقے سے نمائندے چنے گا۔ اس طرح ان جمہوریتوں کی پارلیمنٹ میں کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت ہو گی اور یہ مجلس محنت کشوں کے مفاد کی حفاظت کر سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی بنیادی اصول

فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دے دیے جائیں گے۔ انفرادی اور ذاتی ملکیت (منقولہ اور غیر منقولہ) محدود کر دی جائے گی (یعنی معین حد سے زیادہ جائیداد اور مال قومی ملکیت ہو گا۔ مال داروں پر متزائد ٹیکس لگایا جائے گا جس کی آخری حد (۵۰) فی صدی ہو گی۔ ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں گی اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا۔ (ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی پارٹی فاروق اعظمؓ کے فیصلہ کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابو حنیفہؒ کے فیصلہ کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کرے گی) ہر کاشت کار خاندان کو اس قدر زمین ضروری دی جائے گی جس قدر کہ وہ خود کاشت کر سکے۔ سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائے گا اور محنت کش طبقہ کے پرانے قرض بے باک کر دیے جائیں گے۔ قومی ملکیت میں دیے ہوئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعے چلایا جائے گا اور مزدوروں کو نفع میں سے حصہ دیا جائے گا۔ محنت کش طبقہ کو مفت طبی امداد دی جائے گی اور اس کے لیے

ستھ سے گھر مہیا کیے جائیں گے۔ ابتدائی اور مڈل سکولوں کی تعلیم جبری اور مفت ہو گی۔ داخلی تجارت کوآپریٹو (COOPERATIVE) سوسائٹیوں کے ہاتھوں میں ہو گی، لیکن سوداگران کوآپریٹو سوسائٹیوں میں داخل ہو کر ان کے ممبر بن سکیں گے۔ خارجی تجارت مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہو گی۔ ہر ایک جمہوریت اپنی اکثریت کے مذہب کو اپنا سٹیٹ مذہب قرار دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مذہبی پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کا مخالف نہ ہو۔

مرکزی حکومت وفاقی جمہوریت

CENTRAL GOVERNMENT OF THE FEDERAL REPUBLICS

مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو گا اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق ہو گا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں (یعنی مرکزی حکومت ایک سیکولر حکومت ہو گی) مرکزی حکومت خارجی اور جنگی معاملات اور خارجی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔ مختلف جمہوریتیں مرکزی حکومت میں اپنے تناسب آبادی، اقتصادی تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حق نمائندگی حاصل کریں گی۔

بین المللی تعلقات

ایمپیریلزم کو توڑنے اور ایشیا میں مندرجہ بالا اصولوں پر آزاد حکومتیں قائم کرنے کے لیے ایشیاٹک فیڈریشن بنائی جائے گی جس میں روس کو بھی شامل کیا جائے گا (اس زمانے میں روس نے اپنی موجودہ ایمپیریلسٹ سیاست قائم نہ کی تھی۔ اگرچہ اس نے استبدادی حکومتوں کا قلع قمع کرنے کے بہانے سے بخارا اور خیوا پر اپنے پٹھو مسلمان کمیونسٹوں کے ذریعے قبضہ کر لیا تھا لیکن ان کو اور آذربائیجان اور ترکستان کی جمہوریتوں کو خارجی ملکوں میں سفیر بھیجنے کا اختیار دے رکھا تھا) روس کو ایشیاٹک فیڈریشن میں

شامل کرنے میں یہ مقصد مدِنظر تھا کہ اس سے انگریزی ایمپریلزم کے خلاف مدد لی جائے گی اور اس آزادی کے بعد ہندوستان کے معاملات میں، محنت کشوں کی حمایت کے بہانے سے دخل اندازی کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ مندرجہ بالا خلاصے سے قارئین کرام کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پروگرام کے ذریعہ (مذہبی سوال کو درمیان لائے بغیر) ہندوستان میں رہنے والی اقلیتوں کی ہستی کو محفوظ کرنا اور ہندوستان کے ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک جگہ جمع کرنا اور ان علاقوں میں اسلام کو سرکاری مذہب بنانا اور مسلمانوں کا ہندوستان کے اندر رہ کر اپنی ہستی اور اپنی تہذیب کو محفوظ رکھنا ممکن تھا ۱۹۲۴ء میں جب یہ پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی فضا اور ہندو مسلم تعلقات اتنے خراب نہ تھے جیسے کہ ۱۹۳۰ء میں اور بعد میں نئی اصلاحات ملنے پر ۱۹۳۷ء میں ہو گئے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے بالکل جدا ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود، قبلہ مولانا صاحب نے دور اندیشی سے ۱۹۲۴ء ہی میں ہندوستان کے لیے ایک ایسا وفاقی نظام (فیڈرل نظام) (FEDERAL SYSTEM) تجویز کیا تھا جس میں مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والی جمہوریتوں کو باہم مل کر اور ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو کر ہندوستان کی مرکزی حکومت میں شامل ہونے کا موقع ملتا اور اس طرح وہ اپنی ہستی اور اپنی تہذیب قائم رکھ سکتیں۔ نیز ان کو مرکزی حکومت میں ان کی سیاسی اور فوجی اہمیت اور تناسب آبادی کے مطابق نمائندگی کا حق دینا تجویز کیا گیا تھا۔

پروگرام کا چھپوانا

یہ پروگرام اردو میں مرتب ہونے کے بعد، ہم نے اس کو استنبول میں چھپوایا لیکن چونکہ ترکی زبان میں (ٹ) (ڈ) (ڑ) اور (یائے مجہول) کے حرف نہیں ہیں۔ اس لیے ان حرفوں کی بجائے علی الترتیب (ت)، (د)، (ر) اور (یائے معروف) استعمال کی گئی۔

جس سے اس پروگرام کے پڑھنے میں اردو والوں کو ذرا مشکل ہوتی ہے۔ میں نے پروگرام کا ترجمہ انگریزی میں کرکے احمد مختار بک کو جو ماسکو کی ترکی سفارت کے کام سے سبکدوش ہوکر استنبول آ گئے تھے دیا۔ انہوں نے اس کا ترجمہ ترکی میں اپنے بھائی (اورخان تحسین بک) سے جس کو میں نے ماسکو میں ان کے پاس دیکھا تھا کرایا۔ یہ ترکی ترجمہ ہم نے احمد مختار بک کے ذریعہ وزارتِ خارجہ ترکی کو بھجوایا، تاکہ ترکی گورنمنٹ کو قبلہ مولانا صاحب کے سیاسی اصول کا پتہ چل جائے اور اس کو ہماری طرف سے اطمینان ہو جائے کہ ہم ترکی کے داخلی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں اور صرف اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔

پروگرام کا ہندوستان بھیجا جانا

پروگرام چھپ جانے کے بعد اس کا ہندوستانی لیڈروں تک اور دوسرے سیاسی کارکنوں تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس کو ہندوستان بھیجنے کے لیے صرف دو طریقے ہو سکتے تھے۔

(۱) ترکی جانے والے قابلِ اعتماد ہندوستانیوں کے ہاتھ اس کو خفیہ طور پر ہندوستانی لیڈروں کو پہنچایا جاتے اور پروگرام کو پہنچانے والوں کے اخراجات ان کو دیئے جائیں

(۲) ڈاک کے ذریعے ان کی کاپیاں مختلف لوگوں کو بھیجی جائیں۔ اس وقت نہ قبلہ مولانا صاحب کے پاس نہ میرے پاس اتنا پیسہ تھا کہ اس پروگرام کو کسی قابلِ اعتماد آدمی کے ہاتھ خفیہ طور پر ہندوستان بھیج سکیں۔ اس لیے قبلہ مولانا صاحب نے مجبور ہو کر عزیز احمد صاحب کے ذریعہ روسی قونصل خانہ سے (۱۰۰) پونڈ حاصل کیے۔ یہ روپیہ سو پونڈ کے ایک انگریزی نوٹ کی صورت میں تھا۔ عزیز احمد صاحب نے اس کو اپنے بکس میں بند کرکے ہندوستانی خانقاہ کے اس کمرہ میں رکھ دیا جس میں قبلہ مولانا صاحب رہا کرتے

تھے (آپ بیتی صفحہ ج ۲ ۱۰۵ تا صفحہ ج ۲ ۱۱۱)

مولانا سندھیؒ جب روس سے ترکی پہنچے تو وہاں بھی اپنے کام سے غافل نہیں رہے۔ ایک جدید کمالی ترکی کا مطالعہ اور مولانا ترکی میں ایک اسلامی یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ مصطفیٰ کمال اور اس کے رفقاء نے اس کی اجازت نہ دی۔ مولانا مایوس ہوئے اور ایک بات یہ بھی تھی کہ مولانا ترکی کی جدید نسل کو الحاد ولامذہبیت سے بچانے کے لیے مصطفیٰ کمال کو مشورہ دیتے تھے کہ مولانا کا مرتب کردہ قرآن کی چالیس سورتوں کا پروگرام اپنے نوجوانوں کی تعلیم میں شامل کرلیں کہ نئی نسل الحاد ولامذہبیت و بے دینی سے بچ جائے لیکن اس کو بھی ترکی نے قبول نہ کیا، چنانچہ ترکی جدید الحاد ولامذہبیت کی تمام منزلوں سے گزر کر آج بھی اپنے مقام کی طرف نہیں لوٹ سکا۔ مولانا کے ترکی پہنچنے کے بعد ظفر حسن صاحب بھی ترکی پہنچے اور انہوں نے وہاں کچھ اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور ترکی قومیت اختیار کر گئے۔ وہاں ہی ملازمت اختیار کرلی اور آخر دم تک ترکی کی خدمت کرتے رہے۔ ظفر حسن صاحب نے مولانا شبلی نعمانیؒ کی سیرۃ النبیؐ اور الفاروق کو ترکی کی زبان میں منتقل کرنے میں مدد دی۔ وہاں ہی شادی کی اور فوجی کیپٹن کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر زندگی کے ایام ترکی میں بسر کیے۔ سُنا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں وفات پاگئے ہیں۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ظفر حسن صاحب نے حضرت مولانا سندھیؒ کی رفاقت میں بڑا وقت گزارا اور ان سے دینی تعلیم حاصل کی اور قرآن کریم پڑھا، حکمت ولی اللٰہی کا کچھ حصہ سیکھا۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح ترکی روس میں رہتے ہوئے جس طرح انہوں نے تعلیم حاصل کی اور اس کے ساتھ اپنے دینی فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ وہ بھی تاریخ کا ایک بے مثال حصہ ہے۔

ترکی میں اصلاحات اور کمالسٹ (KEMALIST) انقلاب

سلطنت عثمانیہ سنہ ۱۳۰۰ء میں ترکی سلطان عثمان خان غازی کی طرف سے قائم کی گئی تھی۔ یہ سلطنت ۱۹۲۲ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی جمہوریت قائم ہونے پر ختم ہو گئی۔ ان چھ صدیوں میں جتنے سلطان (آخری دو سلطان مستثنیٰ) تخت پر بیٹھے سب کے سب مطلق العنان بادشاہ تھے۔ جن کی کوئی مجلس مشورت نہ تھی، حالانکہ اسلام "شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" (حکومت کے کاموں میں ان سے مشورہ کرو) کا حکم دیتا ہے سلطان مراد خان ثانی (۱۴۵۱ - ۱۴۲۱ء) کے زمانے میں باب مشیخت کے نام سے شیخ الاسلام کا محکمہ قائم ہوا اور پہلا قاضی جس کو شیخ الاسلام کا درجہ ملا (ملا شمس الدین) تھا۔

شیخ الاسلام کو مذہبی مسائل کے بارے میں فتویٰ دینے کا اختیار تھا اور اگر کبھی سلطان کی بدانتظامی کی وجہ سے لوگوں میں اور فوج میں اس کے خلاف بغاوت ہو تو شیخ الاسلام سلطان کو تخت سے اتارنے کے لیے مذہبی احکام کی بنا پر فتویٰ دے دیا کرتا تھا۔ ترکی میں انیسویں صدی کے آخری نصف میں شرعی قوانین حنفی فقہ کے مطابق (مجلہ قوانین شرعیہ) کے نام سے مرتب کیے گئے اور شرعی عدالتوں میں قاضیوں کے ذریعے نافذ کیے جاتے تھے۔ یہاں بعض احکام دینی کی پابندی تو بڑی سختی سے ہوتی تھی اور بعض احکام کی سخت پابندی کی ایک مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اعلانیہ رمضان کے مہینے میں کھاتے پیتے یا سگریٹ کشی کرے تو اس کو سزا کے طور پر کوڑے لگائے جاتے تھے، لیکن اس کے خلاف لوگوں میں شراب خوری کی عادت بہت زیادہ تھی یہاں تک کہ بعض سلطان خود بھی شراب خوری کیا کرتے تھے۔ سلطان، اس کے امراء اور مالدار لوگ چار منکوحہ بیویاں رکھتے تھے۔ حالانکہ اسلام صرف بعض خاص حالات میں اور بیویوں میں عدل و انصاف قائم رکھنے کی شرط پر تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے۔ (وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا

فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (سورۃ نساء آیت؟)

اگر انصاف و عدل کا قیام ممکن نہ ہو (کہ بشر کے لیے پورا عدل کرنا ممکن ہے)، تو فقط ایک بیوی کی اجازت ہے۔ اس کے سوا امیروں کے گھروں میں باندیاں بھی ہوتی تھیں جن کو غلاموں کے بازار سے خرید کر وہ اپنی داشتہ بنا لیتے تھے۔ یہ بھی سراسر ایک غیر اسلامی رواج ہے، کیونکہ باندی صرف جنگی قیدیوں میں سے ہونی چاہیے۔ ملک میں مذہبی تعصب اتنا تھا کہ علماء نے قرآن شریف کا ترکی میں ترجمہ کرنا ناجائز قرار دے دیا تھا، حالانکہ ہندوستان میں قرآن شریف کا فارسی ترجمہ اٹھارویں صدی عیسوی میں چھپا اور اس کے بعد اردو میں متعدد ترجمے کیے گئے تھے۔ ترکی میں قرآن شریف کا ترکی ترجمہ صرف بیسویں صدی عیسوی میں چھپا اور اس کی بھی ملاؤں نے بہت مخالفت کی۔ یورپ میں ۱۴۵۰ء میں جرمنی میں (JOHANNES) نے (GOTENBERG TYPOGRAPHY) کے اصول پر چھاپہ خانہ ایجاد کیا، لیکن ترکی میں جس کا آدھا ملک یورپ کی سرزمین میں تھا اور جس کو اس ایجاد سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، علماء نے اس چھاپہ خانے کے کھولنے کی مخالفت کی۔ دنیائے اسلام کے عالموں نے اجتہاد کا دروازہ تو پہلے ہی سے بند کر دیا تھا جس سے مسلمانوں میں زمانے کی رفتار کے مطابق نئے خیالات اور فلسفے جاری ہونے اور احکام میں زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں کرنے کا امکان باقی نہ رہا تھا اسی سبب سے عالمِ اسلام پر ایک جمود طاری ہو گیا اور یہی جمود ترقی کی دوڑ میں ان کے دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کا باعث بنا۔ ترکی کے علماء کے تجدد اور ترقی روکنے والے رویے نے نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف بہت بُرے خیالات پیدا کر دیے۔ افسوس یہ ہے کہ ترکی میں شاہ ولی اللہؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے پایہ کا کوئی جید عالم پیدا نہیں ہوا۔ ترکی میں وقتاً فوقتاً نوجوان

تعلیم یافتہ لوگوں نے سلطان کے مطلق العنان اختیارات کو ذرا کم کرنے اور ملک میں دستوری حکومت بنانے کی کوششیں کیں۔ مثلاً ۱۸۷۶ء میں وزیرِ اعظم مدحت پاشا نے سلطان عبدالحمید خان ثانی کو پارلیمنٹ بنانے پر مجبور کیا، لیکن اس نے جلد ہی پارلیمنٹ توڑ دی اور مدحت پاشا کو مکہ معظمہ کے نزدیک طائف میں جلا وطن کر دیا۔ آخر کار نوجوان ترکوں نے جن کے لیڈر طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا تھے جمعیت اتحاد و ترقی قائم کی اور ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید خان ثانی کو دستوری حکومت بنانے پر مجبور کیا۔ لیکن ۱۳ مارچ ۱۹۰۹ء کو ملاؤں نے لوگوں کو بھڑکایا اور پارلیمنٹ کے توڑنے کا مطالبہ کیا۔ جمعیت اتحاد ترقی نے اس بغاوت کو فرو کر کے سلطان کو تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ سلطان محمد رشاد خان کو ایک دستوری بادشاہ (CONSTITUTIONAL MONARCH) کے طور پر تخت پر بٹھا دیا، لیکن سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ ملک خارجی قرضوں میں ڈوبا ہوا تھا، یہ قرضے اتنے زیادہ تھے کہ ان کی ادائیگی باقاعدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے حکومت ملک کے مختلف ذرائع آمدنی کو مثلاً کسٹمز کے محصول کو یورپین قرض خواہ حکومتوں کو رہن کرنے پر مجبور ہو گئی ہے غیر ملکی لوگوں کو اتنی رعایات دی گئی تھیں کہ ان کے مجرموں کے مقدمے بھی ایسی خاص عدالتوں میں چلتے تھے جن کے جج غیر ملکی ہوتے تھے اور قانون بھی غیر ملکی نافذ کیا جاتا تھا۔ غرض غیر ملک کے باشندوں کو جو ترکی میں رہتے تھے۔ ایسے حقوق اور امتیاز حاصل تھے کہ ترک اپنے ملک کے مالک بھی نہ سمجھے جاتے تھے۔ اس وجہ سے ترکی کو یورپ کا "مردِ بیمار" کہا جاتا تھا جس کی موت کا سارا یورپ منتظر اور اس کی میراث کو لوٹنے پر تُلا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس شروع ہو گئی اور اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ جنگ بمشکل ختم ہوئی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان چھڑ گئی اور بلقانی قوموں نے زارِ روس اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور باغیوں کی ہمت افزائی کرنے کی وجہ سے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سر اٹھایا۔ اس جنگ

میں ترکی کا تقریباً سارا یورپین حصہ سلطان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد ترکی نے اپنی فوج کو جرمن افسروں کی مدد سے نئے سرے سے منظم کیا، لیکن یہ کام ابھی بمشکل پورا ہوا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عمومی چھڑ گئی اور جرمنوں نے ترکوں کو اس جنگ میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد چار سال تک ترکوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے اپنا خون بہایا۔ ایک طرف درہ دانیال میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑوں کو یہاں سے گزر کر استنبول پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھنے لگے تھے۔ ۱۸ مارچ 1915ء کو شکست دی اور ۱۹۱۶ء میں گیلی پولی میں انگریزی فوجوں کو جو خشکی کے راستے استنبول تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ پسپائی پر مجبور کیا۔ دوسری طرف عراق میں قوط العمارہ کے مقام پر ۱۹۱۶ء میں انگریزی فوجوں کو محاصرہ میں لے کر ان کے کمانڈر جنرل ٹاؤنشنڈ (TOWNSHEND) کے ساتھ سب کو پکڑ لیا۔ جنوب میں انہوں نے سینا کے صحرا سے گزر کر (غزہ) کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دی اور نہر سویز کو عبور کر کے مصر کی سرزمین پر پاؤں رکھنے میں کامیاب ہوئے، لیکن اس کے رسل و رسائل کے راستے بہت لمبے ہوگئے اور ان کو بے آب و دانہ صحرا میں سے گزرنا پڑا اس وجہ سے ان کو بروقت نہ رسد کا سامان پہنچ سکا اور نہ امداد بر وقت مل سکی۔ اس لیے ان کو مصر سے لوٹنا پڑا۔ مشرق میں روس کے خلاف قفقاس کے برف پوش پہاڑوں میں لڑائیاں لڑیں اور روسی فوجوں کو (کوہ اللہ اکبر) میں شکست دی۔ یورپین محاذ پر آسٹرین فوجوں کی مدد کے لیے جو روسیوں کے حملوں کی وجہ سے کوہ (CARPACHIAN) میں پاؤں نہ جما سکیں تھیں۔ ایک ترکی ڈویژن بھیجا گیا جس نے وہاں پہنچ کر آسٹرین فوجوں کی پسپائی کو پیش قدمی میں بدل دیا۔ غرض ترک اس طرح چار سال تک مختلف محاذوں پر انگریزوں، فرانسیسیوں اور روسیوں جیسے طاقتور دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے رہے جن کے پاس ہندوستان شمالی افریقہ اور ترکستان کے خزانے اور بے انتہا انسانی ذرائع موجود تھے۔ آخرکار ایک طرف شریف مکہ اور شام کے عربوں کی بغاوت اور دوسری طرف

آسٹریا اور بلغاریہ کے متارکہ کر لینے پر ترک بھی جرمنی کی طرح ۱۹۱۸ء میں صلح پر مجبور ہو گئے۔ جس کے باعث اماکن مقدسہ ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور ان پر (سیورے) کے معاہدہ کے مطابق ایسی شرطیں لگائی گئیں کہ (۶۰۰) سالہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کا الزام یہاں جمعیت اتحاد و ترقی پر لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے جرمنی کی وجہ سے ملک کو لڑائی کی آگ میں دھکیل دیا تھا اور ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک کے زمانے میں اپنے خراب ارادے کی وجہ سے ترکی قوم کی ہستی کو بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ جمعیت اتحاد و ترقی کی ناکامی کی وجہ صرف اس کے ارادے کی خرابی ہی نہیں۔ اس کے طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا جیسے لیڈر نہایت ہی مخلص، دیانتدار، نیک نیت اور وطن پرور تھے لیکن ان کا میدان سیاست میں ناتجربہ کار ہونا اور انگریزوں، فرانسیسیوں اور زار روس کا ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے سازشیں کرنا انیسویں صدی میں سلطانوں کی تن پرستی اور فضول خرچی کی وجہ سے ملک کا مالی طور پر کمزور ہو جانا ایسے اسباب تھے کہ یہ جانثار لوگ اپنی نیک نیتی کے باوجود ملک کو تباہی سے نہ بچا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے ۱۶ مارچ ۱۹۱۹ء کو استنبول پر قبضہ کر لیا اور یونانیوں کو سلطنت بزنطین (BYZANTINE) دوبارہ زندہ کرنے کا وعدہ دے کر بندرگاہ سمرنا (ازمیر) پر اترنے اور اناطولیہ (ایشیائے کوچک) پر حملہ آور ہونے پر راضی کر لیا فرانس اور اٹلی نے ترکی کے جنوبی علاقوں پر قونیہ تک قبضہ کیا اور شمال میں آرمینیوں نے قفقاس سے نیچے اتر کر ترکی کے (قارص) اور (اردھان) کے دو صوبوں کو ہتھیا لیا۔ غرض ۱۹۱۹ء میں ترکی اس ناگفتہ بہ حالت میں تھا کہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک آزادی کا علم بلند کرنے کے لیے ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو بحر اسود کے کنارے اناطولیہ کی بندرگاہ (صامسون) (SOMSUN) پر اترے۔ ان کے پاس نہ باقاعدہ فوج تھی اور نہ ہتھیار اور نہ توپ خانہ۔ ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ لیڈروں اور ڈاکوؤں کی دستبرد سے

لوگ بے زار ہو چکے تھے خلیفۃ المسلمین سلطان وحید الدین جو ۱۹۱۸ء میں جنگ کے خاتمے سے پہلے سلطان محمد رشاد خان کی وفات پر تخت پر بیٹھا۔ استنبول میں انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس نے غازی مصطفیٰ کمال پاشا، اتاترک کو باغی قرار دے کر اس کی تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لیے ۱۹۲۰ء میں فوج خلافت روانہ کی تھی۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے اس بے سروسامانی کے باوجود تین سال اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف اپنا سینہ سپر کیا اور آخر کار ۳۰ راگست ۱۹۲۲ء کو یونانی فوجوں کو ردُو ملوُر نیار) کے میدان جنگ میں ایسی شکست فاش دی کہ ان کے لیے سرزمین (اناطولیہ) کو چھوڑ کر بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ ان کا کمانڈر انچیف جنرل (ٹرِیکو پوس) بھی ترکوں کے ہاتھ جنگی قیدی بنا اور ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترکی فوجیں سمرنا (ازمیر) میں داخل ہوگئیں۔ بریں وجہ خلیفۃ المسلمین سلطان وحید الدین نے ۱۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو انگریزی جنگی جہاز (ملایا) پر پناہ لی اور ترکی سے فرار ہوگیا۔ اس طرح اس نے اپنے آباؤ اجداد کے نام پر جنہوں نے یورپ کے کئی ملکوں کے شہزادوں اور بادشاہوں کو اپنے زمانے میں تاج و تخت بخشے تھے۔ انگریزوں کے پاس پناہ لے کر ایک ایسا دھبہ لگایا جس کا ذکر کرتے ہوئے آج بھی ایک مسلمان کو شرم آتی ہے۔ ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر انگریز اور ان کے اتحادی ۲ راکتوبر ۱۹۲۳ء کو استنبول کو خالی کرنے پر مجبور ہو گئے اور ۶ راکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی فوجوں نے استنبول پر پھر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کے ذریعہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے ملک کو غیروں کے پنجے سے تو چھڑا لیا، لیکن اب ان کو ایسے عظیم الشان اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن کا حل پرانے اصولوں پر ناممکن تھا۔ وہ اب ترکی کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش چلانے پر مجبور ہوئے، ورنہ جنگی فتح کے باوجود ملک مالی اور اقتصادی طور پر غیروں کا غلام بن جاتا۔ اس لیے انہوں نے ملک کے سب اداروں میں جبری (RADICAL) اصلاحات کا جاری کرنا ضروری سمجھا۔ انہوں نے سب سے پہلے۔

(۱) ترکی میں مذہبی دستوری بادشاہت۔

(THE RELIGIOUS CONSTITUTIONAL MONARACHY) کی بجائے
جمہوری نظام قائم کیا۔ جس سے سیاست کو مذہب سے بالکل جدا کر دیا گیا۔ یعنی ایک لادینی
حکومت قائم کی گئی جس میں لوگوں کو مذہبی آزادی دے دی گئی اور حکومت کو لوگوں کے عقائد میں
دخل دینے سے روک دیا گیا۔ اس جمہوریت کے پہلے صدر غازی مصطفیٰ کمال پاشا چنے گئے۔
(۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء)

(۲) مذہبی امور کے لیے صدارت عظمیٰ کے ماتحت ادارہ امور شرعیہ کے نام سے ایک الگ
ادارہ بنایا اور جدید خیال کے علماء پیدا کرنے کے لیے یونیورسٹی استنبول میں الہیات فیکلٹی
(FACULTY OF) قائم کی، جہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو D.D یعنی
(DOCTOR OF DIVINITY) ڈگری ملتی ہے لیکن اس میں غلطی یہ ہوئی کہ اس فیکلٹی
کے پاس شدہ عالموں کو اتنی تنخواہیں نہ دی گئیں جتنی کہ یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کے
پاس ہونے والوں کو ملتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں کی الٰہیات فیکلٹی کے لیے رغبت نہ
رہی اور اس وجہ سے یہ فیکلٹی آخر کار بند ہو گئی۔ اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچا کیونکہ
لوگوں کو مذہبی تعلیم دینے کے لیے اچھے تعلیم یافتہ اور روشن خیال عالم نہ ملے۔ وہی دقیانوسی
خیالات ملا شہر اور گاؤں میں لوگوں کو طرح طرح کی بدعتیں اسلامی احکام کے نام سے سکھاتے
رہے۔ اس وجہ سے حکومت کے خلاف متعدد جگہ بغاوتیں ہوئیں اور جیسا کہ آگے چل کر
تفصیل سے لکھوں گا۔ مشرقی ترکی میں۔ شیخ سعید نے کردوں کو حکومت کے خلاف
ابھارا اور بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ اب الہیات فیکلٹی پھر کھل گئی ہے۔

(۳) محکمہ تعلیم کو بالکل جدید اصولوں پر منظم کیا اور پرانے اصولوں کے مدرسے بند کر دیے۔

(۴) تعدد ازدواج کو خلاف قانون قرار دیا۔

(۵) عورتوں کو مردوں کی طرح پارلیمنٹ کے نمائندے انتخاب کرنے اور پارلیمنٹ کا

ممبر بننے کا حق دیا گیا۔ ان کو مردوں کے برابر تعلیم، کام اور نوکری حاصل کرنے کا موقع دیا۔ جس سے کنبے کی آمدنی بڑھی۔

(۶) شرعی محکموں کی بجائے دنیا کے دوسرے مہذب ملکوں کی طرح سول عدالتیں قائم کیں۔

(۷) مجلہ قوانین شرعیہ کی بجائے ملک میں سوئٹزرلینڈ کا سول قانون جاری کیا، لیکن اس میں غلطی یہ ہوئی کہ اس کے احکام کو ملک کی ضروریات اور قوم کی صلاحیتوں کے مطابق بنانے کے لیے اس میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ (بعد میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔)

(۸) یورپین لباس کا پہننا اور ترکی ٹوپی (فس) کی بجائے ہیٹ لگانا لازم کر دیا۔

(۹) قوم کی تعلیمی پس ماندگی کو جلد از جلد دور کرنے کے لیے اور ان پڑھ لوگوں کو جلد پڑھا لکھا بنانے کے لیے ترکی حرفوں یعنی (عربی رسم الخط) کی بجائے رومن حروف کا استعمال منظور کیا۔

(۱۰) خلیفہ کا استنبول میں پرانی شان اور دبدبہ دکھلانے کی وجہ سے ملک میں افراتفری کے ڈر سے (دو بادشاہ دریک اقلیمے نمی گنجند یعنی ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے) کے قول کے مطابق خلیفہ عبدالمجید خان کو ملک بدر کر دیا اور خلافت توڑ دی (۳ مارچ ۱۹۲۴ء) غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے جب خلافت توڑ دی، تو ۱۹۲۴ء کی گرمیوں کے آخر میں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ڈاکٹر انصاری ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ان کے لیے یہ پیغام لائے کہ وہ خلافت کو بالکل نہ توڑیں، بلکہ خود خلیفہ بن جائیں، لیکن انہوں نے اس تجویز کو منظور نہ کیا، کیونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ پہلی جنگ عظیم میں عربوں کی بغاوت اور ہندوستانی اور روسی مسلمان فوجوں کے انگریزوں اور روسیوں کے زیر کمان ترکوں کے خلاف لڑنے کی وجہ سے اور جہاد کے فتوے کا جو ۱۹۱۵ء میں خلیفۃ المسلمین سلطان محمد رشاد خان نے دیا تھا۔ عالم اسلام پر اثر نہ ہونے سے اس کے قائل ہو گئے تھے کہ

خلافت ترکی کے لیے فائدے کی بجائے نقصان کا ذریعہ ہے۔ اس کے سوا ان کو یہ ڈر تھا کہ یورپین طاقتیں، ترکوں کے عالم اسلام کا اخلاقی لیڈر ہونے سے ان کی پھر دشمن بن جائیں گی۔

(۱۱) ترکی کا پرانا رسم الخط (یعنی عربی حروف) کی بجائے رومن حروف منظور کیے گئے۔

(۱۲) اس نئے نظام کو چلانے کے لیے جس کے ذریعے ترکی کو ایک ترقی یافتہ اور مہذب ملک بنانا منظور تھا۔ ایک سیاسی پارٹی جمہوریت خلق پارٹی یعنی (PEoDIES (REPUBLIAN PARTY قائم کی گئی۔ اس کی لیڈری خود غازی مصطفیٰ کمال پاشاہ اتاترک نے اپنے ذمہ لی۔ ان اصلاحات میں سے جن کو یہاں (کمالسٹ انقلاب کہا جاتا ہے) ترکی رسم الخط کا بدلا جانا ایک بہت ہی اہم تبدیلی تھی اس لیے یہاں ذرا تفصیل سے بحث کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ترکی رسم الخط بدلنے کی وجوہ

ترکی زبان ۱۹۲۸ء تک عربی حرفوں میں لکھی جاتی تھی ترکوں نے ان حروف کو خوش خط لکھنے میں اتنی ترقی کی تھی کہ کسی اسلامی ملک میں عربی حروف اتنی دل افروز شکل میں نہ لکھے جاتے تھے۔ میں نے عربی ملکوں میں دیکھا کہ خود عرب بھی اپنے حرفوں کو اتنی خوش خطی سے نہیں لکھتے جتنے کہ ترک لکھتے ہیں، ترکوں نے (محمد اسد لیساری) (طغرا کش حقی) (احمد شوقی) اور (حافظ عثمان) جیسے نامور خوش نویس پیدا کیے۔ جنہوں نے نستعلیق نسخ اور ثلث جیسے مختلف خطاطی کے طریقوں میں یدِطولیٰ حاصل کیا اور جن کے لکھے ہوئے لوحے (یعنی جلی حرفوں میں کاغذ پر تحریر شدہ اور چوکھٹے میں جڑی ہوئی آیاتِ قرآنی حدیث نبویؐ اور مشہور بیت وغیرہ) آج بھی ترک گھروں کے کمروں اور بیٹھکوں میں لگائے جاتے ہیں اور ترکوں کی مذہبی عقیدت کا ثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب کہ

یہاں کمروں میں فوٹو گراف لٹکانا مذہباً ناجائز مانا جاتا تھا۔ یہ لوحے کمروں کی سجاوٹ کے لیے بھی کام آتے تھے۔ ترکوں نے نہ صرف پتھر کے چھاپے خانوں (LITHOGRAPHY) کے لیے عربی حروف کی نستعلیق خطاطی کو ترقی دی بلکہ (TYPOGRAPHY) کے لیے بھی جو حروف نسخ کے اصول خطاطی کے مطابق ڈھلوائے وہ بھی نہایت ہی حسین تھے۔ اسی طرح ان کے (TYPEWRITER) کے حروف بھی ایسے موزوں تھے کہ ابھی تک کسی دوسرے اسلامی ملک میں جس نے عربی حرفوں کے ٹائپ رائٹر بنوائے ہیں۔ ایسے خوبصورت حرف نہیں دیکھے گئے ہیں۔ مگر ان خوبیوں کے باوجود اردو کی طرح ترکی زبان میں بھی لفظوں کے ساتھ زبر، زیر اور پیش نہ لکھے جانے کی وجہ سے بچوں اور نوآموز بالغوں کے لیے لفظوں کا صحیح تلفظ سیکھنا محال ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر (کشتی) کا لفظ لیجئے۔ اس کو (کُشتی) اور (کَشتی) دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ (مرد) کو (مَرد) اور (مُرد) یعنی مرگیا اور مردم کو مَردم اور (مُردم) (میں مرگیا) اور (محرم) کو (مُحَرّم) اور (محرم) یعنی خفیہ (مَحرم) کو مُکرّم اور (مُکرَم) اور ظفر کو (ظَفَر) یا (ظُفُر) یعنی پنجہ اور ددر کو (دُدر یا دَدر (یعنی چکر) پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ان الفاظ کو مختلف طور پر پڑھنے سے ان کے فقرے کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ اس وجہ سے نوآموزوں کے لیے لکھنا پڑھنا بہت محال ہو جاتا ہے۔ ان حرفوں میں دوسری مشکل یہ ہے کہ (TYPOGRAPHY) میں ہر حرف کی لفظ کے شروع میں، بیچ میں اور آخر میں آنے کے مطابق علیحدہ علیحدہ شکلیں بن جاتی ہیں اس سے بچوں کو ہر حرف کی تین تین شکلیں جدا جدا یاد کرنی پڑتی ہیں اور چھاپے خانے میں حرفوں کی ترتیب دینا (یعنی COMPOSE) کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ ان مشکلات کی وجہ سے ترکی میں سلاطین کے زمانے میں لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی تعداد صرف (۱۰) فی صدی تھی۔ حالانکہ ترکی کے لیے زندگی کی جدوجہد اور ترقی کی دوڑ میں دوسری یورپین قوموں کے ساتھ دوش بدوش رہنے کے لیے ضروری تھا کہ لوگوں کو جلد از جلد لکھنا پڑھنا

سکھلایا جائے اور تعلیم کو عام کیا جائے۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں سپاہیوں کو لکھنا پڑھنا آسانی سے سکھلانے کے لیے انور پاشا نے یہ تجویز کی عربی حرفوں کو یورپین زبانوں کی طرح الگ الگ کر کے لکھا جائے جس سے صرف ان کی ایک ہی شکل کو سیکھنا نوآموزوں کے لیے ضروری ہوگا اور زیر، زبر، پیش کی بجائے ان کو ایک حرف کی شکل میں داخل کر دیا جائے گا، جیسا کہ ترقی یافتہ ملکوں میں رومن حروف میں لکھے ہوئے الفاظ میں ہوتا ہے، لیکن اس تجویز کے لیے جتنی علمی تیاری ضروری تھی، وہ نہ کی گئی اور فوجی احکام اس اصول پر لکھنے شروع کر دیے گئے جن کو کوئی کمانڈر بآسانی نہ پڑھ سکا۔ اس وجہ سے اس اصول سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچا اور یہ تجویز طاق نسیان ہو گئی۔ آخر کار ۱۹۲۸ء کے آخر میں ترکی میں عربی حرفوں کی بجائے رومن حرفوں کا استعمال شروع ہوا۔ اس سے ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا کہ بچوں اور ان پڑھ بالغوں نے جلد لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ دوسری طرف یہ آسانی ہوئی کہ طالب علم الجبرا، فزکس، کیمسٹری کے فارمولوں کو یورپین ملکوں کی طرح یورپی زبانوں میں لکھی ہوئی ریاضی اور سائنس کی کتابوں سے بآسانی پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ چھاپے خانوں میں (TELEPRINT) کی مشینیں لگ گئیں، ترکی اخبارات باہر سے (TELEX) کے ذریعہ بآسانی خبریں لینے لگے۔ یورپ کے بنے ہوئے ٹائپ رائٹروں میں چند ایک ترکی حرف اضافہ کر کے ان کو کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر اور بعینہ ترکی زبان کو ٹائپ کرنے کے لیے بآسانی استعمال میں لایا گیا۔ حرفوں کی تبدیلی کا لوگوں کی جہالت کو دور کرنے میں اتنا بڑا اور جلد اثر ہوا کہ ملک میں ایک دو سال کے اندر لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد ۸۰ فی صدی ہوگئی، لیکن میں یہاں یہ بھی لکھنے پر مجبور ہوں کہ اس تبدیلی کے فائدے کے ساتھ یہاں ایک ایسی غلطی ہوئی جس کا نقصان اور خمیازہ ابھی تک اٹھایا جا رہا ہے۔ نوجوان نسل عربی حروف بالکل نہیں جانتی، اس لیے اُن نایاب ادبی اور علمی خزانوں سے جو ترکی میں قلمی کتابوں کی صورت میں موجود ہیں، کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ اس کے سوا گھروں، زمینوں اور جائیداد کی

کی ملکیت کے متعلق جتنے پرانے حرفوں میں لکھی ہوئی دستاویزات ہیں۔ان کو بھی نئی نسل کے لوگ نہیں پڑھ سکتے ۔ ان کا غذات کو پڑھنے والے لوگ روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں ، حالانکہ اگر حروف کی تبدیلی کے بعد یونیورسٹیوں میں پرانے حروف سکھلائے جاتے تو یہ مشکلات پیدا نہ ہوتیں۔اب پرانے حرف صرف ادبیات فیکلٹی (FACULTY OF, ARTS) اور مکاتب امام وخطیب میں پڑھائے جاتے ہیں ۔(آپ بیتی جلد ۲ باب (۱۷) از صـ۱۴۹ تا صـ۱۶۵)

مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مکتوب

بنام مولانا ظہیر الحق دین پوری سلمہ

۲۲ اگست کو وطن عزیز کے طول وعرض میں دنیا کے عظیم انقلابی اور مجاہد حضرت علامہ استاذ عبید اللہ سندھیؒ کی یاد میں آپ کے عقیدت مندوں اور تلامذہ نے مختلف مجالس میں علامہ موصوف کی ولولہ انگیز سوانح حیات اور انقلابی کارناموں پر روشنی ڈالی ملک کے مقتدر اخبارات میں مضامین شائع ہوئے ،لیکن ہماری نظر میں ایک ایسا انسان جس کو قدرت کی طرف سے فطرت سلیم اور فہم عظیم عطا ہوا ہو جس کی ساری زندگی ایک تلاش ایک ولولہ ایک عزم لامتناہی اور انتھک جدوجہد میں گزری ہو اور آزادی وطن کے سلسلے میں پچیس برس جلاوطن کی زندگی بسر کی ایسے عظیم انسان کی حقیقی یاد کی صورت تو یہ ہے کہ ان کے انقلابی افکار اور قرآنی تعلیمات سے آج کے نوجوانوں کو متعارف کرایا جائے ۔اس سلسلے میں سندھ ساگر اکاڈمی بیت الحکمۃ لاہور اور بیت الحکمۃ کراچی جیسے علمی اداروں نے کافی کام کیا ہے۔ضرورت ہے کہ اس علمی اور فکری کام کو آگے بڑھایا جائے ،اس موقع پر ہمیں حضرت علامہ استاذ سندھیؒ کے نواسے صاحبزادہ ظہیر الحق صاحب

دین پوری نے مرحوم مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ایک غیر مطبوعہ خط کی کاپی بغرض اشاعت ارسال فرمائی تھی۔ یہ خط مولانا ابوالکلام آزادؒ نے صاحبزادہ ظہیرالحق کو جیل سے رہائی کے بعد مبارک باد کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا جس سے حضرت الاستاذ عبیداللہ سندھیؒ کی سوانح حیات کے بعض گمنام گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور وہ خط بجنسہٖ یہ ہے۔

دہلی

۱۵ ستمبر ۴۷ء

عزیز القدر مولوی ظہیرالحق دین پوری سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے آزادی پر مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ شکریہ! خط پڑھتے ہی مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آئی اور اس طرح آئی کہ صدائے درد، زبان تک پہنچی اور زبان نے نوک قلم کے حوالہ کیا۔ قصہ بہت طویل ہے اسے مختصر کیا جاتے۔ تب بھی وقت سازگاری نہیں کرتا۔ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے ایام تھے۔ ولی اللہی قافلہ کے امیر حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے انتہائی نامساعد حالات میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیج دیا۔ ان کو وہاں مختلف ممالک کے سیاسی رہنماؤں سے مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں جرمن، فرانسیسی اور جاپانی سیاستدان چند ایک ایسے بھی تھے جو آج اپنے اپنے ملک میں برسراقتدار ہیں اور عنانِ حکومت انہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ اس وقت کے سیاسی رفیق یا مشیر ہیں کہ جب مولانا نے کابل میں حکومت مؤقتہ قائم کی خود اس کے وزیر ہند منتخب ہوئے اور ریشمی خطوط کی تحریک چلا کر برٹش حکومت کو للکارا اور میدانِ جنگ میں شکست دے کر اپنا مؤقف منوایا۔ برطانوی نمائندہ نے جنگ کے خاتمہ پر مصالحتی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے حکومت کابل کی خودمختاری کا اعلان کیا۔ ہندوستان کے مطالبہ آزادی کو تسلیم کیا اور بتدریج ہند کو چھوڑ دینے کی وضاحت کر دی۔ اس کا انتقام برٹش حکومت نے امیر امان اللہ خان

سے لے لیا، مگر مولانا عبیداللہ سندھیؒ رحمۃ اللہ علیہ کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ یہ مولانا کا ذاتی سیاسی اثر تھا جس سے وہ مرعوب تھی۔ پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۹۳۹ء میں جب یہاں پہنچے تو دوسری جنگ کا آغاز تھا۔ انہوں نے اپنی تحریک کانگرس میں پیش کرنے کے لیے میدان ہموار کیا۔ گاندھی جی تک نے اس تحریک کی مخالفت کی۔ اس کے باوجود ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ ہاؤس نے مار دیا اور اس کی گونج بکنگھم پیلس سے ٹکرائی۔ یہ سب کچھ مولانا نے باہر بیٹھ کر کیا کسی بھی بحث میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی کبھی کسی اجلاس میں شرکت کی یہ فن صرف وہی جانتے تھے۔ ایک ملاقات میں چلئے پر میں نے ان کے چہرہ سے کچھ ایسا تاثر قبول کیا کہ جس کی بنا پر ان سے پوچھ بیٹھا فرمایا کہ چاہتا ہوں سوبھاش اسی وقت باہر چلے جائیں۔ کچھ دیر خاموش ہو کر رخصت ہوئے اور اوکھلے اپنی قیام گاہ پر چلے گئے دوسرے دن اوکھلے سے دہلی کو ملانے والی آٹھ میل لمبی سڑک کے ایک ویران گوشہ میں سوبھاش سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ دوسری ملاقات ان کی بالی گنج کلکتہ میں ہوئی۔ اسی ہی ملاقات میں اسے جاپان جانے کے لیے رخصت کیا۔ حکومت جاپان کے نام وزیر ہند حکومت مؤقتہ کی حیثیت سے اسے ایک شناختی کارڈ دیا اور وہاں کے فوجی بورڈ کے سربراہ کے نام اپنا ذاتی پیغام۔ سوبھاش کے وہاں پہنچنے پر حکومت جاپان نے فوج میں ان پر اپنے اعتماد کا اعلان کیا۔ ادھر اعلان ہونا تھا کہ ادھر احمد نگر کے قلعہ سے کانگرس ہائی کمان کی رہائی بلا شرط منظور کر لی گئی، ورنہ حکومت کا یہ فیصلہ تھا کہ پورے قلعہ کو بمع سیاسی قیدیوں کے بم سے اڑا دیا جائے۔ ساتھ ہی ہند کی آزادی کا اعلان کر دیا اور ہم آزاد ہو گئے کون جانتا ہے کہ کس کی قربانیاں ہیں ۹ جاپانی حکومت نے حضرت مولانا پر اعتماد کیا۔ اس جرم کی سزا اسے ہیروشیما میں بھگتنی پڑی۔ حضرت مولانا کو ایسا زہر دیا کہ جس نے ان کی ہڈیوں سے کھال کھینچ لی۔ پھر ان کی دونوں آنکھیں نکال لیں اور ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو اس مقام میں پہنچے جو پہلے ہی دن سے اللہ تعالیٰ نے ان کے

لیے اپنے حضور میں مخصوص کر رکھا تھا یُدۡخِلُهُمُ الۡجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمۡ۔
اس وقت آسمان اشک بار تھا۔ زمین رو رہی تھی۔ ہندوستان سوگوار تھا۔ جرمن اور جاپان کا علمی اور سیاسی طبقہ بھی شریک ماتم تھا مگر حکومت برطانیہ نے اس خبر کو افواہ سمجھا۔ تاج کے حکم سے وائسرائے ہند کے ذریعہ ایک تحقیقاتی محکمہ قائم ہوا۔ اس نے برطانیہ کے تمام سفارت خانوں سے رابطہ قائم کیا تب کہیں جا کر اطمینان نصیب ہوا اور یکم ستمبر ۴۵ء کو پورے ایک سال نو دن بعد سرکاری طور پر اس امر کی تصدیق کی کہ مولانا واقعی فوت ہو گئے ہیں۔

ایک انقلابی کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دیں اور پوری دنیا کو دوسرے پلڑے میں تو وہ ایک پوری دنیا پر بوجھل ہوتا ہے۔ اب صرف ایک بات باقی ہے اور اس یاد کے ساتھ غم۔ غم صرف اس کا نہیں کہ یہ لوگ جدا ہو گئے۔ غم اس کا ہے کہ وہ دنیا ہی مٹ گئی جس دنیا کی یہ مخلوق تھے۔ ہم اس کاروان رفتہ کے پسماندگان رہ گئے ہیں۔ جنہیں نہ تو قافلہ کا سراغ ملتا ہے نہ منزل سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ نہ ہمیں کوئی پہچانتا ہے نہ ہم کسی کے شناسا ہیں۔ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ
آزادی صد مبارک، ان شہداء کو اور اللہ تعالیٰ کی کروڑوں رحمتیں ان کی تربت پر ہوں۔
میں خیریت سے ہوں۔ الحمد للہ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کریں۔ والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کر دیں!

والسلام۔ ابو الکلام!

(ماہنامہ الرحیم حیدرآباد ماہ جولائی اگست ۱۹۶۸ء)

جلال الدین اکبر بادشاہ ہند

مولانا سندھیؒ کی رائے اکبر بادشاہ کے بارے میں بالکل الگ تھی۔ وہ اکبر کے

مداح تھے کہ اس نے ویدانت فلاسفی والوں کو ادھر ادھر وحدۃ الوجود کے قائل صوفیا کرام کے معتقدین کو اکٹھا اور مجتمع کر دیا تھا، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں تنافر کم کر دیا تھا۔ گو کہ اکبر میں ملوکیت کی خرابیاں اور مطلق العنانی جبر و تسلط بھی تھا اور کچھ اس کے مشیر بھی ایسے تھے۔ جنہوں نے اس کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ جہاں تک اس کے حکومت چلانے کا ڈھب تھا، وہ یقیناً قابل داد تھا۔ ہند کی مختلف اقوام و مذاہب کے تمام لوگوں کو اس نے بالکل مطمئن بنا رکھا تھا، لیکن راسخ العقیدہ علماء اور مؤرخین اکبر کے دین الٰہی کو غلط اور خود ساختہ بتاتے تھے اور بعض اس کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ تمام ادیان کو مٹا کر اور اسلام کو بھی منسوخ کر کے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی۔ اگر ایسا تھا تو یقیناً یہ کفر کی بات تھی۔ کوئی بھی صحیح العقیدہ عالم اور مسلمان اس کی تائید نہیں کر سکتا، لیکن تاریخی روایات اکبر کے بارہ میں متضاد پائی جاتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ تمام ڈھونگ اس نے لوگوں کو قابو رکھنے کے لیے رچایا تھا ورنہ وہ دین اسلام کو دل سے تسلیم کرتا تھا اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانتا تھا۔ بعض مؤرخین یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اکبر آخر میں اپنے ان فاسد خیالات سے تائب ہو کر مرا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب!

اگر عام مؤرخین کا خیال درست ہے، تو پھر مولانا سندھیؒ کی اکبر کے بارہ میں صرف خوش فہمی ہو گی۔ عام علماء نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نے بھی اس نظریہ سے اتفاق نہیں کیا اور انہوں نے اس بات میں مولانا سندھیؒ کا دفاع نہیں کیا، بلکہ اس کو غلط ہی قرار دیا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ اور مولانا شاہ ولی اللہؒ اور دیگر اکابر علماء اکبر کے بارہ میں خوش فہمی نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس کے خیالات کو الحاد ہی قرار دیتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان تک اس کے رجوع کی روایت نہ پہنچی ہو۔ خود اکبر نے متعدد ہندو عورتوں کو اپنے حبالۂ نکاح میں رکھا اور اس کے دیگر خواص لوگوں کے عقد میں بھی ایسی عورتیں دخیل تھیں جس سے ایک طرح کا سول میرج یا آزاد نکاح یا قانونی میرج کی

شکل پیدا ہو گئی تھی ۔ جس کو راسخ العقیدۃ مسلمان کسی طرح بھی روا نہیں رکھ سکتے تھے اس سے طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوئیں ، لیکن ملوکیت کے دور میں یہ تمام امراض امور طبعیہ کی طرح برداشت کیے جاتے تھے ۔ فإلی اللہ المشتکی ۔!

جماعتیں اور تنظیمیں

جماعتوں اور تنظیموں کی کارکردگی کے اعتبار سے بھی مولانا سندھیؒ باوجودیکہ "جمعیۃ علماء ہند" کے سٹیج پر کام کرتے تھے ، لیکن کسی بھی جماعت سے مطمئن نہیں تھے ، وہ خود کانگرس کے رکن ہوتے ہوتے کانگرس کے خلاف تھے اور کانگرس کے اندر رہتے ہوتے اپنی انفرادیت انہوں نے قائم کر رکھی تھی جس طرح گاندھی ، نہرو اور پٹیل وغیرہ نے بھی ایسا ہی کر رکھا تھا ۔ ان کی انفرادیت دوسروں کی بات کو نہیں چلنے دیتی تھی ۔ مولانا اس کو عوام الناس کے مفاد کے لیے مہلک خیال کرتے تھے اور اس کی شدید مخالفت کرتے تھے ، لیکن خود وہ اس سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے ، اس لیے کہ مولانا نے ہندوستان سے باہر رہ کر جو کام کیا تھا ۔ وہ کانگرس کے ایک معزز و محترم رکن کی حیثیت سے کیا تھا ۔ اور اس سے وہ کسی طرح دست بردار ہونے کے روادار نہیں تھے ۔ مسلم لیگ ، مجلس احرار ، جمعیۃ علماء ہند ، خاکسار اور اسی طرح دوسری جماعتوں اور تنظیموں کے بھی مولانا خلاف تھے ، کیونکہ ان میں سے بعض کی سیاست اچھی نہیں تھی اور بعض کے افکار خراب تھے اور بعض کا پروگرام بھی ناقص اور کالعدم تھا ۔ مذہبی تنظیموں اور افراد کا حال اس سے بھی زیادہ خراب تھا ۔ یہ انقلابی روح سے بالکل محروم تھے ۔ رجعت پسندی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی اور یہ لاعلاج بیماری کا شکار تھے ۔ مولانا سرتاپا قرآن کریم کے انقلابی پروگرام اور اس کی وہ تشریحات جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ اور حکمت سے ثابت ہے اس ۔۔۔ حامل تھے ۔ اس کے علاوہ مولانا کو کوئی چیز بھی مطمئن نہیں کر سکتی

تھی۔ تبلیغی جماعت والے جو بڑا ادعا کرتے ہیں کہ ان کا کام سب سے فائق اور پیغمبروں کا اصلی کام ہے، دعوت و تبلیغ بلاشبہ اسلام کا ایک رکن اور اصول ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام مخلصین پیروکاران انبیاء یہ کام کرتے رہے ہیں لیکن تمام دین کا انحصار صرف تبلیغ میں ماننا اور باقی شعبوں کو بالکل نظرانداز کر دینا اور یہ سمجھنا کہ یہ باقی تو دین کے کام ہی نہیں، دین کا کام تو بس یہی ہے جو ہم کرتے ہیں۔ چھ نکات کی تبلیغ گشت کا عمل، چلہ، چار ماہ، سہ روزہ، جمعرات کا اجتماع، ششماہی جوڑ، سالانہ ایک بڑا عظیم اجتماع، جماعتوں کی ملک بہ ملک، شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ روانگی، بس دین یہی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم و تدریس، مساجد کی امامت و خطابت، تصنیف و تالیف، مدارس دینیہ اور تعلیم گاہوں کا قیام و اجراء، سیاست ملیہ میں حصہ لینا یا اس کے لیے تنظیم کرنا، یا باطل فرقوں کا مقابلہ کرنا، تقریر و تحریر سے ان کا جواب دینا یا بالفعل دشمنان دین کے ساتھ جنگ کرنا۔ یہ تمام امور ان کے نزدیک ان کے نصاب سے خارج ہیں۔ گذشتہ برسوں میں کابل وافغانستان میں تقریباً بیس لاکھ مسلمان موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ ان کی حمایت میں عام گنہگار مسلمان اور دینی مدارس کے طلبہ ہزاروں کی تعداد شریک ہو کر روس اور روس نواز حکومت کے مقابلہ میں جان کی بازی لگا گئے، لیکن تبلیغی جماعت والوں کو اس علاقہ کے قریب ایک اجتماع کرنے کی توفیق بھی نصیب نہ ہوئی تاکہ ان مظلوم مسلمانوں کی تائید و تقویت ہی ہوتی یا ان کے لیے کوئی مالی امداد فراہم کی جاتی۔ عام حالات میں اس جماعت کا شیوہ یہ ہے۔ اس کے بہت سے افراد دینی مدارس کی مذمت کرتے ہیں، بلکہ بعض تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ ان دینی مدارس کو چندہ دینا بھی حرام ہے جب تک کہ کوئی اس جماعت میں حصہ نہ لے اور مخفی طور پر علماء کی مذمت و توہین کرتے رہتے ہیں اور ان کی کارگزاری کی تحقیر و مخالفت عمومی پروگرام رہتا ہے۔ قرآن کریم کے درس کے بارہ میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا درس سن کر کوئی آدمی

نیک و صالح نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اصلاح تو گشت کرنے سے اور جماعت کے ساتھ جانے سے ہوتی ہے۔ ایک بڑی مسجد اور دینی ادارہ کے بارہ میں ایک بہت بڑے معیاری قسم کے مثالی تبلیغی جماعت کے رُکن نے ایک دفعہ یہ کہا کہ یہاں سب کام ہو رہے ہیں لیکن دین کا کام نہیں ہو رہا۔ احقر نے عرض کیا کہ آپ نے صرف تبلیغ کا نام ہی سنا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو کسی چیز کا علم نہیں، ورنہ ایسی بات نہ کہتے۔ کم و بیش پچیس ہزار آدمیوں کو اس ماحول میں دینی تعلیم سے آراستہ کیا گیا ہے اور کم و بیش ایک لاکھ انسانوں سے زیادہ کی دینی اصلاح ہوئی ہے۔ ان کے عقائد درست ہوئے ہیں اور وہ کفر، شرک اور بدعات کو چھوڑ کر امورِ خیر کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ کیا یہ دین کا کام نہیں ہے؟ بڑے بڑے مالدار اور جاگیردار اور سرمایہ دار لوگ جماعت میں شریک ہو کر اپنا تفوق جتلاتے رہتے ہیں جس کے پردہ میں ان کی بُری کارگزاری اور مظالم پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ دینی مدارس کے فارغین علماء کرام کو بھاڑے کے ٹٹو خیال کرتے ہیں۔ بڑے بڑے آدمیوں کو ساتھ لے جا کر ان کا تعارف طلباء، علماء اور کمزور دیندار طبقہ کے لوگوں کے سامنے اس طرح کراتے ہیں کہ یہ صاحب کارخانے دار ہیں۔ یہ بڑے صنعت کار ہیں۔ یہ بڑے ڈاکٹر ہیں۔ یہ فوجی کرنل ہیں۔ یہ انجینئر ہیں فلاں اور فلاں ہیں۔ یہ کسی مسجد کے امام نہیں یا کوئی مولوی نہیں۔ یہ کوئی مسجد کے مؤذن یا خادم نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح یہ غریب علماء کی تحقیر و توہین ایک خاص طریقہ سے لوگوں کے دلوں میں بٹھاتے رہتے ہیں، حالانکہ یہ طریق قرآن کریم کی تعلیمات کے صریح خلاف ہے۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى۔!

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو فی الجملہ تبلیغ اسلام کا ایک ضروری رکن ہے اور فرض کفایہ ہے، لیکن غلو اور افراط تو کسی طرح روا نہیں۔ اگر ماں باپ یا بیوی بچوں کی پرورش اور حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہ ہو تو ایسی حالت میں تبلیغ کو ترک کیا جا سکتا

ہے۔ کیونکہ متعلقین کی خدمت اس حالت میں فرضِ عین ہوتی ہے۔ اس کو چھوڑ کر فرضِ کفایہ میں لگ جانا قطعاً روا نہیں۔ بہت سے تبلیغ والے ایسی بے تدبیری کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی مر جاتے تو تب بھی یہ کام ہوتے رہتے ہیں۔ حالانکہ موت وحیات کے احکام مختلف ہیں۔ ان کو خلط ملط کرنا درست نہیں، بدوضعی اور بے تدبیری کی بات ہے بہرحال تبلیغی جماعت کے اندر اچھے اچھے خدا پرست انسان بھی موجود ہیں۔ خود بانیانِ جماعت حضرت مولانا الیاسؒ، مولانا محمد یوسفؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ کا اخلاص و للٰہیت اور حدود و شرع کی پابندی شک و شبہ سے بالا ہے، لیکن جماعت کی عمومی فضا رجعت پسندوں، سرمایہ داروں، کم علموں اور علم دشمنوں سے بھری ہوئی ہے جو اسلام کی انقلابی ذہنیت اور قرآن کے انقلابی پروگرام سے بالکل عاری ہے۔ ستر سال سے تبلیغی جماعتیں چل رہی ہیں، کہیں کسی ملک یا علاقہ پر توجہ مرتکز کر کے کوئی تبلیغی سٹیٹ ہی بنا ڈالتے، تو وہ نمونہ کا کام دیتی اور ان کو کام کرنے کا سلیقہ بھی آتا۔ اس جماعت پر اکثر و بیشتر سرمایہ دار حضرات کا تسلط رہتا ہے جو معاملات میں بالکل ناقص اور بدتر ثابت ہوتے ہیں۔ منافع خور ستمگر ذہنیت رکھتے ہیں اور بعض اوقات حلال و حرام کا امتیاز بھی نہیں کرتے۔ غریب پروری اور مسکین نوازی سے عاری ہوتے ہیں اور اکثر غالی فاسد الاعتقاد معاند اہلِ بدعت کے پیچھے نماز پڑھتے رہتے ہیں جب کہ مولانا الیاسؒ کے پیر و مرشد حضرت گنگوہیؒ ایسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی واجب الاعادہ کا فتویٰ دیتے ہیں اور نیز بہت سے تبلیغ والے تمام زندگی سنت و بدعت میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ بدعت کی باطل رسومات ادا کرتے رہتے ہیں اور اسی پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ لیکن بایں ہمہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جماعت میں جانے سے اور سفر کرنے سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ جب بھی جماعت میں جائے دوسروں کی اصلاح سے زیادہ اپنی اصلاح کا خیال

مقدم رکھے۔ اس لیے ہم اس جماعت کی فی الجملہ تائید و تصویب کرتے ہیں اور عوام کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اس کی طرف سے دفاع بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن ان میں بہت سے لوگوں کی رجعت پسندی غلو اور افراط کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت و سمجھ عطا فرمائے۔!

مسلم لیگ کی زیادتیاں

آزادی ملنے کے بعد مسلم لیگ والوں نے یہ ظلم کیا کہ انہوں نے اس آزادی کو اپنی ذاتی جاگیر خیال کیا اور خزانہ عامرہ یا بیت المال (فینانس ڈیپارٹمنٹ) کو اپنے اباؤ اجداد کی جاگیر سمجھا۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ یہ آزادی گویا ہم نے ہی حاصل کی ہے اور مسلم لیگ کے نزدیک ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن سے لے کر ۱۹۴۷ء اگست تک کی جد وجہد تک آزادی کی تمام کوششیں مرتکز ہوکر رہ گئیں نہ اس سے پہلے کسی نے آزادی کے لیے کوئی کوشش کی تھی اور نہ حصولِ آزادی کے بعد سوائے مسلم لیگ کے نظم حکومت میں کسی کا حق ہے؟ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ۱۸۰۶ء میں شاہ عبدالعزیز دہلوی نے انگریز کے تسلط پر اس ملک کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا اور اس کے بعد علماءِ حق نے آزادی کی کوشش شروع کردی۔ شاہ ولی اللہ کی اولاد و احفاد اور ان کے تلامذہ اور شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد علماء، دیوبند اور ان کے اکابر اس راستہ میں ہزاروں قربانیاں دیتے رہے، شاہ اسماعیل شہید و سید احمد شہید کی تحریک جہاد و اقامت حکومت اسلام اور ان کی کوششیں اور ان کی شہادت اور پھر ان کی جماعت کے بقیۃ السیف حضرات کا حکومت برطانیہ کے ساتھ مقابلہ پھر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جس کو انگریزوں نے غدر کے نام سے شہرت دے کر مسلمانوں کو ذلیل کیا اور مسلمانوں کی جائیدادوں کے ضبط اور ان کے رجال کا قتل اور علماءِ حق کو ہزاروں کی تعداد

موت کے گھاٹ اتارا جاتا رہا دریائے شور عبور کر کے کالے پانی کی سزائیں اور پھر آہستہ آہستہ ملکی تحریکات میں باشندگان ملک کا عموماً اور مسلمانوں کا بالخصوص حصہ لینا اور طرح طرح کی ایذائیں برداشت کرنا اور قید و بند کی تکالیف، جرمانوں، لاٹھیوں کی مار اور جسمانی خوفناک اذیتیں بڑے بڑے رجال کا قید تنہائی اور تنگ و تاریک قید خانوں کی تکلیف اٹھاتے رہنا۔ ۱۹۰۸ء میں صرف ایک مضمون لکھنے پر حسرت موہانی کو دو سال قید بامشقت ہوئی۔ اس اللہ کے بندے نے اس کو برداشت کیا اور علی برادرانؒ اور مولانا شیخ الہندؒ کے شاگردوں نے ہر مورچے پر انگریزوں کے خلاف کام کیا۔ اور تکالیف اٹھائیں۔ کانپور کے اشفاق اللہ خان کو بغاوت کے جرم میں انگریزوں نے سزائے موت دی تختہ دار پر اشفاق اللہ نے کلمہ پڑھتے ہوئے پھانسی کی رسی کو چوم کر گلے میں ڈال لیا اور واصل بحق ہوگیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا رہا ہے۔ بھگت کی پارٹی اور غدر پارٹی کے ارکان کو بھی انگریزوں نے ایک ایک کر کے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ قصہ خوانی بازار میں پانچ سو سرخ پوشوں کو آناً فاناً گولیوں کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر جیل خانوں میں اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنا ہری پور جیل کے اطراف میں ایسے سینکڑوں مسلمان مدفون ہیں۔ جنہیں جیل کی اذیت ناک تکالیف پہنچا پہنچا کر ہلاک کیا گیا۔ سرحد کے ظالم گورنر مسٹر کیرو نے دو ہزار سرخ پوشوں کو خصی کرا دیا۔ انتقامی کارروائی کرتے ہوئے یہ لوگ آزادی کی طلب سے باز نہیں آئے تھے۔ میں نے ایسے بعض افراد کو دیکھا ہے کہ وہ آخر دم تک سرخ لباس اسی شناخت کے لیے استعمال کرتے تھے کہ انگریز کو تکلیف پہنچے۔ مولوی قمر علی آف گھنیلہ کو جو کہ عالم فاضل آدمی تھے۔ اسی سرخ لباس کے استعمال پر ڈیڑھ سال قید بامشقت دی گئی تھی۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان لیڈروں کو آزادی کی طلب کی پاداش میں انگریز نے نہایت تکلیف دہ سزائیں دیں۔ علماء کے طبقہ میں مولانا احمد سعید سحبان الہند دہلویؒ

نائب صدر جمعیۃ العلماء ہند نے تقریباً پندرہ سال جیل میں گزارے اور اسی قدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے بھی اور گیارہ گیارہ سال جیل ۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ ، شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ ۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور شورش کاشمیری نے بھی اسی قدر جیل بامشقت گزاری ہے۔ شاعر مرزا جانبازؒ نے ۱۴ سال جیل اور تیس بید کھائے ۔ مولانا ظفر علی خانؒ نے ۱۲ سال جیل یاترا کی ۔ خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کو دریائے شور عبور کی سزا ہوئی تھی ۔ احرار کے زعیم چودھری افضل حق مرحوم نے ہندوستان کی تقریباً تمام جیلوں اٹک سے گورکھپور تک قید کاٹی ہے ۔ مولانا لقاء اللہ پانی پتی کو سزائے موت ہوئی تھی ۔ بغاوت کے سلسلہ میں پھر اس کو منسوخ کر کے چار سال کالے پانی کی سزا انہوں نے کاٹی تھی ۔ احرار کے رہنما احسن عثمانی فاضل دیوبند دوسری جنگ کے دوران چار سال قید بامشقت کاٹ کر رہا ہوئے اور اس طرح منٹگمری (ساہیوال) جیل میں ان کے ساتھ ایسا تشدد کیا گیا جب انہوں نے خوراک کھانے سے انکار کر دیا تھا، تو ان کی مقعد میں لوہے کی نالی ٹھونک کر نالی کے ذریعہ اندر غذا پہنچانے کی کوشش کی گئی ۔ آنتیں زخمی ہو گئیں ۔ جیل سے نکلنے کے بعد اسی عارضہ میں وفات پا گئے ۔ ا مولانا مفتی کفایت اللہؒ ۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ ۔ مولانا محمد میاں دیوبندی مولانا نور الدین بہاریؒ ۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ ۔ مولانا محمد صادق کراچویؒ ۔ مولانا غلام غوث ہزارویؒ ۔ مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ ۔ مولانا محمد علی جالندھریؒ ۔ مولانا لال حسین اخترؒ ۔ مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ ۔ مظہر علی اظہر ۔ تاج الدین انصاریؒ ۔ شیخ حسام الدین امرتسری اور ان جیسے لاتعداد راہنما انگریزی پنجہ استبداد سے تکلیفیں اٹھاتے رہے ۔ بعض کو ایسی جسمانی تکلیفیں دیں جو ساری عمر ناکارہ ہو کر رہ گئے ۔ مولانا محمد اسحاق مانسہرویؒ کو انگریزوں نے گرم سلاخوں سے ان کی پشت میں داغ دیے تھے جس کی وجہ سے جیل سے باہر آنے کے بعد وہ کسی کام کے نہیں رہے تھے ۔ نیم مجذوبی حالت میں زندگی گزار کر واصل بحق

ہوئے۔ مولانا شیخ الہندؒ کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آئے تھے، لیکن مولانا بہت صابر تھے، کسی کے سامنے ذکر نہیں کرتے تھے۔ وفات پانے کے بعد نہلانے والے نے بتلایا کہ مولانا کی پشت پر سلاخوں کے داغ ہیں۔ ہمارے شیخ حضرت مدنیؒ کو انگریزوں نے صابرمتی جیل میں کھڑی بیڑیاں پہنا کر دو ماہ تک سارا سارا دن کھڑا کیا تھا۔ سارے ملک میں اس پر احتجاج ہوا تو سزا کو موقوف کیا گیا اور جیل بامشقت پر اکتفا کیا گیا۔ مولانا سید گل بادشاہؒ جمعیت علماء ہند سرحد کے صدر جو سالہا سال تک جیل میں رہے انہوں نے خود جامع مسجد نور گوجرانوالہ میں قرآن کریم کا درس دیتے ہوئے بتلایا تھا کہ ان کے والد بزرگوار کو دوسرے کئی حضرات کے ساتھ بغاوت کے جرم میں پشاور سے گرفتار کیا اور ان کی داڑھیاں منڈوائی گئیں اور بیڑیاں پہنا کر کوہاٹ تک پیدل ان کو چلا کر لے جایا گیا۔ مولانا محمد عسکری فاضل دیوبند کے بڑے بھائی مولانا نبیہ اللہ صاحب کو ۳۰ء میں بغاوت کے جرم میں دو سال قید پندرہ بید ایسے زور سے مارے گئے تھے کہ پندرہ سال تک نیل کے نشان نہیں مٹے تھے۔ اس کے بعد وہ وفات پا گئے۔ عبدالغفار خان ان کے والد بہرام خان اور ان کے بھائی سالہا سال تک قید و مشقت گزارتے رہے ہیں اور کچھ تو اسی قید میں داصل بحق ہوئے۔ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر ظالم کے حکم سے پرامن شہریوں پر گولیاں چلا کر تقریباً پانچ صد آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور تقریباً تین ہزار افراد زخمی ہوئے۔ یہ واقعات تاریخ میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ برصغیر کے تمام طبقات کے لوگوں نے آزادی کی خاطر بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ ان میں سوشلسٹ، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی اور مسلمان سب ہی شامل ہیں اور جماعتوں نے جو آزادی کی خاطر تکلیفیں اٹھائی ہیں جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام، خاکسار، سوشلسٹ اور اشتراکی نظریات رکھنے والے ان میں مزدور، کسان، طلباء، اساتذہ اور رضاکار ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ کیا مسلم لیگ کا فرض نہیں تھا کہ وہ ان سب کی قدر کرتی اور ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔

جو لوگ مر چکے تھے یا پھانسی دیے گئے تھے۔ کیا وہ رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ افسوس صد افسوس کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے حقہ بھرنے والے شخص کو تو انعام کا مستحق سمجھا گیا اور زمین اور مربّعے اور وظائف دیے گئے اور جن لوگوں نے سالہا سال تک جیلوں میں گزارے ماریں کھائیں۔ جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ ملک بدر ہوئے، وہ اور ان کے اہل و عیال کسی بھی رعایت کے مستحق نہ ٹھہر سکے، کیونکہ وہ مسلم لیگ کا کلمہ نہیں پڑھتے تھے۔ یقیناً انصاف کا ایک دن مقرر ہے۔ وہاں سب فیصلے ہو جائیں گے۔ کاکوری لکھنؤ کے ایک شخص کو ۴۲ سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ انگریز کے خلاف بغاوت کے جرم میں۔ یو۔پی کے ایک مسلمان علی ظہیر کو ۴۲ سال قید میں رکھا گیا اور جب وہ جسمانی طور پر بالکل لاچار اور درماندہ ہو گیا، تو اس وقت اس کو رہا کیا گیا تھا۔ سندھ کے پیر پگاڑا صبغۃ اللہ راشدیؒ کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا اور مسقط یا سقوطر کے جنگلات میں پھانسی دے کر اس کے جسم کو جلا کر بے نام و نشان کر دیا اور اس کے ہزاروں مریدوں کو تہہ تیغ کر دیا اور اس کا گھر بار ویران کر دیا۔ اسی طرح مدراس کے موپلا مسلمانوں کو بغاوت کے الزام میں ہزاروں کی تعداد کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جس پر تمام ہندوستان میں احتجاج ہوا، لیکن انگریز اپنا کام کر گیا۔ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں نے انگریز کے زمانہ میں بے پناہ مظالم برداشت کیے، لیکن انگریز کے چلے جانے کے بعد بھی ان کو آزادی راس نہ آئی۔ کیا قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی حکومت کی ذمہ داری نہیں تھی کہ ان تمام لوگوں کے لیے جنہوں نے ملک و ملت کی آزادی کے لیے قربانیاں دی تھیں، خواہ ایک دن کی قید ہو یا تین ماہ کی یا سال یا دو سال کی۔ خواہ ایک لاٹھی کھائی ہوا در جیل گیا ہو اور مقدمات میں ملوث کیا گیا ہو۔ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی حکومت کا فرض تھا۔ لیکن سوائے مسلم لیگ والوں کے یا انگریز پرستوں کے کسی کو کوئی رعایت نہیں دی گئی نہ کسی کو پنشنیں ملیں نہ مرنے والوں کے اہل و اولاد کی کسی قسم کی سرپرستی کی گئی نہ مکان الاٹ ہوئے۔ کیا

یہ ظلم اور ستم نہیں جب کہ انڈیا کی گورنمنٹ نے ہر ایسے شخص کے لیے جس نے کچھ بھی انگریز کے زمانہ میں قید و بند یا تکلیف اٹھائی اس کو وظیفہ دیا اور کئی قسم کی سہولتیں اور رعایتیں دی گئیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن آئے گا اور یہ سب حساب بے باک کرنا ہوگا۔ بلالحاظ مذہب و مسلک ہر شخص جس نے اس سلسلہ میں تکلیف اٹھائی تھی وہ اس توجہ و عنایت کا مستحق تھا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو دشمن ملک و ملت خیال کر کے ہر قسم کی رعایتوں اور سہولتوں سے محروم رکھا گیا، بلکہ ان سے ایک قسم کی انتقامی کارروائی کی گئی۔ مرزائی۔ قادیانی۔ آغا خانی رافضی۔ دہریے۔ کمیونسٹ منکرین خدا، منکرین قرآن و حدیث تو اس قسم کی رعایتوں کے مستحق ٹھہرے۔ لیکن آزاد خیال لوگ جمعیتہ العلماء۔ ہند کانگرس احرار۔ خاکسار اور سوشلسٹ تحریکوں سے تعلق رکھنے والے دشمن ملک و ملت خیال کیے گئے اور ہر قسم کی سہولت سے محروم رکھے گئے۔

مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں

سیاسی کام فقط نظریات یا علمی تجربات کے مالک ہونے سے نہیں چلتے۔ اس میں کامیابی کے لیے ایک مستعد جماعت اور روپیہ کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے۔ جیسے علم و عمل کی۔ ہندوستان کے مسلمان جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں وہ تھوڑا سمجھا جائے گا کہ ان کے نام سے کابل میں بے سروسامانی سے جو کام شروع ہوا، اس میں ان کے نوجوان بہترین کارکن ثابت ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو نوجوان بھی کام کرتے رہے، مگر ان میں اور مسلمان نوجوانوں کے کاموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے نوجوانوں نے ایسا اعلیٰ درجہ کا کردار ادا کیا جس سے مجھ کو یقین اور امید ہے کہ صرف انہی نوجوانوں کے کاموں سے ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ روپیہ تو محمد علی قصوری اور شیخ ابراہیم کا تھا اور کام باقی نوجوانوں کا تھا۔ وقت پر روپیہ ملتا

گیا اور وقت پر نوجوان کام کرتے گئے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی قوم کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ان لوگوں کا نام خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے اور ہمیشہ ان کے حق میں کلماتِ خیر ادا کرنے چاہئیں۔ اگر ہندوستان ان نوجوانوں کی حیات میں آزاد ہو جائے تو کلیدی عہدے ان کے سپرد کرنے چاہئیں۔ یہ میری وصیت ہے۔ اگر ان کی عزت و احترام میں قوم نے قصور کیا تو آئندہ آنے والی نسلیں ان پر لعنت کریں گی کہ جن لوگوں نے آزادی کے لیے اپنی جان و مال کی پرواہ نہ کی۔ جب بھی ان کو ان کی عزت افزائی سے محروم رکھا گیا؟ اور جن لوگوں نے ایک تولہ بھر ذرا ایک قطرہ خون نہیں بہایا۔ ان کو کیوں کلیدی عہدے دیئے گئے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ قوم کو اپنا احترام قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ ان نوجوانوں کی اور ان کی اولاد کی عزت کرنا چاہیے۔

(سرگزشت صـ ۱۲۲)

پروفیسر سرور صاحب کی خطاء

(۱) قانون کا نفاذ بعض صورتوں میں اضافی ہوتا ہے۔ مثلاً مال اگر کوئی شخص جمع نہ کرے تو زکوٰۃ کا سوال نہیں پیدا ہو سکتا جس طرح سارا مال تصدق کرنے سے زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے اور اگر کسی کا ہاتھ کہنی کے مقام سے اور پاؤں ٹخنے کے اوپر سے کٹا ہوا ہو تو وضوء میں اس کا دھونا ساقط ہو جاتا ہے اور اگر فتنہ و فساد واقع نہ ہو تو جنگ و حدود کا اجراء نہیں ہو سکتا۔ بعض قوانین میں لچک ہوتی ہے۔ حالات اور کوائف کی تبدیلی سے ان میں کسی قدر تبدیلی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ قحط کے زمانہ میں سرقہ کا قانون لاگو نہیں ہو گا یا اضطرار کی حالت میں ایک فعل واقع ہو تو اس کے بدل اور ضمانت میں لچک ہو گی۔ بعض قوانین کا ایک زمانہ اور دور ہوتا ہے۔ اس تک اس کا نفاذ ہو گا۔ مثلاً اخذ جزیہ نزول مسیح علیہ السلام تک ہو گا۔ اس کے بعد نہیں ہو سکتا یا مالِ غنیمت

دفعتہً میں اقربا رسول کا حق آپ کی حمایت اور حیاتِ مبارکہ تک تھا پھر یہ دور ختم ہو گیا۔ لیکن یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ قوانین میں ابدیت نہیں ہوتی۔ یہ غلط اور گمراہ کن نظریہ ہے۔ الحاد پرور لوگوں نے اسے شہرت دی ہے۔ مولانا سندھیؒ لاز (قوانین) دربائی لاز فرق میں کرتے ہیں، یعنی قانون کے رہتے ہوئے ضمنی قوانین بنانا، یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔ ضمنی قوانین شرائط کے ساتھ ہر وقت بنائے جا سکتے ہیں ان کی حیثیت قوانین کے اجرا یا انتظامی امور کو خوش اسلوبی سے طے کرنا ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد سرور صاحب کا یہ کہنا "چونکہ قانون کا قوم کے مزاج اور حالات سے متاثر ہونا ضروری ہوتا ہے اس لیے قانون ابدی اور سرمدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت صرف حکمت کو ہے اور قانون کی حیثیت ایک نمونہ اور مثال کی ہوتی ہے۔" (مولانا عبید اللہ سندھیؒ صہ ۵۳)

یہ بالکل غلط بات ہے اور مولانا سندھیؒ کی طرف اس کی نسبت بڑی جسارت اور زیادتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل فرما کر واضح طور پر یہ فرمایا ہے۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (جاثیہ) یہ اتباع شرع الٰہی ابدی ہے۔ اس کو موقت کرنا اور اس میں تشکیک پیدا کرنا کسی طرح روا نہیں، مثال اور نمونہ تو اشخاص و افراد ہوتے ہیں۔ قوانین نہیں ہوتے۔ اس قانون کا تمثل اور نمونہ ان افراد و اشخاص میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور دوسرے صالح افراد لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (ممتحنہ) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (فتح) یہ مثالی نمونہ ہے تمام لوگوں کے لیے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (البقرہ) تمام انبیاء علیہم السلام اور گذشتہ امتوں کے بعض کامل الایمان اولیاء اللہ حکماء اور صالحین مرد، عورتیں، یہ تمام نمونہ ہیں اور مثال ہیں تمام لوگوں کے لیے اصولوں کے مطابق عمل کرنے والے افراد، اشخاص اور جماعتیں نمونہ ہوا کرتی ہیں۔

کیوں کہ قانون یا اصول وضوابط جب تک انسانی شکل میں متشکل نہ ہوں یعنی ان پر عمل کرنے والے جب تک نہ پیدا ہو جائیں تو اصول ایک نظری چیز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بَیِّنہ کے لفظ سے شخصِ رسول کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کی تمام تعلیمات کا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس ہے اور پھر امت کے لیے اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ میں تین جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ نمونہ ہیں تمام انسانوں اور تمام اقوام کے لیے۔

(۲) پروفیسر سرور صاحب کا مولانا سندھیؒ کی طرف منسوب کر کے یہ کہنا کہ "مولانا سندھیؒ کے نزدیک زندگی کی ابتدا، معدنیات نباتات اور حیوانات سے ہوئی ہے۔ پھر انسان کا وجود عمل میں آیا۔ مذہبی فکر کی ابتدائی صورت صابئیت تھی اس کے بعد حنیفیت کی منزل آئی اور یہودیت، عیسائیت اور اسلام نے جنم لیا۔ (مولانا عبید اللہ ص ۲۹۲)

یہ بات اس اعتبار سے تو صحیح ہے کہ تخلیق کی ابتدائی شکل عناصر، معدنیت نامویت (نباتاتی شکل) پھر حیوانیت اور آخر میں انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ امام ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اسی طرح بیان کیا ہے لیکن انسان کی تخلیق کو ایک ناقص شکل میں ماننا اور پھر اس میں تدریجی عقلی ترقی تسلیم کرنا یہ ڈارون کا نظریہ ہے اور یہ بالکل غلط سراسر باطل ہے۔ یورپ کے اکثر حکماء بھی اس نظریہ کو رد کر چکے ہیں۔ قرآن کے یہ خلاف ہے اور امام ولی اللہؒ کی حکمت اور فلسفہ کے بھی منافی ہے۔ مولانا سندھیؒ ایسے احمقانہ نظریہ کے کیسے قائل ہو سکتے تھے؟ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا ہے اور مکمل شکل میں، کیونکہ آدم علیہ السلام "نبی مکلّم تھے" اللہ تعالیٰ کے نبی جن سے اللہ تعالیٰ نے بالمشافہ کلام فرمایا تھا اور ظاہر ہے کہ نبی عقل شعور حواس اور تمام قوائے ظاہرہ اور باطنہ کے اعتبار سے تمام انسانوں سے اکمل ہوتا ہے، اعقل الناس اور شعور کے اعتبار سے مکمل ترین ہستی کا مالک ہوتا ہے، بلکہ نبی میں حواس خمسہ کے علاوہ

ایک چھٹا حاسہ بھی ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ عالم ملکوت اور حظیرۃ القدس کے معاملات کا بخوبی ادراک کرتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ بھی اس کا ارتباط ہوتا ہے جو وحی الٰہی لاتے ہیں اور نبی کے قلب پر القاء کرتے ہیں۔ اب یہ کہنا کہ زندگی آہستہ آہستہ بے شعوری سے ترقی کرتے کرتے شعور و آگہی کی منزل میں آئی اور انسان وحشت سے نکل کر تمدن میں آیا۔ انتہائی غلط نظریہ ہے، ایجادات و انکشافات اور تجرباتی اشیاء کو عقل کے ساتھ جوڑ دینا بھی غلط ہے۔ عقل و شعور کے اعتبار سے جو انسان میں بلندی پائی جاتی ہے۔ صنعتی انکشافات کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔ بعض انتہائی کم عقل شرکیہ رسوم میں اور ادھام و خرافات میں مبتلا لوگ بڑی بڑی ایجادات کے مالک ہوتے ہیں۔ بقول امام ولی اللہؒ عقل معاش میں کامل اور عقل معاد سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر کے لحاظ سے اس طرح کی تدریجی کارگزاری کو تسلیم کرنا نہایت ہی غلط بات ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب کی ابتداء صابی شکل میں تھی پھر حنیفیت اور یہودیت عیسائیت اور اسلام نے جنم لیا۔

صابی دور تو شیث اور ادریس علیہما السلام کے زمانہ سے چل رہا تھا اور اس میں شرک و کفر کے غلط نظریات ستارہ پرستی اور کواکب پرستی شریک ہو گئے تھے اور قدیم اقوام اس بیماری کا شکار رہی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے دور سے حنیفیت کا دور شروع ہوا اور تمام شرکیہ اور کفریہ باتیں جو دینی اور مذہبی فکر میں مل گئی تھیں۔ انکار کیا گیا اور اصل حقائق کو ان کی خالص شکل میں ظاہر کیا گیا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ اپنی کتاب "حسن المحاضرۃ فی احوال المصر والقاہرۃ" میں لکھتے ہیں کہ صابی ادیان ابتداء سے چلے آ رہے تھے اور صابی دین میں یہ چار اصول اُسی طرح مسلم تھے جس طرح حنیفی دین میں یعنی توحید۔ طہارت صلوٰۃ اور صوم۔ اس سے معلوم ہوا کہ صابی دین بھی اصل میں برحق تھا لیکن اس کے پیروکاروں نے اس کے اندر تحریف اور تغیّر و تبدل سے خرابیاں پیدا کر دی تھیں۔ جیسے دین حنیفی کے اندر اس کے پیروکار یہود و نصاریٰ نے تغیّر و تبدل

کرے۔ اس کو بگاڑ دیا اور کچھ کا کچھ بنا دیا۔ دین اسلام دین حنیفیت کی کامل اور اکمل شکل ہے اور یہ قیامت تک رہے گا۔ اس کے پیروکاروں نے اگرچہ بہت سی خرابیاں اپنے عقائد و اخلاق و اعمال میں ظاہر کی ہیں۔ لیکن دین حنیفی کے اصول و ضوابط مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی اور نہ آسکے گی۔ وعدہ خداوندی اسی طرح ہے۔ اب یہ کہنا کہ مذہبی فکر پہلے کمزور اور شرک آلود تھی، پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے توحید کی منزل تک آگئی۔ یہ نظریہ غلط اور سو فی صد گمراہ کن ہے اور یہ اسی طرح غلط ہے جس طرح نظریہ تخلیق اور ڈارون کی تھیوری غلط ہے۔

(۳) اور اسی طرح پروفیسر محمد سرور صاحب مرحوم نے بھی متضاد باتیں نقل کی ہیں، چنانچہ اپنی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھیؒ" میں دیو بند کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ "رجعت" کا گڑھ بن گیا ہے، لیکن جب وہ مولانا اکبر آبادی کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے ناقدین" کا مقدمہ لکھتے ہیں تو اس میں تصریح کرتے ہیں اور علی گڑھ اور دیو بند دونوں کا تقابل کرتے ہیں کہ یہ دونوں تحریکیں مسلمانوں کی ضرورت تھی اور دیو بندی تحریک کسی وقت بھی اپنے مقصد سے غافل نہیں رہی۔ دیو بند صرف ایک علمی ادارہ نہیں تھا، بلکہ ایک تحریک تھی اور وہ آخر تک اپنے طریق پر قائم رہی تو پھر رجعت کا گڑھ کیسے بن گئی۔

اسی طرح جناب پروفیسر سرور صاحب نے "افادات و ملفوظات" میں مولانا سندھیؒ کے کئی ایک نظریات کی تعبیر صحیح نہیں کی۔ اسی لیے مخالف اور مشتبہ لوگوں کو مولانا سندھیؒ کے بارہ میں غلط باتیں منسوب کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پروفیسر سرور صاحب کو لکھنے کا موقع بہت ملا ہے، لیکن بہت سی باتوں کی تعبیر انہوں نے غلط کر دی ہے۔ پروفیسر صاحب کو ذہنی طور پر اس بات کا خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا اکبر آبادیؒ کی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے" اور پھر

مزید دقت یہ آن پڑی کہ ان (مولانا سندھیؒ) کی تعلیمات اور سیاسی افکار کی ترجمانی ایک ایسے شخص (سرور صاحب) کو کرنی پڑی جو گو کہ علمائے دیوبند کا عقیدت مند تو ضرور تھا لیکن جس علم اور بصیرت کی اس کام کے لیے ضرورت تھی، وہ پوری طرح اس کا حامل نہ تھا اس لیے ممکن ہے کہ مولانا مرحوم کی ترجمانی کا وہ پورا (حق) ادا نہ کر سکا ہو۔

(ص ۲۰)

(۴) اور اسی طرح "عبیداللہ سندھیؒ اور" افادات" میں سرور صاحب نے قادیانیوں کے بارہ میں جو باتیں، درج کر دیں ہیں، وہ بھی بغیر سوچے سمجھے درج کر دی ہیں جن سے بہت سی فکری گمراہیاں جنم لیتی ہیں۔ احقر نے خود بھی سرور صاحب سے بالمشافہ ذکر کیا تھا کہ افادات میں آپ نے جو مولوی نورالدین قادیانی کے بارہ میں لکھا ہے یہ صحیح نہیں۔ سرور صاحب نے کہا کہ یہ صرف تاریخی طور پر ذکر کیا گیا ہے ورنہ ان کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ مولوی حکیم نورالدین کی بہت تعریف کی ہے اور یہ کہ وہ قرآن کریم کا بڑا عالم تھا۔ حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ مولانا سندھیؒ کی طرف اس بات کو منسوب کرنا درست نہیں۔ مولوی نورالدین طبیب تھا اور معقولات میں دخل رکھتا تھا۔ مولوی نورالدین نے علم حدیث مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ سے پڑھا تھا لیکن بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں، شاہ عبدالغنیؒ نے کسی مجلس میں نورالدین سے کہا تھا کہ "تم سے بو آتی ہے"۔ درحقیقت یہ ارتداد اور قادیانیت کی بو تھی جو اللہ کے بندے کو اس وقت ہی محسوس ہو گئی تھی جب نورالدین طالب علم تھا۔ اس کے سالہا سال بعد نورالدین نے مرزائے قادیانی کا مرید باصفا بن کر اس کے جانشین ہونے کا ادعا کیا اور اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ مرزا قادیانی کا اپنا بیٹا بھی اس فن میں کمال رکھتا تھا اور اس طرح آپس میں پھوٹ پڑ کر قادیانی اور لاہوری مرزائی دو فرقے بن گئے۔ نورالدین لاہوری فرقہ کا سربراہ بن گیا اور مرزا بشیرالدین محمود قادیانیوں

کا سربراہ ہوا اور اصلاً ہی یہ چوہدراہٹ کی جنگ تھی مطلب دونوں کا ایک تھا۔ یعنی تحصیل زر اور دنیاداری اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ نورالدین، مولوی محمد علی لاہوری اور مولوی صدرالدین کے پایہ کے بہت سے علماء یہود و نصاریٰ اور مستشرقین میں پہلے بھی گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ قرآن کریم کی حقیقی تعلیم سے یہ سب لوگ بے بہرہ تھے! سرور صاحب کے بعض الفاظ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ قادیانی بھی گویا مسلمانوں کے دیگر فرقوں کی طرح شاید ایک فرقہ ہے۔ مصر کے مفسّرِ قرآن طنطاوی جوہریؒ کو بھی جب تک معلوم نہیں ہوا تھا وہ بھی ایسا ہی خیال کرتا تھا کہ شاید قادیانی بھی نقشبندی سہروردی، چشتی، قادری یا حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور اہلِ حدیث وغیرہ کی طرح کوئی فرقہ ہے جو فروعی اختلافات رکھتے ہیں۔ پھر جب مولانا بنوریؒ نے طنطاویؒ کو آگاہ کیا تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ خدا نے ایک ہندی عالم کو بھیج کر میری رہنمائی فرمائی اور مجھے غلطی سے نکالا۔ لیکن سرور صاحب جیسا سنجیدہ فہمیدہ اور باخبر آدمی اگر قادیانیوں کے بارہ میں ایسا نرم رویّہ اختیار کرے تو یہ سخت قابلِ افسوس اور حیرت انگیز ہوگا۔

(۵) پروفیسر محمد سرور صاحب نے افادات میں مولانا سندھیؒ کی بہت سی باتوں کی غلط ترجمانی کی ہے۔ مختلف مقامات پر تقدس کے خلاف مولانا سندھیؒ کی جرح نقل کی ہے، وہ زیادہ تر صحیح ہے اس لیے کہ جبہ و قبہ کا تقدس یا صرف خاص وضع کا تقدس تو اسلام میں کچھ معنیٰ نہیں رکھتا اسی طرح مصنوعی القاب و آداب کا تقدس بھی بے معنیٰ ہے۔ یہ چیزیں تو ایک طرح سے تعمق اور تصنع کی بنا پر بدعت و شرک میں آتی ہیں البتہ داڑھی کا جو ذکر سرور صاحب نے کیا ہے، یہ اپنی طرف سے کیا ہے۔ مولانا سندھیؒ ہیٹ پتلون اور کوٹ وغیرہ کا مشورہ دیتے تھے۔ اس بارہ میں ہم پہلے سید سلیمان ندویؒ کے تذکرہ میں اس کی حقیقت واضح کر چکے ہیں۔ داڑھی البتہ ایک سنت ہے۔ مولانا خود بھی اس کے پابند تھے اور اسی طرح وہ ظواہر شریعت کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ امام

ولی اللہ کی حکمت میں یہ بات واضح طور پر سمجھائی گئی ہے کہ ظواہر شریعت کی پابندی تمام اہل حق کے نزدیک ضروری ہے اس کے خلاف کرنے والے یا تو جاہل مطلق ہوں گے یا پھر وہ ملحد قسم کے لوگ ہوں گے۔ اہل حق میں کوئی شخص ظواہر شریعت کا انکار یا استخفاف نہیں کر سکتا۔

(۶) لبرلزم سے مراد عوامیت یا عوامی مفاد کی ترجیح ہے جس کو امام ولی اللہؒ رائے کلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انڈسٹری ازم نظام صنعت و حرفت ہے۔ ملٹری ازم سے نظام عسکری اور اس کے جملہ لوازمات ہیں۔ سوشلزم سے اجتماعیت مراد ہے جو اسلام کے اجتماعی نظام کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ ان اصلاحات سے ڈرتے ہیں۔ مغربی ممالک میں یہ تمام نظام نہایت اعلیٰ طریق پر پائے جاتے ہیں۔ بجز ان محرمات یا ممنوعات کے جو ان میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ اہل اسلام جب بھی ترقی کریں گے تو ان باتوں کو اس سے بھی بہتر شکل میں اپنانا پڑے گا۔ مولانا کا اشارہ انہی باتوں کی طرف ہے یہ مطلب نہیں کہ مغرب کا الحاد یا بے حیائی اور کفر و شرک کو اپنایا جائے۔ العیاذ باللہ

حضرت سندھیؒ کی خود نوشت مختصر سوانح حیات

لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں، لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ میں بدون شرم محسوس کیے پڑھ نہیں سکتا۔ اس لیے تصحیح کے لیے چند واقعات مختصراً لکھنے پر مجبور ہوں۔

کتبہ عبید اللہ سندھی دیو بند۔

میرا خاندان اور مولد

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری تھا، لیکن عرصے سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے تھے۔ میں عموماً سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن الاسلام لکھا کرتا ہوں، مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے جب اپنا نام والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا، تو عبیداللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی" تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبیداللہ بن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش اور یتیمی

میں بر شب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا، تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔ میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ اس دوران میں دو سال کے لیے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا۔ اس لیے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ ورنہ اپنے سکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام

۱۸۸۴ء میں مجھے سکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری سکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انہیں کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور پرانک شرک اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب" لکھوکی" کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبیداللہ خود تجویز کیا۔ احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصّہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں۔ یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی سکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کر لوں گا۔

اظہار اسلام

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحیم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹ ذوالحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزّہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سیّدالعارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہوگئی، اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحبؒ (بھرچونڈی والے) کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنیدا ور سیّدالعارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعتِ ثانیہ بن گئی، جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا۔ (غالباً مولانا ابوالحسن امروٹیؒ اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے۔ اس کلمہ مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اس لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کرلی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں، تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لیے رخصت ہوا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت نے میرے لیے خاص دعا فرمائی۔ "خدا کرے کہ عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے"۔ میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچا دیا۔

سیّدالعارفین کے خلیفہ

"بھرچونڈی" سے رخصت ہوکر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاول پور کی دیہاتی مساجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل وحرکت میں دین پور پہنچا۔ جہاں سیّدالعارفین کے خلیفہ اوّل مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحبؒ رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو

تک کتابیں میں نے یہیں مولوی عبدالقادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا مگر میں بحمداللہ ثابت قدم رہا۔ (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی) شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خان پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نووارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں اسٹیشن منظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دارالعلوم دیوبند

صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دارالعلوم میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں نے قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے مدرسہ میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظرالدین صاحبؒ سے کتابیں پڑھ لیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ

دیوبند دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہندؒ کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ میں ہدایہ، تلویح، مطول، [illegible] مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیزؒ ثانی ہوگا"۔ چند دوستوں نے مبشرہ خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابوحنیفہؒ کو بھی خواب میں دیکھا!

رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا۔ جسے شیخ الہندؒ نے پسند فرمایا اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جن میں جمہور اہل علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں، بلکہ راسخین فی العلم انہیں علم سے جانتے ہیں۔ شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہندؒ سے پڑھی اور سنن ابو داؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

جہان آباد دہلی

بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا حکیم محمود خانؒ کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولانا عبدالکریم صاحبؒ پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کرلیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کرلی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسمؒ اور حضرت مولانا رشید احمدؒ کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین صاحبؒ کی خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی ان سے سُنے۔

حالات سندھ

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا (اس تمام سفر میں ابایاً و ذھاباً لاہور نہیں اترا اور مسجد چینیاں نہیں گیا) میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی!

سیّد العارفین کے دوسرے خلیفہ

شوال ۱۳۰۸ھ میں سیّد العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابو الحسن تاج محمود صاحبؒ کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انہوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا! وہ میرے لیے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی محمد عظیم خان یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس آخیر وقت تک اپنے طرز پر رہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظلِ عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔

کتب خانہ پیر صاحب علَم

گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا۔ دورانِ مطالعہ میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا میرے تکمیلِ مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کا بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر صاحب علَم کی صحبت

اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انہیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔ حضرت مولانا ابو التراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا شکریہ میں ادا نہیں کرسکتا یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور ایسا ہی قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ دیوبندی سے شروع کرکے امام ولی اللہ دہلوی تک سلسلۂ علما میرا رہبر بنا اور ان کو میں نے اپنا امام بنا لیا۔ مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہوگئیں اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ میں نے دہلی میں قبیلہ ھذا کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح سے پیوست ہوگئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف مولانا شیخ الہندؒ نے کرایا تھا۔ آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علما کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی۔

طریقہ قادریہ

اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال و اذکار بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے خلیفہ اعظم مولانا ابو السراج دین پوریؒ سے سیکھتا رہا۔ اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کرلیتا۔ اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

میرا سیاسی میلان

دوران مطالعہ میں نے مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ ... سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے

بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندیؒ نے سقوطِ دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کی تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا۔ اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنا لیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے خیال کے موافق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

معاودت دیوبند

۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفہاً اجازت حاصل کی۔ بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اتحاد اسلامی کی ایک کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی مشاغل حضرت شیخ الہندؒ قدس اللہ سرہ سے وابستہ ہو گئے۔

دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان چھپتا رہا۔ اس کے بعد

مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی، مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ مدرسہ کا نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہو گیا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن یمانیؒ امتحان کے لیے تشریف لائے۔ اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی اور امام مالکؒ کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک میں جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیۃ کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھیؒ اور مولانا ابو محمد احمد لاہوریؒ اور عزیزی مولوی احمد علیؒ میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی

حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملکؒ ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے

نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاریؒ سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلامؒ اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرتِ کابل

۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی، لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انہوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا، مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتلا سکے۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیلِ حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کی میرے جیسے ایک خادمِ شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگرس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ عجیب بات معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحادِ اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خان کے دور میں میں نے کانگرس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔

سیاحتِ رُوس

۱۹۲۳ء میں ترکی جانا ہوا سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا، کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہ پہچان سکتا تھا) میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلویؒ کی شاخ ہے۔ اس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا ہوں اس کامیابی پر اوّل انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقا۔ جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی، سوشلسٹ بھی اور نیشنلسٹ بھی، سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکر گزار ہوں گا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔ فللّٰہ الحمد وحدہٗ

جدید ترکیا

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لیے سفیر ترکیا متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں اس زمانے میں پہنچا۔ جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے) تخمیناً تین سال ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحادِ اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے

محفوظ رہ سکتی تھی۔

ہمارا پروگرام

یورپ کی اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ الاستاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہنتا ہوں اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرنے کے لیے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کراکے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا۔ اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت کے لیے میں نے ان کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلہ افکار ہوا اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں۔ وہ کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار برس پہلے زمانہ میں لا کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے۔ وہ میرے لیے باعث سرور ہے۔ میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا، لیکن اس بنا پر پولیٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے

کلمة الحکمة ضالة المؤمن حیث وجدها فهو احق بها۔

مکہ معظمہ

۱۳۴۴ھ موسم حج پر مکہ معظمہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام احباب اس

ہیں آرہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ موتمر ختم ہونے کے بعد صفرہ ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈہ نہیں کروں گا۔ اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ ہوگیا۔ اگر کبھی کسی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اُسے پورا کردیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیاء امور خارج نہیں ہوئے اس لیے وہ میری طرف سے بہت بہت تشکر یہ اور دُعا کے مستحق ہیں۔

جزاهم الله خير -!

علماء مکہ سے استفادہ

مجھے اہلِ مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی (حاجی علی جان والے) دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب (دہلی) مرحوم تیسرے ابوالشرف مجدّدی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ الحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمع عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں تقریباً ۱۲۔۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے۔ اس زمانہ میں انہیں امام ولی اللہ دہلویؒ کے اصول پر بالاطمینان حل کرسکا جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلویؒ کو نہیں مان سکتے۔ ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کرسکتا، لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابلِ عمل تعلیم کا ایک عملی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس

تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔ میں نے امام ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیماتِ الٰہیہ، سطعات الطاف القدس، لمحات وغیرہ ان کتابوں کے لیے بطورِ مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلویؒ کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی عبقات اور مولانا محمد قاسمؒ کی قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر اور آبِ حیات کو استعمال کیا۔ مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا اور ساتھ ہی مدرسہ قرآن حکیم بھی جاری رہا۔ اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ للہ الحمد۔

امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا مدرسہ

اگر مجھے موقع دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلویؒ کو حکمت کا مجتہد مستقل فرض کر لوں اور امام عبدالعزیز دہلویؒ اور مولانا رفیع الدین دہلویؒ کو اس حکمت کے منتسب اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا محمد قاسمؒ کو مجتہد فی المذہب کے مرتبہ پر تسلیم کر لوں تو میں اس حکمت کو ایک ایسا سکول قائم کر سکتا ہوں جس میں۔

(الف) قرآن عظیم

(ب) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسنت خلفاء راشدین۔

(ج) تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔ اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اس اصول پر آسان ہو جاتے۔ ذَالِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

مراجعت وطن

۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس میں سیاسی مسلک

کے اتحاد واختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۸ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔ حج کا موسم سر پر آگیا۔ اس لیے ادائے مناسک کے بعد سے فراغت پر واپسی کا ارادہ ہے۔ (واللہ الموفق)

ہندوستان میں پروگرام

ہندوستان پہنچ کر میرا پروگرام اس کے قریب قریب ہوگا۔

(۱) انڈین نیشنل کانگرس کا معمولی ممبر تو ہمیشہ رہوں گا۔ تاکہ عدم تشدد کے متعلق میری ذمہ داری میرے قومی قانون کے اندر منضبط رہے اور میں پریشان دوستوں کے مشوش حرکات سے محفوظ رہ سکوں۔ لیکن کانگرس کی کسی پارٹی کے عملی حصہ میں شرکت نہیں کروں گا۔

(۲) میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم واشاعت ہوگا۔ میں اعلیٰ طبقہ اہل علم کو اس طرف متوجہ کرتا رہوں گا۔ اس میں دینی عالم اور دانش مند دونوں مخاطب ہوں گے۔ اگر کوئی غیر مسلم ہندو مسیحی آزاد منش اس فلسفہ کا مطالعہ پسند کرے گا تو اس کی پوری مدد کروں گا۔

(۳) جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں نیشنل کانگرس میں فلسفہ ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

(واللہ المستعان وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین)

عبیداللہ

جبال الصولتیہ

بلد الحرام

مولانا سندھیؒ کا سفر قندھار

جب مولانا سندھیؒ قندھار سے غزنی پہنچے تو بعض آثار قدیمہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ سلطان محمود غزنویؒ کی تعمیر کردہ مسجد جس کا نام "رشک فلک" تھا۔ تاریخ فرشتہ والے نے جس کے بارہ میں لکھا ہے کہ "روندگان ربع مسکون مثلش رانشان نہ دادند" مولانا نے اس مسجد کو دیکھا اس جگہ ایک چھوٹی سی آٹھ دس گز جگہ تھی اور وہاں پر مرمر کی سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ہلاکو خان نے اس مسجد کو برباد کر دیا تھا۔ مولانا سلطان محمود غزنویؒ کے مقبرے کو دیکھنے کے لیے گئے جو غزنی سے دو میل پر تھا۔ ایک لڑکا گدھے کے ساتھ جا رہا تھا۔ مولانا عبداللہ لغاری نے اس سے کہا کہ گدھا ہمیں دو کہ اس پر سوار ہو کر سلطان محمودؒ کے مقبرے پر جائیں گے اس نے کہا کہ نصف روپیہ کابلی لونگا چنانچہ وہ گدھا اس سے لیا اور مولانا سندھیؒ اس پر سوار ہو گئے۔ مولانا نے اس لڑکے سے کہا کوئی شعر سناؤ۔ اس نے

درین صحرا کہ می بینی سراسر خیمۂ لیلی است
دو صد مجنونِ سرگرداں درین ریگ رَوَان گم شد

مولانا کو اس پر وجد آگیا اور فرمایا کہ یہ قبریں خیمۂ لیلی ہیں کیونکہ روح ان سے تعلق رکھتی ہے۔ (سرگزشت ص ۳۵)

مولانا سندھیؒ جب قندھار پہنچے، تو وہ ملا محمد حسن صاحبؒ کے پاس گئے۔ ملا محمد حسن سید العارفین حافظ محمد صدیق بھرچونڈیؒ کے تعلیم یافتہ اور عارف کامل صاحب کشف بزرگ تھے۔ صبح کا وقت تھا اس وقت ملا محمد حسن صاحبؒ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مولانا سندھیؒ کو پہچان کر بہت خوش ہوئے اور اپنے پاس بیٹھی ہوئی جماعت کے لوگوں سے کہنے لگے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو شخص آنے والے ہیں

جو افغانستان کو انگریزوں سے آزاد کرائیں گے، یہ ہی وہ اشخاص ہیں۔ (مولانا سندھیؒ اور ان کے شاگرد اور خادم مولانا لغاریؒ (سرگزشت صہ ۳۲)

مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ قندھار میں ایک اہم شخصیت صوفی جان محمد صاحب جو بڑے عالم فاضل اور ولی اللہ تھے۔ میرا تعارف ان کے ساتھ اس طرح ہوا تھا کہ ایک دفعہ صوفی جان محمد صاحب دیوبند میں حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی ملاقات کے لیے آئے تھے میں اس وقت جمعیتہ الانصار کا ناظم تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو لے کر دفتر میں آئے اور باتوں باتوں میں فرمایا کہ (صوفی جان محمد صاحب سے میرا تعارف کراتے ہوئے)، یہ مولوی عبید اللہ سندھیؒ ہیں یہ میرے سب کاموں اور ارادوں سے مکمل واقف ہیں اور میرے دست و بازو ہیں، بس اتنی ملاقات کر کے چلے گئے۔

مولانا سندھیؒ کا افغانستان سے انخلاء

امیر حبیب اللہ خان کو جب قتل کر دیا گیا تو اس کے بعد کابل کا بادشاہ امیر امان اللہ خان کو مقرر کیا گیا۔ امیر امان اللہ خان نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ انگریز مجبور ہو گئے۔ افغانستان کو آزاد کر دیا اور صلح ہو گئی۔ امیر امان اللہ خان نے تین کروڑ روپے کا مطالبہ کیا بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ انگریزوں نے امیر امان اللہ سے کہا کہ یا تو مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی انقلابی تحریک کو بند کر دو یا اس کو اپنے ملک سے باہر نکال دو۔ مولانا سندھیؒ کو انقلابی تحریک بند کرنے کے بارہ میں کہا تھا مگر مولانا نے انکار کر دیا۔ آخر ان کو حکم دیا کہ آپ ہمارے ملک سے نکل جائیں۔ مولانا جب روس پہنچے اور انگریزوں کو خبر ہوئی، تو اس وقت وہ تین کروڑ روپے کا وعدہ پورا کر دیا گیا اور امیر امان اللہ خان نے اعلان کیا کہ آئندہ جماعت دیوبندی کا افغانستان میں کوئی اثر نہیں رہنے دیا جائے گا۔ (سرگزشت کابل صہ ۴۵)

سرگزشت کابل

یہ کتاب اصل میں مولانا عبداللہ لغاری صاحب کے املائی بیانات ہیں جو انہوں نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی اپنی تحریر کردہ کتاب" کابل میں سات سال" کی سرگزشت کی شرح وتفصیل بیان کی ہے۔مولانا سندھیؒ نے جس وقت وہ مختصر سرگزشت لکھی تھی۔اس وقت انگریز کا دور تھا اور تمام واقعات اس میں درج کرنے ممکن نہ تھے۔اس لیے مولانا عبداللہ لغاری صاحب جو مولانا سندھیؒ کے تلمیذ رفیق اور اکثر سفر وحضر میں ساتھ بطور خادم رہتے تھے۔مولانا لغاری خود بھی درس نظامی کے فاضل اور مولانا سندھیؒ کے قدیم شاگرد تھے۔علوم قدیمہ سے پوری مناسبت رکھتے تھے۔عمر میں تقریباً مولانا سندھیؒ سے ایک آدھ سال بڑے تھے،لیکن انقلابی معاملات میں اور دیگر علوم وفنون میں مولانا سندھیؒ کے خوشہ چین اور مستفیدین میں سے تھے۔زمانہ کے گرم سرد چشیدہ تھے اور مولانا سندھیؒ کے بہت سے معاملات اور کوائف سے بے خبر تھے۔سرگزشتِ کابل تسلسل کے ساتھ یا ایک زمانہ میں نہیں تحریر کی گئی،بلکہ متفرق اور مختلف اوقات میں تحریر کی گئی ہے۔بالکل سرور صاحب مرحوم کی طرح وقتاً فوقتاً سرگزشت کے مختلف حصص تحریر واملاء کراتے رہے ہیں جس میں تکرار بھی بہت کچھ ہو گیا ہے۔سہو ونسیان اور بے خبری وخطاء سے بہت

سے واقعات غلط سلط بھی درج ہوگئے ہیں اور اس میں مولانا لغاری مرحوم کی اتنی ذمہ داری نہیں جس قدر ذمہ داری اس سرگزشت کے مرتب کرنے والے جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی ہے۔ جنہوں نے بہت کچھ گڑبڑ کر دی ہے اور اس کا اقرار و اعتراف کتاب کے مقدمہ میں خود کیا ہے کہ اس کتاب میں تکرار بہت کچھ ہوا ہے۔ بار بار کے تکرار و حک و اصلاح و اضافے سے یقیناً واقعات میں بہت کچھ رد و بدل ہو گیا ہے اور بعض باتیں بالکل واقعہ کے خلاف درج ہیں اور بعض مقامات پر صریح زیادتی اور غلط بیانی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کی باتیں حضرت مولانا سندھی کی شان سے بہت بعید ہیں اور ان کے دوسرے بیانات کے بھی خلاف ہیں۔ چنانچہ غلام مصطفیٰ خان صاحب لکھتے ہیں: "مولانا سندھی کے رفیق مولانا عبداللہ لغاری جو سفر و حضر میں ان کے ساتھ تھے اور اپنے ایام میں محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب کے صدر شعبہ ثقافت اسلامیہ و تقابل ادیان سندھ یونیورسٹی کے ہاں مقیم تھے اور اس ڈائری کی شرح لکھتے اور لکھواتے رہے۔ محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب ناظم تعلیمات سندھ یونیورسٹی نے اس کے بعض حصے لکھے اور مواد کو یکجا کر کے اس کا ابتدائی مسودہ تیار کروا دیا مولانا لغاری مرحوم کی راقم الحروف پر بھی شفقت تھی۔ وہ برابر اپنی شرح کی زبان اور ربط مطالب کے سلسلہ میں مجھے یاد فرماتے تھے اور بار بار حک و اصلاح فرماتے تھے، چنانچہ اس نقل در نقل کے بکثرت مقامات ان کے اور راقم الحروف کے قلم سے درست ہوتے رہے۔ بالکل مولانا لغاری کی ترمیم و اصلاح سے کئی واقعات کی نہ صرف تکرار ہو گئی بلکہ اس تکرار کے ذیل میں ہر بار نئی معلومات اور اضافہ بھی ہوتا گیا جو من و عن قائم رکھا گیا ہے۔"

یہ تمام حضرات ہمارے نزدیک محترم و معزز ہیں۔ صاحب فہم اور علم سے بہرہ ور ہیں، لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ تنگ نظری اور غلط پروپیگنڈا اور فرقہ وارانہ

گروہی تعصب سے خالی نہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب تو مجددی طریقہ پر بیعت ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں، لیکن آپ مجدد الف ثانی کے مشن کے خلاف عرس وغیرہ بھی منعقد کرتے ہیں اور اس میں شریک ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلم لیگ کی سیاست سے بہت زیادہ متاثر رہے ہیں۔ اس لیے کہ جمعیۃ العلماء ہند کے اہل حق علماء کے خلاف جو جو باتیں مسلم لیگ کے سرکردہ حضرات کرتے تھے وہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے بھی سرگزشت میں درج کر دی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ص ۱۴۱ اسے۔

"حکیم الامت کا خطاب دیوبندی جماعت میں حضرت شاہ ولی اللہ کے لیے مخصوص تھا اور شاہ ولی اللہ کی جماعت کے سردار مولانا شیخ الہند تھے۔ وہ تو سیاست اور پولیٹیکل کاموں میں امامت کرنے لگے اور شاہ ولی اللہ کی جماعت دو سو سال سے آزادی ہند کے لیے کام کر رہی تھی۔ اب جب مولانا محمد علی نئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگوں کو جمع کرنے لگے۔ یہ بات گورنمنٹ کی آنکھوں میں ایک خار گزری۔ مولانا اشرف علی کے چچازاد بھائی اس زمانے میں سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی یوپی کے تھے۔ ان کی کوشش سے حکیم الامت کا خطاب مولانا اشرف علی کو ملنے لگا اور ان کے مریدوں نے مولانا اشرف علی کو حکیم الامت کہنا شروع کر دیا۔ تاکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک کو ضرب لگے۔ ایسا ہوتا رہا۔ مولانا اشرف علی گریجوایٹ نوجوان کو بڑا کافر کہتے تھے اور ہندوؤں کو چھوٹا کافر۔ یہ بات مولانا اشرف علی کو گوارہ نہ تھی کہ علماء کی جماعت یعنی جمعیۃ العلماء کا، یا نئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگوں کا امیر ایک گریجوایٹ نیچری ہو۔ مولانا محمد علی نے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا اور ہندو مسلمانوں کا اتحاد قائم کیا۔ جب مولانا شیخ الہند مالٹا سے آزاد ہو کر آئے تو جمعیت العلماء کا پریذیڈنٹ بھی مولانا محمد علی کو بنا دیا۔ ادھر کابل میں مولانا سندھی ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر رہے تھے اور

ہندوستان پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جب مولانا شیخ الہندؒ فوت ہو گئے، تو دیوبند کے اراکین نے مل کر دیوبند دارالعلوم کا سرپرست مولوی اشرف علی کو بنایا کیونکہ حکومت نے سوچ رکھا تھا کہ مولانا شیخ الہندؒ کا انتقال ہو اور مولوی اشرف علی کو دیوبند کا سرپرست بنایا جائے۔ یہ مولانا شیخ الہندؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ کی تحریکوں کو فنا کرنے کا پہلا قدم تھا اور دوسرا قدم یہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہرؒ کو جمعیت العلماء کی صدارت سے علیحدہ کر دیا جائے، تاکہ مسلمانوں کا زور ٹوٹ جائے اور نئے اور پرانے تعلیم یافتہ حضرات میں نفاق پیدا ہو جائے۔ وہ تو دل سے چاہتے تھے کہ جمعیت العلماء سے نیچریوں (بے دینوں) کو نکال دیا جائے اور خالص اسلامی جمعیت العلماء بنے۔ دہلی میں جمعیت العلماء کا جلسہ کرا کے مولویوں سے ووٹ لیے گئے کہ پریسیڈنٹ کس کو کیا جائے۔ مولوی بیچارے جو عموماً سادے ہوتے ہیں اور پولیٹیکل کاموں اور سیاست سے بالکل نابلند ہوتے ہیں۔ انہوں نے مولانا اشرف علی صاحب کے حسب منشا مولانا محمد علی مرحوم کو معزول کر کے مولانا حسین احمد مدنی کو، جو اور بھی سیاست اور پولیٹیکل کاموں سے ناواقف تھے اور پھر گریجوئیٹوں کے ویسے ہی مخالف تھے، جیسے مولانا اشرف علی ان کو جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ مقرر کیا۔ اب پرانے تعلیم یافتہ علماء علیحدہ ہو گئے اور گریجوائٹس نے اپنا رخ پھیر لیا۔ مولانا محمد علی نے جا کر مسلم لیگ کو زندہ کیا۔ اور مسلمانوں کو مسلم لیگ میں جمع کر کے ہندوؤں سے اپنے حقوق منوانے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ جب مولانا سندھیؒ مکہ معظمہ میں آئے تو مولانا حسین احمد مدنی بھی حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ مولانا سندھیؒ نے پہلے آہستگی سے ان کو سمجھایا اور کہا کہ آپ مولانا شیخ الہندؒ کی جگہ دارالعلوم دیوبند کے استاد بنے ہیں۔ آپ کو حق نہ تھا کہ مولانا محمد علی کو جنہیں مولانا شیخ الہندؒ نے جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ بنایا تھا ان کو معزول کر کے آپ پریسیڈنٹ بنتے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا کہ آخر یہ

جمیعت العلماء تھی۔ اس کا پریسیڈنٹ بھی عالم ہونا چاہیے۔ اس پر مولانا سندھیؒ کو بہت غصہ آیا اور کہا کہ تم کو کیا اختیار تھا۔ تم میں کیا علم تھا۔ کیا تم میں فضیلت تھی کہ تم ایک پولیٹیکل جماعت کے سردار بنتے۔ تم نے کہاں سے سیاست سیکھی۔ مدینے میں تو سیاست سے کبھی نہیں۔ دو چار مہینے تم شیخ الہندؒ کے ساتھ قید میں رہے۔ بس اس سے تم سیاست سیکھ گئے۔ آپ کا نظریہ اور مولانا شیخ الہندؒ کا نظریہ متضاد چیزیں ہیں تم مولوی اشرف علی کے تابعدار ہو۔ مولوی اشرف علی نہیں چاہتے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ میں تم کو کہتا ہوں کہ ہندوستان میں جاکر اپنی غلطی کی تلافی کرو اور پھر مولانا محمد علی کو بلوا کر اس کا پریسیڈنٹ بناؤ۔ ورنہ میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔ تم کیا چیز ہو کہ تم میرے استاد اور شاہ ولی اللہؒ کی ساری کی ساری تحریک کو برباد کرتے ہو۔ پھر تو مولانا حسین احمد مدنی رونے بیٹھ گئے۔ اس لیے جب مولانا سندھیؒ ہندوستان میں آئے تو ہمیشہ مولانا حسین احمد مدنی ان کی مخالفت کرتے رہے اور مسلم لیگ کے نوجوانوں کو کافر کہتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ کے نوجوانوں نے ایک ٹکڑا ہندوستان کا پاکستان کے نام پر آزاد کرا لیا اور جمعیت العلماء سب کے سب ہندوؤں کے غلام بنے رہے۔ ہندوؤں کے یہاں بھی ان کی عزت نہیں نہ مسلمانوں کے یہاں ان کی عزت ہے۔ مولانا شیخ الہندؒ کی تحریک کو مولانا حسین احمد مدنی نے یوں بیکار کر دیا۔ اب دارالعلوم دیوبند مولوی بنانے کی ایک مشین رہ گئی۔ نہ ان کی عزت پاکستان میں ہے نہ افغانستان میں اور نہ ترکی میں (سرگزشت کابل از صہ ۱۴۱ تا صہ ۱۴۳)

جو کچھ سرگزشت میں درج کیا گیا ہے۔ اس کا اکثر حصہ خلاف واقعہ اکاذیب کا مجموعہ ہے۔ سب سے پہلے مولانا محمد علی جوہرؒ کی پوزیشن پر غور فرمائیں۔ محمد علی جوہرؒ اصلاً طبقہ علماء میں سے نہیں تھے۔ وہ رامپور کے معزز پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے

اور علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد لندن میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے تھے۔ واپس آکر جب تمام حالات کا جائزہ لیا اور کچھ خاندانی حالات کے تقاضے سے سرکاری ملازمت نہ کرسکے۔ طبیعت میں جوش بہت زیادہ تھا اور انگریز کے مظالم دن بدن ہندوستان اور بیرونِ ہند بڑھ رہے تھے۔ بالخصوص مسلمان قوم ہر جگہ ان مظالم کا شکار تھی۔ ادھر مولانا شیخ الہندؒ نے علی گڑھ پارٹی کے صالح ذہنیت رکھنے والے لوگوں کو اپنے ساتھ انگریزوں کے خلاف ملایا تھا۔ محمد علی جوہر بھی مولانا شیخ الہندؒ سے بیعت ہوچکے تھے اور ویسے بھی محمد علی کی والدہ محترمہ بڑی اماں صاحبہ مرحومہ بھی جو خلافت کی تحریک کے سلسلہ میں بہت کام کرتی رہی ہیں اور خود بدا تہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اپنے خاندان کے ۹۹ افراد انگریزوں کے ہاتھ سے ہلاک وقتل ہوتے ہوئے دیکھ چکی تھیں۔ ان کے دل میں اور ان کے بیٹوں اور دیگر افراد خاندان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت وغیظ وغضب کی شدید آگ بھڑک رہی تھی۔ محمد علی اور شوکت علی جو ان کے بڑے بھائی تھے نہایت خوش طبع اور عظیم آدمی تھے۔ پرصوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ وضع قطع بھی دونوں بھائیوں نے علماء مشائخ جیسی بنائی ہوئی تھی۔ مسلمان قوم کی ہمدردی کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔ بڑے عظیم مقررین میں سے تھے۔ باعمل مسلمان تھے۔ سپاہیانہ جذبہ پورے جوش سے اپنے اندر رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہرؒ نے شیخ الہندؒ کی وفات پر تعزیت کے جلسہ میں انتہائی غمگین لہجہ میں یہ کہا تھا کہ افسوس شیخ الہندؒ تمام عالم کے مسلمانوں کو اپنی وفات سے یتیم کر گئے۔ محمد علی جوہرؒ، مولانا شیخ الہندؒ کے بعد سب سے زیادہ مولانا مدنیؒ کے معتقد تھے اور قرآن کریم کا ترجمہ بھی انہوں نے مولانا مدنیؒ سے جیل میں پڑھا تھا۔ خالق دینا ہال کا مقدمہ جس میں محمد علی جوہرؒ۔ مولانا مدنیؒ۔ ڈاکٹر کچلو۔ پیر غلام مجدد صاحب وغیرہ بہت سے اہم اشخاص وحضرات تھے۔ ان کے بیانات ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی [illegible] بھی بڑا زوردار تھا، لیکن حضرت مدنیؒ کا بیان بالکل سرکفت السان کا

بیان تھا"۔ اگر لارڈ ریڈنگ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلا دیں۔ حدیث شریف کو مٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کر دیں، تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں۔" اس آخری جملے پر مولانا محمد علی جوہرؒ نے جزاک اللہ کہہ کر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے قدم چوم لیے۔ (مقدمات وبیانات اکابر صہ ۲۴)

لیکن اس بیان کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے سرگزشت کے جامعین لکھتے ہیں"۔ اسی طرح میں نے اپنا پروگرام انگریزی واردو میں چھاپ کر شائع کرا دیا۔ میں نے اس میں یہ بھی صاف لکھا تھا کہ مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ کو کراچی میں جو سزا ہوئی ہے، وہ ایک ڈھکوسلا ہے۔ اس سے قبل مولانا محمد علی جوہر کو رولٹ ایکٹ کی کسی دفعہ کے ماتحت جو چار سال جیل کی سزا تھی اس کو کراچی میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ کیونکہ رولٹ ایکٹ پر عام شورش ہو گئی تھی اور وائسرائے نے گاندھی جی سے وعدہ کیا تھا کہ رولٹ ایکٹ ختم کر دیا جائے گا۔ اس لیے وہ سزا جو مولانا محمد علی جوہرؒ کو بمقام بمبئی میں مقدمہ چلا کر ان کی غیر حاضری میں دی گئی تھی۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کراچی کا مقدمہ تھا اور آپ کے ہمراہی مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ بے گناہ مولانا جوہر کے ساتھ سزایاب ہو گئے۔ حالانکہ وہ انقلابی نہ تھے۔ صرف خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گئے تھے۔ اگر یہ سب لوگ ستیہ گرہ کے قانون کے پابند نہ ہوتے تو اپیل کرنے پر سب بری ہو جاتے۔" (سرگزشت کابل صہ ۲۳۹)

سرگزشت کے جامعین کو کچھ بھی شرم محسوس نہ ہوئی کہ کیا درج کر رہے ہیں۔ کراچی کا مقدمہ ڈھکوسلا تھا اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کوئی انقلابی آدمی نہ تھے خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گئے تھے۔ جہاں تک مولانا محمد علی جوہر کا تعلق ہے تو ان کے واقعات میں درج ہے کہ ایک دفعہ ان کے مکان پر بہت سے زعماء اور علماء جمع تھے۔ ان کی بیٹھک میں تصویریں آویزاں تھیں۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ

صاحب نے کہا کہ یہ تصویریں ممنوع ہیں۔ محمد علی جوہر ان کے ساتھ بحث کرنے لگے۔ کہ بحث و مباحثہ میں کسی سے ہار نہیں مانتا۔ البتہ میں یہ کہتا ہوں کہ میرا یہ چھیتا بھائی۔ (حضرت مدنیؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو عمر میں محمد علی جوہر سے چھوٹے تھے لیکن ان کے علم و تقویٰ کے محمد علی بے حد معتقد تھے) اگر کہے تو میں یہ تصویریں اتار دوں گا۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب جو بات کہتے ہیں، وہ صحیح ہے تو مولانا محمد علی جوہر نے بیٹھک سے تمام تصویریں خود اتار کر اور ان کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ مگر افسوس کہ سرگزشت کے جمع کرنے والے محمد علی جوہرؒ اور شوکت علی کو تو مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی لکھا ہے اور حضرت مدنیؒ کو مولوی حسین احمد۔ ببیں تفاوت راز کجا تا بکجا۔

پھر جمعیت العلماء کی صدارت کا قصہ لکھا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کو ہٹا کر مولانا حسین احمد مدنیؒ کو صدر مقرر کر دیا گیا۔ حالانکہ جمعیت العلماء کا مستقل صدر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۰ء تک مفتی کفایت اللہ صاحب ہی رہے ہیں اور درمیان میں اجلاسوں کے صدر بدلتے رہے ہیں، چنانچہ امرتسر کے اجلاس کی صدارت ۱۹۱۹ء میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے کی۔ ۱۹۲۰ء کو دہلی میں حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے کی۔ ۱۹۲۱ء کو لاہور میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے کی۔ ۱۹۲۲ء کو گیا میں مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندیؒ نے کی۔ ۱۹۲۴ء کو کناڈا میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے کی۔ ۱۹۲۵ء کو کانپور میں حضرت مولانا سید محمد سجاد بہاریؒ نے کی۔ ۱۹۲۶ء کلکتہ میں سید سلیمان ندویؒ نے کی۔ ۱۹۲۷ء کو پشاور میں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے کی۔ ۱۹۳۰ء کو امروہہ میں حضرت مولانا شاہ معین الدین اجمیریؒ نے کی۔ ۱۹۳۱ء کو کراچی میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے کی۔ ۱۹۳۸ء کو دہلی میں مولانا عبدالحق مدنیؒ نے کی۔ ۱۹۴۰ء کو جونپور میں مولانا حسین احمد مدنیؒ نے کی۔ ۱۹۴۲ء کو لاہور میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

نے کی ۔ ۱۹۴۵ء کو سہارنپور میں حضرت مولانا سید حسین مدنیؒ نے صدارت کی ۔ مولانا محمد علی جوہر کو کب صدارت سے ہٹا کر مولانا حسین احمد مدنیؒ نے قبضہ کیا جب کہ مولانا محمد علی جوہر ۱۹۳۱ء میں لندن گول میز کانفرنس کے موقع پر ہی وفات پا گئے تھے اور فلسطین میں مدفون ہو چکے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر نے کانگریس ۔ مسلم لیگ ۔ خلافت وغیرہ تمام تحریکات میں کام کیا ہے جس طرح حکیم اجمل خان صاحبؒ اور ڈاکٹر انصاری نے ۔ یہ سب حضرات مولانا شیخ الہندؒ سے بیعت تھے جمعیت العلماء ہند کی انتخابی سلسلہ کی خرابیوں کا ذمہ دار مولانا مدنیؒ کو قرار دینا اور پھر وہ مولانا سندھیؒ کی زبان سے محض الزام تراشی ہے اور حقیقت کے خلاف ہے اور یہ کہ مولانا مدنیؒ سیاست نہیں جانتے تھے اور محمد علی جوہرؒ کو جماعت سے نکال دیا اور خود جماعت پر قابض ہو گئے ۔ کیا یہ صریح غلط بیانی نہیں اور پھر مولانا سندھیؒ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ۔ مولانا مدنیؒ کو شیخ الہندؒ کا حقیقی جانشین سمجھتے تھے اور ان کو شیخ الہند ثانی کا لقب دیتے تھے مولانا سندھیؒ اور مولانا مدنیؒ آپس میں یک جان و دو قالب تھے ۔ تمام افکار دعوائد امیال و عواطف اور جذبات و خیالات باہم متفق و متحد تھے ۔ مولانا سندھیؒ تو مولانا مدنیؒ کے جوتے سیدھے کرنے سے بھی باک نہیں رکھتے تھے ۔ مولانا کے خطبات و تحریرات سے ثابت ہے کہ اگر مولانا مدنیؒ میرے ہندوستان آنے کی تحریک نہ کرتے تو میں ہندوستان واپس نہ آتا ، بلکہ حرم مکہ میں ہی مقیم رہتا ۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ مولانا مدنیؒ ، مولانا سندھیؒ کی مخالفت کرتے رہے ، کس قدر جھوٹ اور غلط بات ہے ، چنانچہ سرگزشت کے ص ۲۴۲ کی پوری عبارت نہایت ہی غلط اور حقائق کے بالکل خلاف ہے ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد مدرسہ دار العلوم کا سرپرست بنایا گیا تھا ۔ اس کا تعلق سیاست سے نہیں تھا ، بلکہ علمی اور مسلکی سرپرستی تھی اور حکیم الامۃ

کا خطاب مولانا تھانویؒ کو ان کی کثیر تصانیف اور سلوک و تصوف میں ان کی نمایاں خدمات کی وجہ سے ان کے مریدین و معتقدین نے دیا تھا نہ اس لیے کہ شاہ ولی اللہؒ کے حکیم الامتہ کو ختم کیا جائے۔ مولانا تھانوی بھی تمام دیوبندی جماعت کی طرح شاہ ولی اللہؒ کے معتقد تھے۔ ملاحظہ ہو سرگزشت کی عبارت۔

"مولوی بے چارے جو عموماً سادہ ہوتے ہیں اور پولیٹیکل کاموں اور سیاست سے بالکل نابلند ہوتے ہیں۔ انہوں نے مولانا اشرف علی صاحب کے حسب منشا مولانا محمد علی مرحوم کو معزول کر کے مولانا حسین احمد مدنیؒ کو جو اور بھی سیاست اور پولیٹیکل کاموں سے ناواقف تھے اور پھر گریجوئٹوں کے دریلے ہی مخالف تھے۔ جیسے مولانا اشرف علی ان کو جمعیت کا پریسیڈنٹ مقرر کیا۔"

مولانا اشرف علیؒ کے بارے میں بھی سرگزشت میں متضاد اور غلط باتیں درج ہیں ایک طرف یہ بات کہ مولانا اشرف علی صاحب کے بھائی جو سی۔ آئی۔ ڈی یوپی کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ سارے ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی کا بڑا افسر بنا دیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد علی کو مولانا اشرف علی صاحب نے جمعیت العلماء سے معزول کیا تھا اور یہ بھی کہ مولانا اشرف علی اپنے بھائی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے اور دوسری طرف یہ کہ مولانا اشرف علی صاحب تصوف میں بڑے مرتبہ کے اولیاء اللہ تھے، مگر ان کو گریجوئٹوں سے نفرت تھی۔ آخر میں افسوس جمعیت علماءِ ہند کانگرسیوں کا دُم چھلا بن کر رہے گی۔

سرگزشت کی یہ تمام باتیں غلط خلافِ واقعہ اور حقائق کے خلاف ہیں۔ مولانا تھانویؒ کو جمعیت سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ مولانا محمد علی اپنی تیزی طبع کے ساتھ جمعیت کے ساتھ نہ رہ سکے۔ نہ یہ کہ مولانا تھانوی نے ان کو الگ کیا۔ مولانا تھانوی کے اپنے نظریات تھے، وہ سیاست اور پولیٹیکل کاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ اگر مولانا تھانوی

سی۔آئی۔ڈی کے زیر اثر تھے، تو پھر وہ اولیاء اللہ کیسے شمار کیے جا سکتے ہیں مولانا تھانوی کی تمام تحریرات اور کتب و رسائل محفوظ ہیں اور بار ہا طبع ہو چکے ہیں اور ہزار ہا لوگوں نے وہ تحریرات پڑھی ہیں۔ ان تمام تحریرات سے کہیں بھی یہ تاثر نہیں ملتا کہ وہ انگریزی حکومت کے زیر اثر تھے۔ البتہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ انگریز منظم طاقت اور حکیمانہ طرز حکومت کے مالک ہیں۔ ان سے ٹکرا لے کر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ لہذا وہ اصحاب رخصت کی طرح ان تمام تحریکات سے الگ تھلگ رہتے تھے اور کسی بھی تحریک کے موافقت نہیں کرتے تھے۔ جب رجال مسلم لیگ نے مولانا تھانوی سے رابطہ قائم کیا تو مولانا نے بتوسط مولانا ظفر احمد عثمانی رجال مسلم لیگ سے یہ کہا کہ اگر وہ لوگ احکام شرع کی پابندی کریں تو ان کی تائید کی جاتی۔ لیکن رجال لیگ نے اس کا یقین نہیں دلایا تھا۔ اسی لیے مولانا تھانوی کو مسلم لیگ کے طرفداروں میں شمار کرنا بھی غلط بات ہے۔ گریجوئٹوں سے نفرت کی بات بھی غلط ہے۔ مولانا تھانوی نے تو ہزار ہا گریجوائٹوں کی اصلاح کی۔ نفرت کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ اتہام ہے۔

مولانا تھانویؒ کے بارے میں صحیح اور مبنی برحقائق وہ بات ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے جناب مولانا ریاض احمد اشرفیؒ کے جواب میں لکھی ہے۔

(۳) "یہ بات بالکل غلط ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ العزیز کو مالٹا میں قید کرایا تھا، وہ تو حضرت شیخ الہندؒ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور محبین میں سے تھے، البتہ تحریک آزادی ہند میں ان کے رائے خلاف تھی، نہ انہوں نے کوئی مخبری کی اور نہ ان کو انگریزوں سے اس قسم کے تعلقات رکھنے کی کبھی نوبت آئی، ہاں مولانا مرحوم کے بھائی محکمہ سی، آئی، ڈی میں بڑے عہدیدار آخیر تک رہے۔ ان کا نام مظہر علی ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہو مستبعد نہیں ہے مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ معاذ اللہ مشرکانہ عقاید ہرگز نہیں رکھتے تھے۔ بہت بڑے

موحد، خدا پرست تھے، تصوف میں ان کا قدم بہت راسخ تھا۔ پیری مریدی بھی حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے حکم پر اور ان کی اجازت سے کرتے تھے، علم ظاہر میں بھی ان کا قدم بہت راسخ تھا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کو مالٹا میں قید ان کے کارناموں اور انگریز دشمنی اور آزادئ ہند کی جانبازانہ جدوجہد نے کرایا تھا جس کی کچھ تفصیل رولٹ رپورٹ میں بسلسلہ ریشمی خط موجود ہے، ان کے متعلق اس قدر رپورٹیں فرنٹیئرا اور صوبہ یوپی کے سی۔آئی۔ڈی کی تھیں کہ ان کا مجموعہ ہم کو قاہرہ میں بیان لیتے وقت انگریز افسر نے ایک بڑی ضخیم کتاب کی صورت میں دکھایا تھا اور اسی کو دیکھ کر ہم سے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سوالات کرتا تھا۔ اس میں فرنٹیئر کے سی۔آئی۔ڈی کی رپورٹیں بہت زیادہ ہیں۔

(۴) حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نہ صرف صحیح مسلمان ہونے کا معتقد ہوں۔ بلکہ ان کو بہت بڑا عالم باعمل اور صوفی کامل جانتا ہوں، ہاں ان کی رائے دربارۂ تحریک آزادئ ہند غلط سمجھتا ہوں اس بارہ میں میرا یقین کامل ہے کہ میرے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حضرت شیخ الہندؒ قدس اللہ سرہ العزیز کی رائے نہایت صحیح اور واجب الاتباع تھی۔ یہ غلطی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اجتہادی غلطی جانتا ہوں جس کی وجہ سے حضرت تھانوی مرحوم کی شان میں نہ میں گستاخی کرتا ہوں اور نہ کسی کی گستاخی کو روا رکھتا ہوں۔ والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ، دیوبند ۴ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ (مکتوبات شیخ الاسلام ص ۲۴۵ تا ۲۴۶ ج ۲)

جمعیتہ علماء کو کانگریس کا دم چھلا کہنا بھی مسلم لیگ کے لوگوں کی زیادتی ہے۔ جمعیتہ علماء ہند کے علماء کرام نہایت ہی پابند شرع اور متقی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا بڑا قصور و جرم یہ تھا کہ وہ انگریز کے مخالف تھے۔ اس لیے انگریز ان علماء کے خلاف

پروپیگنڈا کراتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے پر سب سے پہلے جمعیتہ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام نے انگریزی حکومت کے خلاف فتویٰ دیا اور مخالفت کی پھر اس کے بعد کانگریس نے بھی انڈیا چھوڑ دو۔ (کوئٹ انڈیا) کا نعرہ لگایا۔

جمعیتہ علماء ہند کا مشن انگریز سلطنت کو درہم برہم کرنے کے علاوہ ملت اسلامیہ کی رہنمائی بھی تھی۔ اس اثناء میں ہر دور میں ملت اسلامیہ کی مشکلات کا شرعی اور دینی حل پیش کرتے رہے۔ کانگریس کے ساتھ ان کا صرف انگریزوں کو نکالنے میں اشتراک تھا اور بعض اجتماعی مسائل بھی تمام برصغیر کے لوگوں کے مشترک تھے اور ایسے امور میں اشتراک دینی نقطہ نظر سے غلط نہیں۔

سرگزشت میں سب سے زیادہ افسوس ناک بات جو جامعین سرگزشت نے درج کی ہے۔ وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا مرتبہ و مقام ہے اور وہ بھی مولانا سندھیؒ کی زبان سے جو بڑا غلط ہے۔ مولانا سندھیؒ کی اپنی قلمی تحریروں میں اور خطبات وغیرہ میں مولانا مدنیؒ کی تعریف و توصیف اور ان کی علمی اور سیاسی جدّوجہد کا پوری طرح ذکر ہے۔ یقین ہے کہ مولانا عبداللہ لغاریؒ نے بھی یہ باتیں نہیں املاء کرائی ہوں گی۔ یہ سب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب اور ان کے رفقاء کا کمال معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر یہ باتیں مولانا لغاری نے املاء کرائی ہیں، تو یقیناً عدم علم کی بنا پر ایسا ہوگا اور مسلم لیگ والوں کے غلط پروپیگنڈا کا اثر ہوگا۔ انگریزوں نے بہت سے علماء اور پیروں اور اصحاب ورع اور تقویٰ کو نہایت ہوشیاری سے غلط طریق پر استعمال کیا تھا۔

ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں۔

" سندھ میں مَیں نے بیس سال زندگی بسر کی ہے۔ میرے بزرگ سندھی سب دیوبندی اسی مسلک کے پابند ہیں۔ اگرچہ علماء نے دیوبند سے ان کے افادہ اور استفادہ کا کوئی رابطہ نہیں۔ میرے بزرگ سندھیوں کے مسلک کے مخالف سندھ میں ایک جماعت

پیروں اور مولویوں کی کافی تعداد میں ہے۔ ہندوستانی حکومت نے ہمارے بزرگوں کے مسلک کے مخالف جو پیر اور مولوی تھے۔ ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا۔ جن کا قندھار کے پیروں سے بہت قوی تعلق تھا مثلاً سرہندی مجددی پیروں کا قندھار سے تعلق تھا۔ ان قندھاری بزرگوں میں چند پیر کابل تشریف لائے اور سردار نصراللہ خان نائب السلطنت سے ملے اور انہیں یقین دلایا کہ مولوی عبیداللہ سندھیؒ حکومت ہند کا فرستادہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کر کے افغانی حکومت کے اسرار اور رازوں سے انگریزوں کو مطلع کرتا رہے۔ پہلے تو انہوں نے گورنر قندھار کو لالچ دیا کہ ان دو مولویوں کو جو تمہارے پاس ہندوستان سے آئے تھے۔ اگر آپ واپس کر دیں تو ہر ایک مولوی کے عوض ایک لاکھ روپیہ ملے گا۔ مولوی دو تھے۔ ایک مولوی عبیداللہ سندھیؒ اور دوسرے مولوی عبداللہ لغاری اس کا قصہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔"

(سرگزشت کابل ص ۱۴۷)

مولانا سندھیؒ جب قندھار میں پہنچے تو سراج الاخبار جو کابل سے نکلتا تھا۔ اس کے آڈیٹر محمود خان طرزی تھے۔ اس میں ایک مضمون تھا "حیّ علی الفلاح" کہتے ہیں کہ یہ مضمون سردار عنایت اللہ خان معین السلطنت نے اپنے قلم سے لکھ کر شائع کرایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تمام افغان جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس وقت اس قوم افغان کو جہاد کا شوق تھا۔ مگر انگریزوں نے ایک چال چلی کہ عنایت اللہ خان معین السلطنت کے مرشد حضرت چہار باغ جو ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں چلے گئے تھے۔ ان کو انگریزوں نے مکہ معظمہ سے بلا کر اس کام پر متعین کیا کہ تم عنایت اللہ خان کو کہو کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ہوا ہے کہ افغانستان کو اس جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے آکر عنایت اللہ خان کو سمجھایا کہ اگر اس جنگ میں افغانستان شریک ہوا تو وہ ختم ہو جائے گا۔ یہ عجیب بات دنیا سنے گی کہ حضرت صاحب چہار باغ کو جو معین السلطنت

عنایت اللہ خان کے مرشد تھے۔ انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس حرکت کے لیے بلایا کہ سردار عنایت اللہ خان معین السلطنت اپنے فوجی منصوبوں کو جنگ سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے اور حضرت صاحب چہار باغ اس کام پر افغانستان واپس آئے اور یُوں خواب سنائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں افغانستان کو جنگ سے علیحدہ رکھنے کا کام پورا کروں اور حضرت صاحب چہار باغ اس میں کامیاب ہو گئے یعنی معین السلطنت کو جنگ سے باز رکھنے میں کامیابی ہوئی حضرت صاحب چہار باغ اچھے صوفی تھے، مگر انگریزوں کے دام میں آ گئے جس طرح تمام پیر ہوتے ہیں اور قصہ پیر سرہندیوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ انگریزوں نے ان کو کابل و قندھار بھیجا کہ جا کر گورنر قندھار نصر اللہ خان نائب السلطنت سے کہو کہ مولوی عبید اللہ سندھیؒ اور مولانا عبد اللہ لغاری دونوں وہابی ہیں اور سرکاری جاسوس ہیں اور انگریزوں کے نمائندے ہیں۔ یہ افغانستان کا مذہب اور سیاسی حالت خراب کریں گے، مگر سردار نصر اللہ خان نائب السلطنت اور امیر حبیب اللہ خان نے ان کو جواب دے دیا کہ ہم ان لوگوں کے حالات سے واقف ہیں۔ یہ دونوں مولانا شیخ الہند حضرت محمود الحسن دیوبندیؒ کے آدمی ہیں اور نصر اللہ خان صاحب نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ ہمارے ملک میں ہندو سکھ عیسائی وغیرہ سب رہتے ہیں۔ اگر یہ وہابی ہیں تو کوئی بات نہیں۔ اسی لیے یہ ناکام واپس ہوئے۔ اسی طرح سادی طبیعت والے پیر غداریاں کرتے رہتے ہیں۔

(سرگزشت ص ۱۶۷ تا ص ۱۷۷)

حضرت مولانا مدنیؒ کے خلاف اس قسم کا غلط پروپیگنڈا کہ انہوں نے مولانا شیخ الہندؒ کی تحریک کو خراب کر دیا اور بے اثر بنا دیا۔ حالانکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے منفرد شخصیت ہیں جنہوں نے عزیمت کے ساتھ مولانا شیخ الہندؒ کی تحریک کو چلایا اور برٹش امپائر کی طاقت کو کمزور کیا جس کی وجہ سے وہ برصغیر کو چھوڑنے

پر مجبور ہوگئے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ بھی انہوں نے کسی وقت ترک نہیں کیا اور پھر یہ کہنا کہ وہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو یا مسٹر محمد علی جناح کو کافر کہتے تھے یہ بہت بڑا الزام ہے اور صریح غلط بیانی اور اتہام ہے۔ حضرت مولانا مدنیؒ نے کسی کی تکفیر نہیں کی اور نہ وہ یہ کام کرتے تھے۔ اس کے برعکس جب محمد علی جناح یعنی قائد اعظم کی وفات ہوئی تھی، تو مولانا مدنیؒ نے ان کی ہمشیرہ محترمہ مس فاطمہ جناح اور مسٹر لیاقت علی خان کے نام تار دیا تھا اور مرحوم قائد اعظم کی تعزیت کی تھی اور حضرت مدنیؒ نے یہ کہا تھا کہ مجھے مسٹر محمد علی جناح کے فوت ہونے پر بڑا افسوس ہے اور میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بخشش و مغفرت فرمائے۔ کیا کسی کافر کے لیے بھی اس قسم کی دعا کرنی جائز ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود سرگزشت کے جامعین نے خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس قسم کی غلط باتیں لکھنے سے گریز نہیں کیا۔

شیخ عبدالرحیم سندھیؒ

شیخ عبدالرحیم سندھیؒ جن کا سابق نام بھگوان داس کرپلانی تھا۔ مولانا شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی کے ایک رکن رکین تھے۔ یہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے مخلص ترین نو مسلم دوست اور رازدان تھے۔ ان کا کچھ حال حضرت مدنیؒ نے نقش حیات میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ نہایت دین دار اور مشن کے سرگرم رکن تھے۔ مولانا سندھیؒ نے ان کو حضرت شیخ الہندؒ کے مشن میں داخل کیا تھا۔ یہ مسٹر اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عرصہ دراز تک تعلیم یافتہ غیر مسلم سندھیوں کو مسلمان بنانے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ کوشاں ہیں۔ بحمداللہ اس میں بہت زیادہ کامیاب ہوتے۔ ان کے سمجھانے کا طریقہ اس قدر عمدہ اور دلچسپ تھا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولانا سندھیؒ کے ساتھ تحریک آزادی میں انہوں نے بڑی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ مولانا سندھیؒ

جب کابل میں تھے تو ان کی خط وکتابت ان کے توسط سے ہوتی تھی۔ مولانا سندھیؒ نے ریشمی کپڑے پر لکھ کر جو خطوط ایک نومسلم عبدالحق پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو دیئے تھے کہ یہ خطوط شیخ عبدالرحیم تک حیدرآباد میں پہنچادیں اور یہ شیخ عبدالرحیم حج پر جائیں گے تو وہ خطوط مولانا شیخ الہندؒ تک مکہ مکرمہ پہنچادیں۔ یہ شیخ عبدالحق نے وہ خطوط اللہ نواز کے والد خان بہادر حق نواز کو دے دیئے اور اس نے سر مائیکل اڈوائر کو پہنچا دیئے اور اس طرح یہ راز فاش ہو کر تمام حضرات مصائب کا شکار ہوتے۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے شیخ عبدالرحیم کا پیچھا بھی کیا۔ ان کو گرفتار کرنے کے لیے اور سزا دینے کے لیے۔ لیکن یہ روپوش ہو گئے اور آخر وقت تک سی آئی ڈی کے ہاتھ نہیں آئے۔ یہ نہایت راز دار سمجھدار متقی پرہیزگار شخص تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سرہند میں بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ (نقش حیات)

احقر عبدالحمید سواتی عرض کرتا ہے کہ شیخ عبدالرحیم کے متعلق جو معلومات احقر کو ملی ہیں وہ یہ ہیں کہ شیخ عبدالرحیم اگر اس وقت سی آئی ڈی کے ہاتھ لگ جاتے، تو یقیناً ان کو سزائے موت دی جاتی۔ خدا کی قدرت کہ وہ اس دوران سرہند ہی میں حکیم سید محمد سعید عرف بگا حکیم صاحب کے گھر میں دو سال سے زیادہ عرصہ تک روپوش رہے، چنانچہ حکیم صاحب کے پوتے سید محمد آفاق صاحب جو آج کل کلفٹن کراچی میں مقیم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جب کہ شیخ صاحب گھر میں بالاخانہ میں رہتے تھے سید محمد آفاق صاحب کے بڑے بھائی حکیم سید عبدالقادر شاہ صاحبؒ گوجرانوالہ میں ہی مقیم تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہاں ہی دواخانہ کرتے تھے عرصہ ہوا وفات پاگئے۔ سید محمد آفاق صاحب نے بتایا کہ آخر شیخ عبدالرحیم صاحب پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی دوران میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کو سرہند میں شیخ مجدد الف ثانیؒ کے والد گرامی کی قبر کے پاس ہی دفن کر دیا گیا جس دن شیخ صاحب کو ہم دفن کر کے قبرستان سے واپس آئے۔ اسی دن سی آئی ڈی والا پولیس کو لے کر حکیم صاحب کے مکان پر گرفتاری

کے لیے آیا، تو حکیم صاحب نے اُسے ڈانٹ پلائی کہ کم بخت اسے تو ہم دفن کر آئے ہیں جاؤ قبر سے نکال لو۔ یہ شیخ عبدالرحیم کے بارے میں مولانا سندھیؒ نے اپنی کتاب "کابل میں سات سال" کے اندر بھی کچھ احوال لکھے ہیں۔ سرگزشت کابل میں لکھا ہے اس وعدہ پر مولانا سندھیؒ نے ریشمی خطوط دے کر شیخ عبدالحق نومسلم کو ہندوستان بھیجا تھا کہ شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی کو پہنچائے۔ اس نے بے ایمانی کر کے حق نواز افغانی کو جس کے پاس یہ مسلمان ہوا تھا حوالے کر دیئے اور اس نے گورنر پنجاب اڈوائر کو دیئے۔ جس سے سندھ پنجاب اور دہلی میں گرفتاریاں ہوئیں اور مولانا شیخ الہندؒ کو مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کیا۔ حق نواز کو اس خدمت کے عوض بارہ مربع زمین ملی اور خان بہادر کا خطاب۔

(صـ ۱۱۶)

اس راز کے افشا ہونے پر وہ تمام حضرات جو اس سلسلہ سے کسی نہ کسی طرح متعلق تھے ان کی اکثریت کو گرفتار کیا گیا اور طرح طرح سے اذیتیں پہنچائی گئیں۔ دین پور کے حضرت مولانا غلام محمد صاحبؒ اور امروٹ کے سید تاج الدین امروٹیؒ اور مولانا عبداللہ لغاریؒ اور مولانا محمد صادق کراچیؒ والے وغیرہ حضرات نے مختلف قسم کی سزائیں پائیں۔

مولانا سیف الرحمٰن

سرگزشت کے جامعین نے حضرت مولانا سیف الرحمٰن کے متعلق بھی غلط بیانی سے کام لیا ہے کہ وہ آخر میں انگریزوں سے معافی مانگ کر ان کے لیے کام کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بالکل کذب صریح غلط بیانی ہے۔ مولانا سیف الرحمٰن قندھاری پٹھان تھے اور ٹونک میں رہتے تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے مرید اور شاگرد بھی اور حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے بھی علم حدیث میں شاگرد تھے اور قدیم سے ہی شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی کے سرگرم رکن تھے۔ جنگِ عظیم شروع ہونے سے پہلے ہی شیخ الہندؒ نے ان کو آزاد قبائل میں بھیج

کر انگریز کے خلاف محاذ میں کام کرنے کی تاکید فرمائی تھی اور وہ وہاں چلے گئے۔ یہ مولانا سندھیؒ کے رفیق تھے۔ ان کے خلاف نہیں تھے اور آخر تک انگریز کے خلاف رہے ہیں۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب ہمارے استاذ حکیم فضل الرحمٰن تلمیذ مولانا سندھی کے ماموں تھے اور رولٹ ایکٹ رپورٹ میں بھی انگریزوں نے مولانا سیف الرحمٰن کو منحرفین یعنی باغیوں میں شمار کیا ہے۔ وہ کسی وقت بھی انگریز کے موافق نہیں رہے۔ ان میں کسی قسم کی لچک اور میلان انگریز کی طرف نہیں ہوا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ضرور اس کا ذکر اس رپورٹ میں ہوتا، کیونکہ اس قسم کے تمام لوگوں کا ذکر اس میں موجود ہے جو کسی نہ کسی طرح انگریز کے حق میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور پھر خود ایک مقام میں سرگزشت والے لکھتے ہیں۔ مولانا سیف الرحمٰن صدر مدرس مدرسہ فتح پوری دہلی کے تھے۔ ان کو مولانا شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۳ء میں حکم دیا تھا کہ تم یاغستان چلے جاؤ اور حاجی ترنگ زئی کے ساتھ مل کر افغانستان کی سرحد پر انگریزوں سے بغاوت کرتے رہو۔ پھر جب ۱۹۱۴ء میں جنگ جرمنی شروع ہوئی تو انہوں نے انگریزی سرحد پر حملے شروع کر دیے۔ انگریزوں نے مولانا کے بال بچوں کو دہلی میں نظر بند کر دیا اور وائسرائے ہند نے ان کو خط لکھا کہ اگر تم واپس ہندوستان میں آجاؤ تو تمہارے بال بچوں کو آزاد کر دیا جائے گا اور تم کو بھی بڑی عزت دی جائے گی۔ مولانا سیف الرحمٰن نے اس کے جواب میں لکھا کہ "میری عزت یہی ہے کہ تاریخ میں لکھا جائے گا کہ مجھ سے ہندوستان کا بادشاہ ہندوستان آنے کی التجا کرتا ہے کہ تم واپس آجاؤ۔ یہ عزت میرے لیے کافی ہے اور میرے بال بچے میرے نہیں ہندوستان کے بادشاہ کی رعیت ہیں۔ ان کے ساتھ جو برتاؤ چاہو کرو اور میرے ساتھی میرے ساتھ ہیں۔ یہ میرے بچے ہیں اور میرے دوست ہیں۔"

(سرگزشت صہ ۱۶۱)

مولانا عزیر گلؒ

افسوس صد افسوس کہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی کے ایک عظیم رکن عالم باعمل سید محمد عزیر گل کاکاخیل بھی آخر میں واصل بحق ہو گئے۔ مولانا شیخ الہندؒ کی وفات کے تقریباً ستر سال بعد تک زندہ رہے۔ مولانا عزیر گل صاحب تقریباً ۱۳۰۰ھ میں زیارت کاکا صاحب کی بستی میں سید شہید گلؒ کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماحول میں حاصل کرنے کے بعد جب شعور و آگہی کی منزل میں داخل ہوئے تو دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک وفادار خادم جانثار فدائی کی طرح حضرت کی خدمت میں رہ کر تمام تعلیم مکمل کی اور ہمہ وقت حضرت کی خدمت کو مقدم جانا اور آپ کی تحریک کے ایک نہایت وفادار رازدار بن کر ساری عمر اسی سلسلہ میں گزار دی تعلیم سے ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۳ء) میں فارغ ہوئے۔ اس کے بعد ہمہ وقت مولانا شیخ الہندؒ کے پاس ہی رہتے تھے اور آپ کے معتمد خاص تھے اور آپ کے خزانچی بھی تھے اور آنے جانے والے آپ کو گھر ہی کا ایک فرد خیال کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ ہی حجاز گئے اور وہاں گرفتار ہو کر مالٹا میں بھی آپ کے ساتھ رہے۔ رہائی کے بعد تاحیات حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ہی رہے اور آپ کی وفات کے بعد بھی عرصہ تک آپ کے مکان پر ہی مقیم رہے۔ رولٹ ایکٹ رپورٹ والوں نے لکھا ہے کہ "یہ آتشین مزاج ہے طالب علمی کے زمانہ سے مولانا محمود حسن کا پکا مرید بن گیا۔ بڑا اہم سازشی"۔

ان کی پہلی اہلیہ کی وفات ہو گئی تھی۔ بعض حضرات کی کوششوں سے حضرت شیخ الہندؒ کی بھانجی کی لڑکی سے ان کا عقد نکاح ہو گیا۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں دیوبند خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ اس کے بعد مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں عرصہ تک صدر مدرس رہے۔ رڑکی کے قیام کے زمانہ میں ان کی دوسری اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا اور

اسی زمانہ میں ایک انگریز نومسلم خاتون سے اس کی خواہش کے مطابق عقد نکاح کر لیا۔ یہ خاتون غالباً صوبہ سندھ کے انگریز کمشنر کی بیٹی تھی اور دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، شادی شدہ تھی اس کا لڑکا تھا اور لڑکی بھی۔ خوش قسمتی سے عیسائی مذہب کے بارہ میں اس کو تردد ہوا تو سچے مذہب کی تلاش میں پہلے بدھ مذہب کی طرف راغب ہوئی، لیکن اس سے بھی دل برداشتہ ہو کر اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ مختلف لوگوں سے شکوک وشبہات کا تذکرہ رہتا تھا۔ پوری طرح دلجمعی نہ ہوتی تھی۔ آخر ان خوش بختی نے اس خاتون کی مع اپنی صاحبزادی کے دیوبند حضرت الاسلام مدنیؒ کی مجلس تک رسائی کرائی۔ اپنے شکوک وشبہات ذکر کیے۔ حضرت مدنیؒ کے جوابات سے اور آپ کی شخصیت اور روحانی قوت سے بے حد متاثر ہو گئی اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے اسلام اس کی طبیعت میں راسخ کر دیا۔ اس خاتون نے اپنی پوری داستان سب سے پہلے علی گڑھ گزٹ میں انگریزی زبان میں شائع کرائی تھی۔ اس سے دیگر جرائد نے اردو میں اسے منتقل کیا تھا۔ اس خاتون نے خود بیان کیا کہ الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سچے دین کی تلاش میں کامیاب کر دیا اور دین اسلام کے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور پھر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی کہ میرا تعلق مسلمانوں میں ایک ایسے شخص سے پیدا کر دیا جس کا تعلق خاندان نبوت سے تھا اور مجھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریق معلوم کرنے میں دشواری نہیں پیش آئی کہ میرے خاوند یعنی مولانا عزیر گل صاحب کے گھر اور ماحول میں اسلام کی وہی قرون اولیٰ کی سادگی اور اخلاق نبوی، عبادت کا التزام، مہمان نوازی وحسن معاشرت اسی طرح موجود تھی۔ مولانا عزیر گل کی رفاقت میں رہ کر قرآن کریم اور سنت مطہرہ کی تعلیم سے روشناس ہوئی۔ اس محترم خاتون کا خود بیان تھا کہ مجھے نکاح کی ضرورت نہ تھی۔ عمر کا کافی حصہ گزر چکا تھا، لیکن میں نکاح کی اس لیے خواہش مند ہوئی کہ یہ سنت ہے اور کل قیامت کو مجھ سے اس کے بارے میں باز پرس نہ ہو کہ تو نے اس سنت کو کیوں ادا نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے کے

بعد اس محترم خاتون صاحبہ نے پردہ کی اسلامی حدود کی مکمل پابندی کی۔ کجا یورپین وضع قطع کی عادت اور پھر مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد مکمل طور پردہ کی پابندی۔ صوم و صلوٰۃ تلاوت قرآن پاک اور اوراد و وظائف کا التزام۔ زہے خوش قسمتی۔ حضرت مولانا عزیر گل تقسیم ہند کے وقت اپنی اس نو مسلم اہلیہ اور بچوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن سرحد میں سخاکوٹ بازار سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹی بستی مقام سیری (میانگانو کلے) میں کچا مکان بنا کر اس میں رہائش پذیر ہو گئے اور یہ خاتون تقریباً بتیس سال سے زیادہ عرصہ آپ کے نکاح میں رہ کر واصل بحق ہو کر اسی سرزمین میں دفن ہو گئی۔ مولانا عزیر گل جس قدر بہادر اور شجاع تھے۔ اسی قدر متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ نام و نمود شہرت سے نفرت تھی۔ رسمی امور سے بہت دور رہتے تھے۔ اقراء ڈائجسٹ والے مدیر صاحبان جب مولانا یوسف بنوری کی وفات پر مولانا عزیر گل صاحب کے پاس پہنچے تاکہ ان کے تاثرات مولانا بنوری کے بارے میں معلوم کر کے قلم بند کریں جب کہ مولانا یوسف صاحب کے حضرت مولانا عزیر گل سے بہت گہرے مراسم تھے اور مولانا بنوری تو تقریباً آپ کے فدائی تھے لیکن مولانا عزیر گل نے فرمایا۔ فضول باتیں چھوڑ دو "بس یوسف اچھا آدمی تھا" مولانا عزیر گل اپنے ذاتی حالات بیان کرنے سے بہت گریز کرتے تھے۔ بہت دریافت کرنے پر مختصر بات کر کے ختم کر دیتے تھے۔ کہتے تھے جو کام کی بات ہے وہ کر دو۔ مولانا مدنی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے۔ جب ۱۹۴۲ء میں حضرت مدنی کی گرفتاری عمل میں آئی تو دارالعلوم کے متعلقین اور طلباء بہت پریشان تھے۔ کسی مخالف نے کہہ دیا کہ حسین احمد گرفتار ہوا تو کیا ہوا۔ "تمہارا باپ تھا گرفتار ہوا تو ہونے دو۔" اس پر مولانا عزیر گل نے بھی جامع مسجد دیوبند میں مولانا احمد سعید دہلوی کی تقریر کے ساتھ مختصر تقریر کی تھی جب لوگوں نے حضرت مدنی کی گرفتاری پر یہ بات کہی تھی اس کا رد کیا اور کہا کہ

بدباطن ہے جو ایسی بات کرتا ہے۔ "حسین احمد ہمارا باپ ہے ہمارا باپ ہے" بار بار جوش سے یہ جملہ دہراتے تھے۔ حضرت مدنیؒ کے ساتھ بہت بے تکلفی تھی۔ خوب آپس میں مزاح کرتے تھے۔ انتہائی بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک جلسہ میں مسٹر گاندھی نے بھی تقریر کی تھی اور مولانا عزیر گل صاحب نے بھی تقریر کی۔ خلافت کی تحریک کے سلسلہ میں چونکہ مسٹر گاندھی خلافت کے مؤید تھے اور مسلمان بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور پھر انگریز کے خلاف بھی جدوجہد میں مسٹر گاندھی کا جذبہ بہت قوی تھا۔ الغرض کہ مسلم غیر مسلم سب ہی گاندھی کو اپنا لیڈر مانتے تھے تو مولانا عزیر گل صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی صاحب ہمارے لیڈر ہیں۔ جیسا یہ کہیں گے ہم کریں گے لیکن یہ بات ان کو یاد رکھنی چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ایک خلیفۃ المسلمین کی بات بھی نہیں مانتے اگر وہ غلط اور ناحق ہو تو کئی سال پہلے بھکر والے مولانا محمد عبداللہ صاحب بمع چند دیگر علماء کے مولانا عزیر گل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کافی دیر تک مجلس رہی۔ بہت سی باتیں ہوئیں پھر انہوں نے عرض کیا کہ حضرت کچھ نصیحت فرمائیں تو فرمایا کہ مجھے بزرگ نہ سمجھنا۔ بس یہی خیال کرنا کہ ایک پرانا آدمی ہے جس نے پرانے لوگوں کو دیکھا ہے"۔ حضرت مدنیؒ نے نقش حیات میں حضرت مولانا عزیر گلؒ کا جن الفاظ میں تذکرہ کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں مولانا عزیر گل صاحب کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ صوبہ سرحد کے دشوار ترین اور مشکل راستوں سے چل کر بہت سے خاص لوگوں کے ساتھ رابطہ حضرت شیخ الہندؒ کا مولانا عزیر گل صاحبؒ کے توسط سے ہی ہوتا تھا جس طرح سندھ کے اہم ترین افراد کا رابطہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے توسط سے قائم تھا اس سلسلہ کے بڑے بڑے کام اور راز مولانا عزیر گل کو معلوم تھے اور مولانا شیخ الہندؒ کے اہم ترین راز دانوں میں ایک وہ بھی تھے! حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ نے جو اپنی کتاب میں مولانا عزیر گلؒ کے بارے میں لکھا

ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیں۔

"مولانا عزیر گل صاحب قصبہ زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خادم ہیں مشن کے ابتدا سے ممبر رہے اور نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیمہ انہوں نے بہت انجام دی ہیں۔ عموماً حضرت شیخ الہندؒ ان پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کے پاس انہیں کو بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گزار اور خطرناک راستوں کو قطع کر کے نہایت رازداری اور بہت داستقلال کے ساتھ یہ بار بار آتے جاتے رہے ہیں پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی صاحب اور علماء سرحد و باغستان اور دیگر خوانین کو مشن کا ممبر بنایا اور ان کے پاس پیغام اور خطوط پہنچانا، ان کو ہموار کرنا، ان کا اور مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا فریضہ تھا جس کو ان دونوں حضرات نے اوقات مختلفہ میں انجام دیا۔ باوجودیکہ سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگی رہی، مگر انہوں نے کبھی اس کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ بارہا ان کو بھیس بدلنا اور انجان علاقوں میں گزرنا پڑا، مگر نڈر ہو کر ان کو قطع کیا۔ ہر قسم کے خطرات میں بلاخوف و خطر اپنے آپ کو ڈالتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت مخلص اور فدائی ہیں کسی قسم کی طمع اور غرض نفسانی نہیں رکھی، نہ حضرت سے جدا ہوئے۔ لوگوں نے بہت کوششیں کیں کہ یہ جدا ہو جائیں، مگر انہوں نے گوارا نہ کیا اور ہمیشہ عاشقانہ دلولوں کے ساتھ خدمت میں حاضر رہے۔ حتیٰ کہ مالٹا کی اسارت میں بھی انتہائی دل جمعی سے شریک اور رفیق رہے۔ ہر قسم کی خدمت کو اپنے لیے خوش نصیبی سمجھا۔ کئی لوگوں نے ان کو سی آئی ڈی مشہور کیا۔ آوازے کسے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھڑکایا بدظن کرنے کی کوششیں کیں، مگر حضرت مردم شناس دماغ اور قلب رکھتے تھے۔ ان کی

طرف سے اخیر تک بدظن نہ ہوئے اور آخر وقت تک ان کو ساتھ رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے رازدار اور مالی سرمایہ کے خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرتؒ کی وفات کے بعد بھی عرصہ دراز تک حضرت کے مکان ہی پر قیام پذیر رہے چونکہ ایام اسارت مالٹا میں اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس لیے بعض احباب کی کوششوں سے حضرت کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح بھی ہوگیا۔ اس سے ان کے دو لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوئیں جو کہ ماشاءاللہ اب جوان ہوگئے ہیں۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کی صدارت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ضروریات معاشیہ کی بنا پر سوختہ (جلونی لکڑی) کی تجارت بھی کرتے رہے، پھر مدرسہ رحمانیہ اڑکی ہیں صدر مدرس ہوگئے۔ وہاں ہی ایک میم سے ایک انگریز نو مسلم خاتون، سے اس کی خواہش پر دوسری محترمہ کی وفات کے بعد نکاح کرلیا۔ پھر اپنے بچوں اور اس تیسری اہلیہ کو لے کر وطن ضلع پشاور میں چلے گئے اب وہیں ہی اقامت گزین ہیں"۔ (نقش حیات ج ۲ صہ ۱۹۱)

افسوس کہ آزادی ملنے کے بعد ایسے افراد کی کوئی قدر ومنزلت نہیں کی گئی، وہ اپنی زندگی کے ایام عسرت میں بسر کرتے رہے۔

مولانا عزیر گل صاحب کی انگریز نو مسلم بیوی بھی خدا کی نعمت تھی جو اپنی آسودہ حالی وخوشحال زندگی ترک کرکے اس مرد مومن کے ساتھ آخر وقت صعوبت کی زندگی بسر کرنے پر راضی ہوئی اور اللہ کی عبادت وریاضت وقناعت وصبر واستقامت کا اعلیٰ نمونہ چھوڑ گئی، اللہ تعالیٰ ان دونوں پر اپنے رحمت کے بے پایاں دروازے ہمیشہ کے لیے وا کردے۔

احقر نے ایک مرتبہ حضرت مولانا عزیر گل صاحب کو خط لکھا کہ آپ کی اہلیہ محترمہ نے جو قرآن کی تفسیر اور انگلش ترجمہ کیا ہے اس کے بارے میں فرمائیں کہ وہ کہاں سے دستیاب ہوگا۔ حضرت مولانا نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔۔۔

لله

از ننگ محمد عزیر گل عفی عنہ زادالله معالیکم

برادرم حضرت مولنا عبد المجید صاحب

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاتہ - اما بعد - نوازشنامہ باعث سرفرازی ہوا - ترجمہ قرآن مجید فیروز سنز لاہور حوالہ کیا گیا معلوم نہیں چھاپنے میں کیوں دیر ہو رہی ہے وہاں سے دریافت فرما سکتے ہیں والسلام نوٹ تفسیر نہیں صرف ترجمہ ہے

از ننگ محمد عزیر گل عفی عنہ
معرفت پولیٹیکل ایجنسی مالاکنڈ
۵/۶/۱۰

حضرت شیخ الہندؒ نے جو مالٹا کی اسارت کے زمانہ میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا تھا اور سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ اس ترجمہ کی بہت فکر تھی کہ یہ کسی طرح لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔ یہ ترجمہ بہت ہی عمدہ۔ آسان اور بامحاورہ ہے۔ واپسی کے وقت بحری جہاز طوفان کی زد میں آگیا، تو ڈوبنے کا شدید خطرہ ہوگیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عزیر گل سے فرمایا کہ تم پانی میں تیرنا جانتے ہو۔ اس لیے اس ترجمہ قرآن کو سینے سے باندھ لو۔ اگر حادثہ ہو گیا تو کوشش کرنا کہ یہ کسی طرح بچ جائے۔ شدید طوفان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور جہاز ساحل بمبئی تک بخیر پہنچ گیا۔ اس ترجمہ اور تفسیر سے تمام دنیا میں بالعموم اور برصغیر میں بالخصوص بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس فیضان کو قیامت تک جاری وساری رکھے

اسارت مالٹا کے سلسلہ میں حضرت مدنیؒ نے جو تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بخدا ہم قید وتنہائی میں پھنسے ہوئے تھے اور اس قسم کے حالات ہم پر کبھی نہیں گزرے تھے۔ اعزہ واقرباء سے دور کوئی غمگسار نہ مونس۔ مگر ہم سے کسی چھوٹے یا بڑے کو کوئی اضطراب وقلق اور بے چینی نہیں تھی۔ حالانکہ عام طور پر ہم سب کو یقین یا ظن غالب پھانسی کا تھا۔" مولوی عزیر گل صاحب تو اپنی کوٹھڑی میں رہ رہ کر اپنی گردن کو پھانسی کے لیے ناپتے اور دباتے تھے۔ تاکہ ذرا عادت ہو جائے اور پھانسی کے وقت یک بارگی تکلیف سخت پیش نہ آئے اور تجربہ کرتے رہے کہ دیکھوں کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر سب کے دل نہایت مطمئن تھے۔" (اسیر مالٹا صہ ۹۱)

ان حضرات کو قید تنہائی کی کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ ان کو اہل مصر زنزنہ کہتے تھے۔ بروز پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ ۱۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو مولانا شیخ الہندؒ کو بیان کے لیے کچہری میں بلایا گیا۔ یہ دن مولانا شیخ الہندؒ پر بہت سخت گزرے کیونکہ ان کو اپنے رفقاء کی فکر زیادہ تھی، چنانچہ ان چھ سات دنوں تک حضرت نے چارپائی پر کمر بھی نہیں لگائی تھی، بلکہ چارپائی کی پائنتی زمین پر کمبل بچھا کر بیٹھ گئے اور قرآن دلائل الخیرات تسبیح۔ مراقبہ اور نماز وہیں کمبل پر سب مشاغل ادا کرتے تھے، مراقبہ میں بیٹھے بیٹھے کچھ نیند آگئی آگئی ورنہ استراحت بالکل نہیں فرمائی۔ ہم میں سے کوئی نہ ان کو دیکھ سکتا تھا اور نہ وہ ہم کو دیکھ سکتے تھے اور نہ آپس میں باتیں کر سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام

مدت اسارت میں یہ سات آٹھ دن ہم سب پر نہایت سخت گزرے۔ مگر سب سے زیادہ سختی مولانا مرحوم پر ہوئی (اسیر مالٹا صہ ۹۴)

حضرت شیخ الہندؒ کے بیان کے بعد حضرت مدنیؒ کا بیان جمعہ کے دن شروع ہوا اور دو دن تک ہوتا رہا۔ پھر مولانا عزیر گل کا اور سید وحید احمد مدنیؒ کا بیان۔ آخر میں حکیم سید نصرت حسین کا بیان ہوا۔ یہ زمیندار تھے اور زمینوں کے سلسلہ میں مقدمہ بازی کے سلسلہ سے خوب واقف تھے اور انگریزی بھی جانتے تھے۔ ان کا بیان اسی انداز کا ہوا۔

حضرت مدنیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ کے فضل وکرم سے اور مولانا کی برکت سے سب کے بیانات تقریباً متفق رہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے استقلال وصداقت پر قائم رکھا۔

حضرت مدنیؒ لکھتے ہیں "مولوی عزیر گل صاحب سے حدود (سرحد) کے واقعات، قبائل کے احوال، سید احمد شہیدؒ مرحوم ومغفور کے قافلہ کی خبریں، حاجی عبدالغفور صاحب (المعروف بہ باباسوات)۔ حدود (سرحد) کے بڑے پیروں میں سے تھے۔ وہ اس زمانہ میں انگریزی علاقہ سے اپنے اہل وعیال کو لے کر یاغستان میں چلے گئے تھے اور وہاں مشہور ہوا تھا کہ انہوں نے جہاد کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب، مولانا عبیداللہ صاحب، مولانا محمد میاں صاحب وغیرہ وغیرہ حضرات کے متعلق زمین وآسمان کی واہی تباہی باتیں پوچھیں۔ جن کا نہ سر تھا نہ پیر، مگر مولانا عزیر گل صاحب نے نہایت استقلال اپنے روایتی اکھڑپنے (پٹھانی لہجہ میں) سب کا جواب دیا اور بہت ہی متین جواب دیا۔" (اسیر مالٹا صہ ۹۲)

مولانا عزیر گل صاحب کی نومسلم اہلیہ محترمہ کے تاثرات اس طرح ہیں۔ وہ خود فرماتی ہیں "عزیر گل کے گھر میں میں نے سیکھا کہ خود بھوکے رہ کر مہمان کی تواضع کرنے میں کیا لذت ہے، عزیر گل کے گھر میں مجھے زندگی کی حقیقی راحت ملی۔ وہ نہایت شریف اور مہربان شوہر ثابت ہوئے۔ یوں بھی وہ سید ہیں اور انہوں نے سیادت کی لاج رکھی

ہے۔ ان کے آباؤ اجداد عرب سے افغانستان اور افغانستان سے ہندوستان آگئے تھے اب تو ہم دونوں راہِ حق کے مسافر تھے اور راہِ حق کی مسافرت ہیں مشرق و مغرب کیسے ہماری راہ ایک تھی۔ ہماری منزل ایک تھی، ہماری روحیں ہم آہنگ تھیں۔ ہم دونوں اللہ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا ارادہ لے کر اٹھے تھے "۔ افسوس کہ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ خادم خاص اور آزادی برِ صغیر کا ایک بڑا رہنما اور راہِ حق کا یہ عظیم مسافر ۱۶ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ بمطابق ۱۶ نومبر ۱۹۸۹ء بروز جمعرات آب و گل کی اس شاہراہ کو عبور کر کے عالم آخرت اور حظیرۃ القدس کی طرف روانہ ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ العظمۃ والبقاء للہ

تعالی اللہ لا یبقی سواہ

اذا وردت بریتہ الفناء

ولی اللٰہی پروگرام کا اجمالی بیان

امام ولی اللہ کی حکمت میں سب سے پہلے ضروری ہے۔

(۱) فک کل نظام۔ ہر نظام کو پہلے توڑنا ہے خواہ نظام سرمایہ داری، ملوکیت و شہنشاہیت، شاہی ڈکٹیٹرشپ، سوشلزم جو الحاد پر مبنی ہو۔ نیشنلزم جو ایمان سے خالی ہو اور فوضویت انارکزم وغیرہ تمام نظاموں کو درہم برہم کرنا ضروری ہے اور انقلاب کی شرطِ اوّل ہے۔

(۲) اس کے بعد سب سے پہلے فکر کو پاک کرنا ضروری ہے یعنی ایمان اور توحید کا پاکیزہ عقیدہ اختیار کرنا۔ رسالت اور قیامت پر یقین اور اسی عقیدہ پر مسکین نوازی کی بنیاد قائم کرنا۔

(۳) تقشف (POVERTY) اور رفاہیت بالغہ (LUXURY) کو ختم کرنا اور حالت متوسطہ کا قیام خوراک (روٹی پانی) رہائش (مکان) لباس صحت تعلیم کے لیے ایک متوسط حالت قائم کرنا جس میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہو سکیں۔

(۴) تعلیم کو جبری اور لازمی بنانا۔

(۵) ارتکاز دولت کو روکنا۔

(۶) تعیش کے اسباب کو مٹانا یا کم سے کم کرنا۔

(۷) تعیش والے پیشے اور حرام پیشوں کو ختم کرنا اور ممنوع قرار دینا اور تمام جائز اور مفید پیشوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور پیشوں کی صحیح تقسیم کرنا۔

(۸) مال کے جمع و خرچ کے قانون (حلال و حرام) کی پابندی کرنا۔

(۹) اپنی جائز ضروریات زندگی سے زائد اثاثہ، جائیداد اور مال کو رفاہ عامہ (عوامی مصلحت) کے کاموں پر خرچ کرنے کے لیے جماعت کے نام منتقل کرنا۔

(۱۰) جدید دنیا نے جن چیزوں میں مادی لحاظ سے ترقی کی ہے۔ اپنے ماحول اور حالات کے مطابق ان سے استفادہ کرنا۔ اس بات کو کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر فن و ہنر فلسفہ یا حکمت تمام انسانوں کی متاع مشترک ہے۔ کسی خاص قوم یا طبقہ یا ملک کی میراث نہیں کہ باقیوں کو اس سے محروم کر دیا جائے۔ (خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ البقرہ) کے تحت تمام انسان اس میں شریک ہیں۔ البتہ استفادہ کے لیے جو اصول قرآن یا اسلام نے متعین کیے ہیں جن کی بہتر تفصیل امام ولی اللہؒ نے کی ہے ان کو کام میں لانا چاہیے، چنانچہ حق استفادہ یا خرید و راثت۔ وصیت۔ ہبہ، وقف، صدقہ خیرات، عطیہ اور تحصیل حق سے حاصل ہوگا اور یہی ارتکاز دولت کے روکنے کے ذرائع ہیں۔ کوئی بھی ایسا نظام فطرت کے خلاف ہوگا جو مذہب و دین کی گنجائش اپنے اندر نہ رکھتا ہو یا چھوٹے اور محدود پیمانے پر انفرادی ملکیت کو جائز نہ قرار دیتا ہو۔ اکثر و بیشتر مذہبی رہنماؤں نے پرانے امپیریل نظاموں یعنی سرمایہ داری اور ملوکیت یا مستبد ڈکٹیٹروں کے لیے مذہب کو آلہ کار بنایا جس کی بنا پر ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھا بقول ابن خلدون "ابعد الناس عن السیاسۃ العلماء" علماء اکثر و بیشتر اپنی سادگی کی وجہ سے مات کھا جاتے ہیں اور دوسری جماعتوں کے دم چھلے بنے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی سیاست ناقص ہوتی ہے، لیکن علماء میں کامل عقل و فراست رکھنے والے اور پولیٹیکل معاملات کو کما حقہ سمجھنے والے حضرات بھی بہت ہیں اور

ہمیشہ رہے ہیں، علمائے کرام ذہنی شعور کے اعتبار سے تو بلاشبہ بہت آگے ہوتے ہیں لیکن جدید علوم وفنون اور رائج الوقت زبانوں سے نابلد ہونے کی وجہ سے اکثر ان کی تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے۔ اسی لیے مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات بہت اونچے ہو گئے ہیں اور علماء بہت پستی میں چلے گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ علماء کو ذرا اونچا کیا جائے، تاکہ یہ دونوں گروہ مل کر انسانیت کی خدمت کر سکیں۔ اس لیے مولانا جدید سائنس اور انگلش زبان کی تحصیل پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اپنے استاذ الاستاذ حضرت نانوتویؒ کی خواہش کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں۔ ہر فن کو اس کے موجدوں کی اصل زبان اور ان کی مقرر کردہ اصطلاحات میں ہی سیکھنا چاہیے۔ خواہ وہ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، جاپانی، روسی، چینی، ہندی اور عربی وغیرہ ہو۔ اپنی توجہ عربی ترجمہ پر مرکوز کرنے سے اس قدر فائدہ نہیں ہوگا جس قدر اس کی اصلی زبان سے حاصل ہوگا۔ بلاشبہ گزشتہ چار صدیوں سے جب سے کہ اقوام مغرب (یورپین اقوام) اور بعض ایشیا کی قومیں جس قدر اور جس تناسب سے ترقی کی طرف گامزن ہوئی ہیں اور انہوں نے صنعت و حرفت اور ٹیکنالوجی میں عروج حاصل کیا ہے اور غیر معمولی اکتشافات اور انکشافات کیے ہیں اور مختلف علوم وفنون بالخصوص فوجی اور عسکری علوم یا ملٹری ازم میں غیر معمولی فوقیت حاصل کی ہے، اسی تناسب سے مسلمانوں نے پسپائی اور تنزل کا راستہ اختیار کیا ہے اور جب سے ترکی خلافت کی ملٹری سائنس کمزور ہوئی ہے، مسلمان اپنے کسی ملک کا دفاع نہیں کر سکے اور ہر آنے والا دن مسلمانوں کے لیے گزشتہ سے زیادہ ہولناک ثابت ہوا ہے۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے اعاظم رجال اس دور میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن مسلمانوں نے ان کی قیادت کو قبول نہیں کیا۔ آج بھی مسلمان دوسری اقوام کے دست نگر اور محتاج ہیں۔ غلامی یا نیم غلامی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امامت و قیادت کا سلسلہ ان کے ہاتھ میں آج نہیں

رہا۔ حالانکہ ہر قسم کے اسباب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں، لیکن غلامی کی وجہ سے ذہن اور فکر اپنی نہیں۔ دوسروں سے مانگی ہوئی چیزوں پر گزارہ کرتے ہیں اپنی فکر اور فلسفہ تقریباً کھو چکے ہیں۔ بالخصوص اجتماعیات میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ گوکہ انفرادی حالات میں آج بھی بہتر متدین، اتقیہ اور متقی مسلمان موجود ہیں۔

اسلام نظامِ فطرت ہے

حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ "تقریباً ایک سو سال سے جب نوامیس طبعیہ کا انکشاف ہوئے ہیں اور آلات کا اختراع ہوا ہے اور وسیع پیمانے پر فیکٹریاں اور کارخانے قائم ہوئے ہیں، تو تمام ممالک میں تغیر عظیم واقع ہوا ہے۔ تمام گھریلو نظام اور فیملیوں کے تمام نظام بگڑ کر رہ گئے ہیں اور یہ بگاڑ مردوں اور عورتوں کی فطرت کے اعتبار سے ہوا ہے اور سرمایہ دار جو کارخانوں اور فیکٹریوں اور آلات کے مالک ہیں۔ ان کی نظر صرف مال کمانے میں ہوتی ہے۔ وہ اس کی رعایت نہیں کرتے کہ ضعفا یا اقربا کی فطرت کا کیا تقاضا ہے اور نہ ان سرمایہ داروں میں مظلوموں پر رحمت اور شفقت ہوتی ہے، انہوں نے لوگوں کو دبا رکھا ہے اور اجتماعی نظام کلیتہً تبدیل کر دیا ہے اور یہ انقلاب جس کو تم مغرب (یورپ) میں دیکھتے ہو۔ یہ وبائی بیماری کی طرح پھیل رہا ہے اور یہ تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ یہ تمام ممالک میں پھیل جائے گا اور تمام لوگ اس کی زد میں آئیں گے اور پھر اس کے بعد لوگ فطرت کی طرف لوٹیں گے اور اشتراکی نظام جو کہ سرمایہ داری کے سرکش نظام کے مظالم کے قلع قمع کے لیے قائم ہوا ہے اور یہ سرمایہ داری کے نظام کا تعاقب کرے گا۔ آخر کار یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا اور لوگ اس اشتراکیت کی کامیابی اور سرمایہ داری کی پامالی کے بعد فطرت اور اس کے قانون کی طرف لوٹیں گے اور یہ ہمارا خیال ہے اور ہم مایوس نہیں اس بات سے کہ قرآن کے قانون کی طرف پلٹ

کہ اس کو اپنائیں گے۔ یہ مردوں اور عورتوں کی فطرت وبائی مرض کی وجہ اور عارضی فساد سے دبی ہوئی ہے۔ قرآن کی اجتماعیت کو توڑ نہیں سکتے، بلکہ سرمایہ داروں نے جن چیزوں کو ظاہر کیا ہے۔ یہ اس کا ابطال ہے۔ اگرچہ اس کا ابطال بھی آسان نہیں، بلکہ اس سے ان پر ایک قسم کی قیامت برپا ہوگی۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ کسریٰ و قیصر جو کہ سرمایہ داری نظام کے حامل تھے اور تمام دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے اپنے انقلاب کے ذریعے ان پر قیامت برپا کی، ایران و روم یا عراق و شام اس انقلاب سے مغلوب ہوکر ختم ہوگئے۔ اور قرآن کی برپا کردہ اجتماعیت ان تمام بلدان و ممالک میں کسی نہ کسی رنگ میں تقریباً ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ پھر انحطاط شروع ہوگیا اور نظام سرمایہ داری چھا گیا۔ موجودہ دور میں سرمایہ داروں نے تمام معاملات کو خراب کر رکھا ہے ان کے مظالم ختم کرنے کے لیے ان پر بھی قیامت برپا ہوگی اور شہر و ممالک اس کی نجاست سے پاک کیے جائیں گے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کی ہی اجتماعیت غالب آئے گی لیکن اس تعبیر و تفسیر کے ساتھ جس کو امام ولی اللہ دہلوی نے پیش کیا ہے اور اشتراکیوں نے ہمارے سامنے اعتراض کیا کہ جس قسم کی اجتماعیت کے بارہ میں تم کہتے ہو کہ قرآن کی اجتماعیت ہے۔ یہ اگر کہیں قائم ہو تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے اور ہر قسم کے انقلاب سے راحت پا جائیں گے۔ (مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں) اگر مسلمان اشتراکیوں کی تلوار کی زد سے بچنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کے ساتھ تمسک کرنا چاہیے۔ اس تفسیر کے مطابق جو امام ولی اللہؒ نے کی ہے اور مسلمان اس وہم سے باہر نکل جائیں کہ فطرت کا حکم بدل سکتا ہے"

(الہام الرحمٰن ص ۲۷۷ ج ۱)

"مجھے یقین ہے کہ ناظرین میری شخصیت سے ناواقف نہ ہوں گے۔ میں ایک ہندوستان دھرمی کے گھر پیدا ہوا اور ایک ہندو نومسلم (شیخ عبید اللہ) کی کتاب "تحفۃ الہند" میں نے دیکھی جو ایک برہمن کے واسطے سے مجھے ملی تھی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اسلام کی حقانیت میرے

اوپر ظاہر ہوئی اور میں سولہ برس کی عمر میں مسلمان ہو گیا۔ پھر علوم دینیہ میں تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کی تو میں مسلمان ہندو خاندان سے مسلمان ہوا ہوں۔ اسی طرح باقی مسلمان ہندو بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں میرا ابتدائی مطالعہ سے یقین تھا کہ سب مسلمان ہندوستانی ہیں۔ ان کو بیرونی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اور جو بزرگ فاتحانہ طور پر ہندوستان داخل ہوئے، وہ بھی یہیں کے ہو کر رہ گئے اور جو خاندان اس نئے مذہب اور اسلامی تمدن کو قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے ان کی اولاد اول درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندو قوم کا نومسلم اور اسلامی فاتحین کی اولاد میں فرق کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں کو بہت جلد اس غلط فہمی سے پاک ہو جانا چاہیے۔ میرا یقین ہے کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لیے کوئی مذہب، کوئی فلسفہ کوئی تمدن اور کوئی قانون میسّر نہیں آسکتا اس لیے ہندوستانیوں کو اسے عزت سے مان لینا چاہیے، لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکتا، تو ہم نومسلم کیا ایسے بھی گئے گزرے ہو گئے ہیں کہ اپنی آبادی کے تناسب سے اپنے مذہب کی عزت تمام ہندو بھائیوں سے نہ منوالیں۔ ایک ہندوستانی ہندو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ بہادر اور زیادہ شریف و باعزت تصور کرتا ہے۔" (سرگزشت صفحہ ۸)

ولی اللّٰہی پروگرام کا کچھ مزید بیان

حجۃ اللہ کے ایک باب میں امام ولی اللہؒ نے اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ یعنی معاشی اور اجتماعی پروگرام جس کے اہم اصول امام ولی اللہؒ نے کیے ہیں۔ چنانچہ "اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم" کا ایک باب ہی اس مقصد کے لیے رکھا ہے امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ ہم نے پہلے صراحتاً بھی اور اشارۃً بھی یہ مبحث بیان کر دیا ہے کہ ارتفاقِ ثانی وارتفاقِ ثالث یہ دونوں ارتفاقات انسان اور نوعِ بشر کی جبلت میں داخل ہیں۔ یعنی یہ طبعی، فطری اور نیچرل ہیں اور انہی کی وجہ سے انسان اپنے تمام انواعِ حیوانات سے متمیز اور ممتاز ہوتا ہے۔ کیونکہ ارتفاقِ اول میں جملہ انواعِ حیوانات اور جاندار چیزیں سب شریک ہیں۔ انسان کی طرح، ہر حیوان کو کھانے، پینے، صنفی خواہش پورا کرنے، تپش سے سایہ میں پناہ لینے اور بارش سے بچنے کے لیے کسی محفوظ جگہ اپنے آپ کو محفوظ کر لینے اور سردی کے موسم میں گرمائش اور حرارت حاصل کرنے کی ضروریات سب قسم کے حیوانات کو کم و بیش لاحق ہوتی ہیں اور انسان بھی اُن کے ساتھ ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں شریک ہوتا ہے۔ گو کہ ان جملہ حیوانات کو یہ ضرورتیں طبعی الہام کے ذریعہ یعنی صورۃ نوعیۃ کی راہ سے پورا کرنے کی توفیق ہوتی ہے اور انسان کے لیے طبعی الہام کے علاوہ تعلیم و تربیت اور تقلید و اجتماعیت کے تقاضوں سے بھی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی احتیاج ہوتی ہے اور موقع ملتا رہتا ہے، لیکن انسان

چونکہ مدنی الطبع اور ترقی پسند واقع ہوا ہے۔ اس لیے وہ محض ان احتیاجات اور ضرورتوں کو پورا کرنے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اس کے امور ایک رائے کلی اور عقلی تقاضوں کے مطابق پورے ہوتے ہیں محض محسوس اغراض یا متوہم دواعی سے نہیں، کیونکہ اس کا محض بھوک، پیاس اور صنفی خواہش کو رفع کرنا ہی مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اُس کے سامنے عقلی تقاضوں کے منافع بھی ہوتے ہیں اس لیے اس کا قصد و ارادہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں صالح نظام حاصل کرے یا اپنے اخلاق کی تکمیل کرے یا اپنے نفس کی تعذیب حاصل کر سکے یا پھر وہ آخرت میں گرفت و عذاب سے رہائی حاصل کر سکے یا اپنے وجاہت دبدبہ اور اقتدار کو لوگوں کے دلوں میں قائم کر سکے۔ نیز اس کو نظافت و لطافت کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے تاکہ وہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تسکین قلب اور التذاذ نفس بھی حاصل کر سکے۔ چنانچہ وہ رفیقۂ حیات، مناسب حال، طعام، صاف ستھرا لذیذ، لباس عمدہ اور رہائش حسب حال، مناسب اور موزوں ہونے کا طالب ہوگا اور نیز وہ اپنے ابناء نوع میں سے حکما اور اصحاب تجربہ سے بھی مستفید ہوگا۔ ارتفاق اول میں انسان کے لیے اظہار مافی الضمیر کے لیے کسی نہ کسی بولی یا لغت و زبان کا جاننا بھی ضروری ہوتا ہے اور انسان کی طبعی اور شخصی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کھیتی باڑی، باغبانی اور زمین، پانی نکالنے کے لیے کنوئیں وغیرہ کھودنا۔ ماکولات کو پکانے اور کھانے کے قابل بنانا، سالن وغیرہ کی فراہمی اور کچھ ظروف وغیرہ برتن، مشکیزہ چھاگل وغیرہ کا فراہم کرنا اور جانوروں کو پالنا اور ان سے خدمت لینا سواری کے لیے اور ان کا گوشت استعمال کرنے کے لیے اور ان کی کھالوں، بالوں اور ریشم وغیرہ اور دودھ اور ان کے بچے حاصل کرنا۔ گرمی، سردی سے بچنے کے لیے کسی قسم کا مسکن یعنی مکان فراہم کرنا۔ گرمی، سردی سے بچنے کے لیے جانوروں اور پرندوں کے لیے بھی کوئی غار یا گھونسلا ضروری ہوتا ہے۔ لباس کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی کھالوں

بالوں، پشم اور پرندوں کے پروں میں اور اشجار و نباتات کے پتوں میں ان کا لباس رکھ دیا ہے، لیکن انسان کو یہ ضرورت محنت اور مشقت سے حاصل کرنا پڑتی ہے اور بقاء نسل اور طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انسان کو اپنی رفیقۂ حیات کے متعین کرنے کے لیے کد و کاوش کرنی پڑتی ہے اور انسان کے علاوہ جانور اتفاقات سے ہی اس قسم کا سلسلہ قائم کرتے ہیں اور اس درجہ کی صنعت تو ارتفاق اوّل میں بھی داخل ہے جس سے ضروری آلات انسان حاصل کرے جن کے بغیر زراعت، پانی کا نکالنا، جانوروں کو مسخر کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ جیسے ڈول، رسّی، بھالا، کدال، کسی وغیرہ ایک نہ ایک درجہ تک تبادلہ و تعاون کی شکل بھی اس میں پائی جاتی ہے اور کسی نہ کسی درجہ تک بعض کی بعض پر فوقیت اور برتری بھی لازم ہے۔ اسی وجہ سے وہ دوسروں سے گرفت کرتا ہے اور اُن سے خدمت اور کام لیتا ہے اور کسی نہ کسی درجہ تک کوئی قانون دستور یا رواجی مسلمہ قوانین و قواعد بھی ہوتے ہیں جس کی بنا پر وہ فیصلہ بھی کرتے ہیں جھگڑوں و تنازعات کو مٹاتے ہیں اور ظلم و زیادتی کرنے والے کا دفاع بھی کرتے ہیں اور ایک حد تک ارتفاقات کا استنباط کرنے والے لوگ بھی ان میں موجود ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی ارتفاق کا استخراج یا استنباط کرتے ہیں تو باقی لوگ ان کا اتباع و اقتدار کرتے ہیں اور کسی نہ کسی درجہ تک حسن و جمال، رفاہیت و خوشحالی اور آرام طلبی کو پسند کرنے والے اور خوش اخلاق بہادر، فیاضی و سماحت والے، فصاحت و خوش کلامی والے اور بیدار مغز لوگ اور شہرت پسند اور جاہ طلب بھی موجود ہوں گے۔ اس ارتفاقِ اول کی باتیں قرآنِ کریم میں بکثرت موجود ہیں۔

امام ولی اللہ رح فرماتے ہیں کہ ارتفاقِ ثانی و ثالث چونکہ انسان کی جبلت میں داخل ہے اور محال ہے کہ انسان اس کو ترک کر دیں یا اُن سے لاپرواہی اور تغافل

اختیار کریں۔ اس سلسلہ میں انسان بہت سی چیزوں میں کسی حکیم (دانا) جو اس ضرورت کو پورا کرنے کا طریق جانتا ہو، کی طرف محتاج ہوتے ہیں اور وہ خود بھی مصلحتِ کلیہ (عمومی رائے اور عقلی تقاضوں) کے تابع ہو یا تو وہ غور و فکر یا سوچ و بچار سے اس طریق کو استنباط کرتا ہے یا خود اس کا نفس اپنی جبلت سے (پیدائشی طور پر) قوۃ ملکیہ کا مالک ہوگا۔ اس کی قوۃ ملکیہ ایسی ہوگی جو ملاء الاعلیٰ کے علوم کے نزول کے لیے بالکل آمادہ اور تیار ہوگی اور یہ بات پہلی کی برنسبت زیادہ مکمل اور زیادہ قابل وثوق ہے امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ رسومات کا تعلق ارتفاقات کے ساتھ ایسا ہے جیسا قلب کا تعلق جسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قلب کے بغیر جسم بے جان ہوتا ہے۔ اسی طرح ارتفاقات بغیر رسومات بے معنی بات ہوگی، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رسومات میں مفاسد اور خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ سیادت و قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو عقلی اور رائے کلی سے عاری ہوتے ہیں۔ یعنی رائے عمومی اور انسانیتِ عامہ کے مفاد کو ایسے لوگ بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں (یعنی رائے جزوی اور مفاد پرستی طمع، لالچ، خود غرضی اور خسیس خواہشات کا شکار ہوتے ہیں) تو ایسے لوگ اعمال سبعیہ (درندوں جیسے اعمال) اور شہوانی اعمال اور شیطانی اعمال انجام دیتے رہتے ہیں اور انہی اعمال کی ترویج و اشاعت میں سرگرم رہتے ہیں اور پھر اکثر انسان ان کی ان اعمال میں اقتداء کرتے ہیں اور اس کے علاوہ بعض اور وجوہات بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ مفاسد، رسوماتِ صالحہ میں داخل ہو کر ان کو فاسد کر دیتے ہیں اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسا قوی انسان، مصلح ہو جو مؤید من جانب غیب ہو، یعنی جس کی تائید حظیرۃ القدس اور ملاء الاعلیٰ کی جانب سے ہو، اور پھر وہ بذاتہ مصلحتِ کلیہ کے تابع ہو، ایسا انسان ہی اور ایسا ہی مصلح (ریفارمر) (REFORMER) ان رسومات کو تبدیل کر کے حق کی طرف پھیر سکتا ہے۔ ایسی تدبیر کے ساتھ کہ جس کی طرف

راہنمائی نہیں ہو سکتی۔ بجز اُن لوگوں کے جو روح القدس کی تائید سے مؤید ہوں۔

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جب تم نے اس سلسلہ کے مسائل کے علم کا احاطہ کرلیا تو پھر اس حقیقت کو اچھی طرح جان لو کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین کی بعثت کی اصلی غرض ومقصد تو عبادات کے طور طریقوں کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ اوّلاً بالذات یہی مقصد ہوتا ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ارتفاقاتِ صالحہ کے ساتھ رسوبات فاسدہ بھی مل جاتی ہیں۔ تو اب ضرورت ہوتی ہے کہ ان رسوماتِ فاسدہ کو مٹایا جائے اور ارتفاقات صالحہ کی جانب ترغیب دلائی جائے اور اس پر لوگوں کو برانگیختہ کیا جائے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان جو حدیث میں آتا ہے۔ بعثت لمحق المعارف (حجۃ اللہ ص۱۰۴ ج ۱) کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے کہ میں گانے بجانے والے آلات کو مٹا دوں یا جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (مشکوٰۃ ص۵۱۴) کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث فرمایا ہے تاکہ ردی اخلاق کو مٹا دوں اور عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔ امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اس بات کو اچھی طرح معلوم کرلو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اس بات میں نہیں ہے کہ ارتفاق ثانی وثالث کو مہمل چھوڑ دیا ہے اور نہ اس بات کا حکم حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دیا ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔ اسی لیے وہ لوگ انسانی سوسائٹی سے میل جول کو چھوڑ کر پہاڑوں کی جانب بھاگ نکلے اور خیر وشر یا نیکی وبدی میں انسانوں کے ساتھ میل جول بالکل ترک کردیا اور وحشی جانوروں کے ساتھ مشابہ ہو گئے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس شخص نے تبتل یا ترک دنیا کی اجازت طلب کی تھی، آپ نے اس سے ممانعت فرما دی اور یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رہبانیت دے کر نہیں بھیجا۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ملتِ حنیفیہ سمحہ جس کی بنیاد تعمق پر نہیں بلکہ وہ سہل اور آسان ہے) دے کر بھیجا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کو حکم دیا گیا ہے

کہ وہ ارتفاقات میں تعدیل پیدا کریں نہ تو ان ارتفاقات کو اتنا بڑھائیں کہ وہ خوش حالی اور رفاہیت میں متنعمین کے حال تک جا پہنچیں۔ جیسا کہ ملوک عجم کا حال ہے اور نہ ان ارتفاقات کو اتنا گھٹا دیں کہ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والوں کے حال تک اتر جائیں جو کہ بالکل وحشیوں کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں دو متعارض قیاس ہیں۔ ایک قیاس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ خوش حالی، آسودگی اور ترفہ اختیار کرنا اچھا ہے۔ اس لیے کہ اس سے انسان کا مزاج صحیح رہتا ہے اور اخلاق بھی ٹھیک و مستقیم رہتے ہیں اور وہ مقاصد بھی اس سے ظاہر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان تمام ابنائے جنس (تمام انواع حیوانات) سے ممتاز ہوتا ہے کیونکہ غباوت و کند ذہنی، درماندگی وغیرہ بے تدبیری سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے قیاس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ آسودگی، خوشحالی اور ترفہ قبیح ہے کیونکہ اس کو اختیار کرنے سے تنازعات اور کش مکش ضرور پیدا ہوگی اور شراکت بھی بہت سے امور میں اختیار کرنی پڑے گی اور مشقت و تھکاوٹ اور غیب کی جانب سے اعراض اور آخرت کے بارے میں تدبیر کو مہمل چھوڑ دینا وغیرہ پیدا ہوں گے۔ اس لیے پسندیدہ اور اچھی بات یہ ہے کہ متوسط حالت کو اختیار کیا جائے نہ ترفہ اور نہ تقشف بلکہ توسط اور ارتفاقات کو ان کی صحیح حالت پر قائم رکھا جائے اور ان ارتفاقات کے ساتھ اذکار کو شامل کیا جائے اور آداب کا پوری طرح لحاظ رکھا جائے اور اپنے اوقات میں سے کچھ نہ کچھ فرصت اور موقع تلاش کیا جائے۔ تاکہ عالم جبروت (عالم صفات جو مثال ملکوت سے بلند اور لاہوت سے کم ہوتا ہے) کی طرف انسان اپنی توجہ مبذول کر سکے۔

اور تمام انبیاء علیہم السلام جو بات اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بارے میں لائے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ قوم اور لوگوں کے حالات پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ قوم کے پاس جو بھی آداب کھانے، پینے، لباس، تعمیر، عمارات اور اقسام زینت اور نکاح

کرنے والوں کی سیرت اور بیع و شراء کے طریقے اور معاصی (جرائم) وغیرہ سے روکنے کے طریقے اور مقدمات و قضایا کے فیصلے وغیرہ کے بارے میں جو ان کے پاس موجود ہیں۔ اگر یہ رائے کلی یا مفاد عامہ کے مطابق ہیں اور اس پر منطبق ہیں، تو ان میں سے کسی چیز کے تبدیل کرنے کا کوئی معنی نہیں اور نہ اس کو چھوڑ کر کسی اور طریق کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ لازم اور ضروری ہے کہ قوم کو برانگیختہ اور آمادہ کیا جائے اور ان کو ترغیب دلائی جائے کہ وہ انہی چیزوں کو اختیار کریں جو ان کے پاس ہیں اور ان کی رائے کی تصویب کی جائے اور اس کے اندر جو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ ان کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے اور اگر یہ چیزیں رائے کلی پر منطبق نہ ہوں اور ضرورت پڑے کہ ان میں سے کسی شیٔ کو دوسری شیٔ کے ساتھ تبدیل کیا جائے یا کسی چیز کو محض مٹانے اور گمنام کرنے کی ضرورت ہو، کیونکہ وہ لوگوں کی اذیت کا باعث بنتی ہے کہ بعض، بعض سے اذیت و تکلیف پاتے ہیں یا اس لیے کہ دنیا کی زندگی کی لذات میں بہت تعمق اختیار کرنا پڑتا ہے یا احسان سے اعراض اختیار کرنا پڑتا ہے یا وہ چیز ایسی ہوتی ہے جو غم کو مٹانے والی اور دور کرنے والی اشیاء میں سے ہوتی ہے، کیونکہ ان میں پڑ کر دنیا اور آخرت کی مصالح کو بالکل فراموش کر بیٹھتے ہیں (کیونکہ ان چیزوں کی کثرت سے اکثر امر معاش اور معاد دونوں میں فساد پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ مزامیر یا گانے بجانے کے آلات کی کثرت استعمال شطرنج تاش وغیرہ کھیلنا، کبوتر بازی وغیرہ) تو ایسی صورت میں ان باتوں کو بدلنا ضروری ہوگا، تو اس تبدیلی میں حکمت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بالکل ایسی تبدیلی بھی مناسب نہیں جو ان لوگوں کے مالوفات سے بالکل مباین ہو، بلکہ اس کو اس طرح تبدیل کیا جائے کہ اس کی مثلاً کوئی نظیر ان کے پاس موجود ہو۔ یا پھر اگر ان کے پاس اس کی نظیر نہیں، تو ان لوگوں کے نزدیک جو لوگ نیکی کے ساتھ مشہور ہیں۔ اس کی نظیر موجود ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایسی تبدیلی ہو کہ ان کی عقلیں اس کے خلاف نہ ہوں، بلکہ وہ مطمئن ہو جائیں کہ

یہ برحق ہیں اور اسی وجہ سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین کے شرائع میں اختلاف ہوا ہے اور راسخین فی العلم جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں جو مختلف قوانین دربارہ نکاح، طلاق، معاملات، زینت، لباس، مقدمات کے فیصلے حدود اور اموالِ غنیمت کی تقسیم وغیرہ کے بارے میں واقع ہوئے. بالکل اسی طرح وارد نہیں ہوئے کہ ان لوگوں کو اس کا بالکل علم ہی نہ ہو جو قرآن و شریعت کے اولین مخاطب تھے یا جب ان احکام کا ان کو مکلف بنایا جائے تو انہیں ان کے بارے میں کسی قسم کا تردد یا شک واقع ہو، بلکہ فی الجملہ وہ لوگ ان چیزوں سے واقف تھے. ہاں! ان چیزوں میں سے کسی چیز کے اندر اگر کجی تھی. تو اس کو درست کیا گیا ہے اور جس چیز میں سقم تھا اس کو صحیح کیا گیا ہے. باقی چیزوں کو علی حالہ برقرار اسی طرح رکھا گیا ہے۔ دیکھیے ان لوگوں میں سود و ربٰوا کی بیماری عام پھیلی ہوئی تھی تو اس سے بالکل منع کر دیا گیا کیونکہ سود خواری میں لالچ، خود غرضی، سنگدلی حد سے زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ یکسر مفادِ عام کے خلاف ہے۔ اسی طرح پھلوں میں صلاحیت پیدا ہونے سے قبل بیع و شراء کا طریق رائج تھا۔ پھر جب آفات وغیرہ آتی تھیں، تو یہ لوگ آپس میں الجھتے تھے اور طرح طرح کی تنازعات و مخاصمات پیدا ہوتے تھے. اس وجہ سے حضور علیہ السلام نے اس قسم کی بیع و شراء سے منع کر دیا. اسی طرح دیت (خون بہا) عبدالمطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا جب مکہ کے چیف تھے اور فیصلے وغیرہ کرتے، تو اس دیت کو دس اونٹوں کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا. لیکن جب دیکھا گیا کہ لوگ قتل سے باز نہیں آتے، تو اس کی تعداد کو بڑھا کر انہوں نے سو اونٹ کر دیئے. تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دیت کو اسی طرح برقرار رکھا اور قسامہ کے مسئلے میں جب ابو طالب نے فیصلہ دیا کہ ایسے قتل کو رائیگاں نہیں چھوڑا جائے گا، بلکہ اس کی دیت مقرر کی جائے گی (کسی شخص کو کسی ایسی جگہ میں قتل کیا جائے. جس کے بارے میں معلوم نہ ہو سکے کہ کس

نے قتل کیا ہے تو اس کے قرب وجوار والے یا محلہ والے لوگوں میں سے پچاس آدمیوں کو منتخب کر کے قسمیں دلائی جائیں گی۔ وہ قسمیں اٹھائیں گے۔ واللہ نہ ہم نے قتل کیا ہے اور نہ ہمیں اس کا قاتل معلوم ہے۔ ایسی صورت میں قصاص تو موقوف ہو جائے گا اور دیت سو اونٹ ادا کرنی پڑے گی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں اس کو اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ اسی طرح اس دور میں جنگ وغارت کی نوبت آتی تھی۔ تو رئیس کو ربع یعنی چوتھا حصہ اس مالِ غنیمت میں سے لینے کا حق حاصل ہوتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔ اس کو قریب قریب اسی طرح رکھا۔ یعنی پانچواں حصہ خمس کا الگ کرتے، چار حصے مجاہدین پر تقسیم کرنے کا قانون مقرر کیا گیا۔ جیسا کہ سورہ انفال میں اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نازل فرمایا ہے۔ (اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الخ) اور ایران کے بادشاہ قباد اور اس کا بیٹا نوشیرواں نے لوگوں پر زمین کا خراج ولگان اور عشر مقرر کیا تھا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں اسی قسم کا خراج اور عشر مقرر کیا گیا ہے اور بنی اسرائیل زانیوں کو رجم وسنگسار کیا کرتے تھے چوروں کے ہاتھ کاٹتے تھے اور نفس کے بدلے نفس کو قصاص میں قتل کرتے تھے۔ تو قرآن کریم میں بھی یہی احکام اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے بھی نازل فرمائے۔ اس قسم کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں جو آدمی تتبع وتلاش کرے گا۔ اس پر پوشیدہ نہیں رہ سکتیں اسے بخوبی معلوم ہو جائیں گی بلکہ اگر تم زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والے ہو گے۔ احکام کے اطراف کا خوب احاطہ کرنے والے ہو گے۔ تو تم بخوبی اس بات کو جان لو گے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین عبادات کے سلسلہ میں کوئی ایسی بات نہیں لائے جو ان لوگوں کے پاس موجود نہ ہو یا اس کی نظیر موجود نہ ہو، بلکہ انبیاء علیہم السلام نے جاہلیت کی تحریفات کی نفی کی، تحریفات کا ازالہ کیا ہے اور ان کو مٹایا ہے اور عبادات

کے اوقات اور ارکان کے ذریعہ مبہم باتوں کو خوب منضبط کیا ہے اور جس چیز کی تشہیر نہیں تھی یا وہ گمنام تھیں، اس کی لوگوں کے درمیان خوب اشاعت کی۔

اقتصادی معاشی اور اجتماعی انقلاب کے بارے میں امام ولی اللہؒ کی تشریح

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں "اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ عجم (فارس والے مجوس) اور روم (روما الکبریٰ کے عیسائی لوگ) جب وہ حکومت کے وارث بنے۔ بہت سی قرون اور صدیوں تک حکومت چلاتے رہے اور دنیا کی لذات میں وہ ایسے منہمک ہوئے کہ آخرت کو انہوں نے یکسر فراموش کر دیا اور شیطان ان پر پوری طرح چھا گیا اور مسلط ہو گیا۔ تو انہوں نے معیشت کے مرافق یعنی منافع معیشت میں بہت تعمق اختیار کیا اور پھر وہ اس پر اترانے لگے اور فخر و مباہات میں مبتلا ہوئے اور ان کے پاس اطراف و جوانب سے حکماء آتے تھے اور منافع معیشت کی دقیق باتوں کا استنباط کرتے تھے اور یہ لوگ اس پر برابر عمل پیرا رہتے تھے اور ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور یہ سلسلہ اس قدر بڑھا کہ ان کے سرداروں میں سے کوئی سردار اگر ایسا کمربند (پٹکا) یا ایسا تاج سر پر رکھتا تھا جس کی قیمت ایک لاکھ درہم سے کم ہوتی تھی، تو اس پر عیب لگاتے تھے اور اُس کو عار دلاتے تھے اور ایسے سرداروں پر نکتہ چینی کرتے تھے عیب لگاتے تھے جن کے پاس بڑا محل اور عالی شان کوٹھی نہ ہو یا حمام نہلنے کے عمدہ تالاب نہ ہوں اور باغات نہ ہوں اور جن کے عمدہ گھوڑے اور خوبصورت غلام (نوکر چاکر) نہ ہوں اور جن کے لیے کھانے پینے میں خوب توسع نہ ہو اور لباس و پوشاک میں خوبصورتی نہ ہو۔"

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ "اس کا ذکر تو بہت دراز ہے جو کچھ تم اپنے ملک کے حکام اور ملوک کے حالات میں دیکھتے ہو۔ وہ تم کو ان روم و فارس کے ملوک کی

حکایات سے مستغنی بناتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے دور کے ملوک و حکام کے حالات بھی تقریباً ایسے ہی تھے۔ جیسے روم و فارس کے ملوک کے حالات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ یہ تمام تعیش کے اسباب اُن کے اصولِ معیشت میں داخل ہو چکے تھے اور یہ چیزیں ان کے دلوں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ بجز اس کے کہ اُن کے دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں، تو اس حالات سے ایک لا علاج بیماری ایسی پیدا ہو گئی جو ملک و تمدن کے تمام اعضاء میں سرایت کر گئی اور ایسی آفتِ عظیمہ پیدا ہو گئی۔ جس میں بازاروں میں رہنے والے اور سرسبز زمینوں کے باشندے، امیر و غریب، غنی و فقیر سب ہی مبتلا ہو گئے۔ کوئی بھی اس آفت سے بچ نہ سکا۔ ہر ایک پر مکمل طور پر یہ آفت چھا گئی۔ ہر ایک کے گریبان کو اُس نے پکڑ لیا اور ہر ایک کو اس کی ذات و نفس میں درماندہ و عاجز کر دیا اور اس پر اس قدر غموم و ہموم یعنی اندوہ و اندیشوں کو ابھار دیا جن کے کوئی اطراف نہیں یعنی غیر متناہی اندیشے پیدا کر دیے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام تعیش کے سامانوں کی تحصیل ممکن ہی نہیں، جب تک کہ اموالِ خطیرہ یعنی بے شمار اموال نہ خرچ کیے جائیں اور یہ اموال حاصل نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ کسانوں، تاجروں اور ان جیسے لوگوں پر بھاری ٹیکس نہ لگائے جائیں اور ان لوگوں کو تنگ نہ کیا جائے اور اگر وہ اس ٹیکس کے ادا کرنے سے رُک جائیں، تو لامحالہ ان کے خلاف جنگ و قتال ہو گی اور ان لوگوں کو سزا دی جائے گی اور اگر وہ لوگ اطاعت کریں گے اور خوشی سے ان ٹیکسوں کو ادا کریں گے، تو ان کو بالکل گدھوں اور گائے، بیل کی طرح بنا دیا جائے گا۔ جن کو پانی لگانے، لانے میں اور فصلوں کو کاٹنے، گاہنے میں استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی پرورش ہی اس لیے ہوتی ہے کہ ان سے ضرورتوں میں کام لیا جائے اور ایک گھڑی بھر بھی ان کو محنت و مشقت سے آرام نہ دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی آخری سعادت کی طرف سر بھی اٹھا کر نہ دیکھ سکیں اور لبا اوقات ایک وسیع ملک کے باشندے

ایسے ہوں گے کہ ان میں سے کسی کو بھی دین کی فکرمندی نہ ہوگی اور یہ بات بھی ہے کہ ایسے تعیش کے سامان کی تحصیل ممکن نہیں، بجز ایسے لوگوں کے جو اسی قسم کے کھانے لباس، عمارات وغیرہ کے ذریعے کمائی کریں گے اور اُن پیشوں کو ترک کر دیں گے جن پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے اور پھر عام لوگ جو ان ملوک وغیرہ کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔ وہ ان ہی صنادید یا سرداروں کی نقالی کریں گے۔ ان تمام اشیاء میں، ورنہ وہ ان کے نزدیک خوش بخت نہیں ہوں گے اور نہ اس کے بغیر یہ سردار لوگ ان کا کچھ خیال کریں گے اور اس عام لوگ خلیفہ اور حاکم اعلیٰ پر بوجھ بن جائیں گے۔ کچھ تو ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اس طرح اس سے مانگیں گے کہ وہ فوجی لوگ ہیں یا غازی ہیں اور کبھی یہ کہ وہ مدبر اور سیاستدان ہیں، ملک کے لیے کام کرتے ہیں اور وہ ان کی رسومات اختیار کریں گے اور اس سے موسوم ہوں گے اور اس سے مقصود صرف ضرورت کو پورا کرنا نہ ہوگا بلکہ اپنے بڑوں کی سیرت اور طریق کو قائم کرنا مقصد ہوگا اور کبھی مال حاصل کریں گے، اپنے آپ کو شاعروں کے زمرہ میں شامل کریں گے اور کہیں گے کہ ملوک وسلاطین کی عادت ہے کہ وہ ان شعراء کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے ہیں اور کبھی زہاد وفقراء کا لبادہ اوڑھ کر تحصیل مال کریں گے اور یہ بات ہوگی کہ خلیفہ اور حاکم وقت کے لیے یہ بات قبیح ہوگی کہ وہ ایسے زہاد وفقراء کی دیکھ بھال نہ کریں اور اس طرح بعض طبقے بعض کے لیے تنگی کا باعث بن جائیں گے اور ان لوگوں کے لیے کمائی کا پیشہ صرف ملوک کی صحبت وخوشامد ہی بن جائے گی۔ ملوک کے ساتھ خوش کلامی اور چاپلوسی اور خوشامد ہی ان کا وہ فن ہوگا، جس میں ان کے افکار بڑے عمق تک پہنچتے ہوں گے اور اسی طرح ان کے اوقات ایسی ہی باتوں میں ضائع ہوں گے اور جب ان اشغال کی کثرت ہوگی۔ تو ان لوگوں کے نفوس میں خسیس ہیئات متشکل ہو جائے گی اور یہ لوگ اخلاق فاضلہ سے روگردانی کرنے والے بن جائیں گے اور اگر تم اس بیماری کی حقیقت معلوم

کرنا چاہتے ہو، تو اس قوم اور ان لوگوں کی طرف دیکھو، جن میں کبھی خلافت و حکومت ہی رہی اور نہ کھانے پینے کے لذائذ میں انھوں نے تعمق اختیار کیا ہے اور نہ ہی لباس میں تکلف کیا ہے، تو تم دیکھو گے کہ ان میں سے ہر آدمی اپنے معاملہ میں آزاد اور خود مختار ہوگا اور نہ ان پر تو اس قسم کے بھاری بھر کم ٹیکس ہوں گے جو ان کی پشتوں کو بوجھل کر دیں تو ایسے لوگ یقیناً اپنے آپ کو ملی اور دینی امور کے لیے فارغ کر سکیں گے۔ پھر تم اس بات کا تصور کرو کہ اگر ان میں خلافت و حکومت، اور سرداران حکومت ہوں گے، تو یہ بہتر طریق پر رعیت کو مسخر کریں گے اور اچھے طریق پر ان پر مسلط ہوں گے۔ جب نزول قرآن اور آخر الزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آیا تو یہ تعیش و تنعم کی مصیبت بہت بڑی ہو گئی تھی اور یہ بیماری بہت شدید ہو گئی، تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر ناراض ہوا اور اس کے ملائکہ مقربین اور ملاء الاعلیٰ والے بھی اُن پر ناراض ہوئے، تو اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ اس بیماری کا علاج کیا جائے اور اس کے مادہ کو قطع کر دیا جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جس کا اختلاط عجمی اور رومیوں کے ساتھ نہیں تھا جس نے کبھی بھی ان کی رسومات کو اختیار نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو ایک میزان اور معیار بنایا، تاکہ اس کے ذریعے اچھی سیرت، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، اس کا امتیاز ہو سکے، اس سیرت سے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس نبی کی زبان سے اُن عجمیوں کی عادات قبیحہ کی مذمت کرائی اور ان کی دنیا کی زندگی میں انہماک و استغراق اور دنیا کی زندگی پر اطمینان کی قباحت اور برائی ظاہر کی اور اُس نبی کے قلب میں یہ بات ڈالی کہ وہ ان بڑی بڑی چیزوں کو جن کے یہ عجمی لوگ خوگر اور عادی بنے ہوئے ہیں۔ ان کو ان پر حرام قرار دے جن کے ذریعے وہ فخر و مباہات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ ریشم کا لباس، مقام قس میں تیار کردہ ابریشم، ارغوانی رنگ اور سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال اور مردوں

کے لیے سونے کا زیور اور ایسا لباس جس میں تصاویر بنی ہوئی ہوں اور گھروں کو فضول ٹیپ ٹاپ اور رنگین پردوں سے مزین کرنا وغیرہ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان عجمی و رومیوں کی دولت وسلطنت کو اس نبی کی دولت سے زائل کر دے اور ان کی سرداری اور ریاست اس کی سرداری اور ریاست سے زائل کر دے اور اس نے یہ فرمادیا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو کسریٰ اس کے بعد نہیں ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہوگا، تو کوئی قیصر اس کے بعد نہیں ہوگا۔

امام ولی اللہ فرماتے ہیں " خوب جان لو! کہ جاہلیت کے دور کے لوگ ایسے مناقشات اور جھگڑوں میں مبتلا تھے جنہوں نے لوگوں کو تنگ کر دیا تھا اور ان پر بڑی دشواری پیدا کر دی تھی اور اس کا زوال ممکن نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ اس کی جڑ ہی کاٹ دی جائے۔ مثلاً مقتولوں کا قصاص اس طرح تھا کہ ایک انسان دوسروں کو قتل کرتا تھا تو ولی مقتول قاتل کے بھائی یا بیٹے کو قتل کر دیتا تھا اور وہ پلٹ کر اُن میں سے کسی دوسرے کو قتل کر دیتا تھا اور یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہتا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا علاج اس طرح کیا کہ آپ نے فرمایا کہ جو خون جاہلیت کے زمانہ میں ہو چکے ہیں۔ اُن کو آج اللہ تعالیٰ نے میرے پاؤں کے نیچے پامال کر دیا ہے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان میں مقتول ربیعہ کا خون موقوف کرتا ہوں اور جیسا کہ وراثت کے معاملہ میں رؤساء جاہلیت کا طرز عمل یکساں نہیں تھا۔ وہ سردار وراثت کے معاملہ میں مختلف قسم کے فیصلے کرتے تھے اور اسی طرح لوگ دوسروں کے حق چھیننے سے نہیں رکتے تھے اور سود کے کاروبار سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ ایک زمانہ اسی طرح گزرتا تھا۔ دوسرے دور میں بعد والے ان پہلوں کے معاملات سے دلیل پکڑتے تھے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے منازعات و مناقشات کو اس طرح ختم کیا کہ آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو اسلام کا دور پالے گا۔ اس کی تقسیم قرآن کے حکم کے

مطابق ہوگی اور جو چیز ایسی ہے کہ جاہلیت کے دور میں وہ تقسیم کی گئی ہے اور کسی آدمی نے اس چیز کو کسی نہ کسی طرح اپنی ملکیت وقبضہ میں کیا ہے، تو اس کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کو نہیں توڑا جائے گا اور سود کا معاملہ بھی اسی طرح تھا کہ ایک شخص کسی دوسرے کو مال بطور قرض دیتا تھا اور اس پر زیادتی اور منافع کی شرط لگاتا تھا۔ پھر اس پر سختی کرتا تھا کہ اگر وہ میعاد پر ادا نہ کر سکا۔ تو اصل اور منافع ملا کر اصل بنا دیا جاتا تھا اور اس پر اور منافع مقرر کر دیا جاتا تھا اور یہ معاملہ اسی طرح آگے چلتا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ بہت سا مال بن جاتا تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ربوٰ کو موقوف کر دیا۔ صرف رأس المال یعنی اصل مال کو واپس کرنے کا حکم دیا اور منافع کو بالکل ختم کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (البقرہ) نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا یہ اور اس قسم کی باتیں تھیں۔ جن کو لوگ کبھی بھی ترک کرنے پر تیار نہ ہوتے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ نہ ہوتی۔"

یہ تو بڑی بڑی باتیں ہیں۔ بعض اوقات اس سے کم تر درجہ کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ جن میں مناقشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے بھی آپ نے دستور مقرر کیا ہے امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ

"خوب جان لو! بسا اوقات ایک رسم و دستور مقرر کیا جاتا ہے، تاکہ لوگوں کے دلوں میں اور سینوں میں جو کینہ وغیرہ پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس کو قطع کرنے کے لیے ایسا دستور مقرر کیا جاتا ہے۔ جیسا مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے مشروب کی باری، داہنے طرف والے کو دی جاتی ہے، کیونکہ بعض اوقات لوگ جھگڑالو قسم کے ہوتے ہیں اور وہ ضد سے کام لیتے ہیں اور وہ کسی دوسرے کی برتری یا فضیلت ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ابتداء کس سے کی جائے۔ لہذا یہ جھگڑا ختم نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے دائیں طرف والے کے حق کو مقدم مانا جائے۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو اور جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا جو کسی دوسرے کی عملداری میں جاتا ہے، تو اس کے مصلے پر بغیر اس کی اجازت کے نماز نہ پڑھائے۔ نماز پڑھانے کا حق اسی کا ہے اور جیسا کہ سواری پر بیٹھنے کے لیے سواری والے کے حق کو ہی مقدم رکھا گیا ہے کہ وہی اگلی سیٹ پر بیٹھے وغیرہ۔"

(حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۸ تا ۱۱۲)

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور ان کی معیشت زمین میں مقرر فرمادی اور مخلوق کو اجازت دی کہ وہ زمین کی اشیاء سے فائدہ اٹھائیں تو اس سلسلہ میں ان کے درمیان حرص و بخل اور تنازع واقع ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم اس وقت یہ ہوا کہ ایک انسان کی مزاحمت دوسرے کے ساتھ اس کی مخصوص چیزیں حرام قرار دی گئی۔ کیونکہ اس چیز پر اس کا قبضہ پہلے سے قائم ہے اور اس کا تسلط اور قبضہ نہیں تو اس کے مورث کا قبضہ اس پر موجود ہے یا اس کا تسلط اس چیز پر کسی نہ کسی وجہ سے قائم ہے۔ جس کو وہ اپنے نزدیک قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ اس لیے کسی دوسرے شخص کی مزاحمت اس چیز میں روا نہیں ہو سکتی۔ سوائے تبادلہ کے یا باہم رضامندی کے ایسی رضامندی جس کو وہ جانتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا تدلیس بھی نہ ہو اور نیز یہ بات بھی ہے کہ انسان بالطبع متمدن اور اجتماعیت پسند واقع ہوئے ہیں اسی لیے ان کی معیشت سوائے ایک دوسرے کے تعاون کے درست نہیں رہ سکتی۔ اس لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس تعاون کے واجب ہونے کا فیصلہ نازل ہوا ہے کہ یہ تعاون لازم اور واجب ہے۔ نیز یہ بھی کہ ہر ایسا شخص جس کو اس تمدن میں دخل ہے، وہ اس سے خالی نہ رہے۔ ہر شخص کو اس تعاون میں حصہ لینا چاہیے۔ ہاں اگر کوئی ایسی مجبوری لاحق ہو جائے جس کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکے، تو پھر قابلِ مواخذہ نہ ہوگا اور نیز یہ بات بھی ہے کہ ملکیت میں داخل ہونے کا اصل سبب مباح اموال کو جمع کرنا ہوتا ہے۔ یعنی ایسے اموال جو ہر ایک کے لیے ان کی تحصیل مباح اور جائز ہے یا پھر سبب

ملک وہ مال ہوگا جو مخصوص ہے۔ اس کے ہاتھ کے ساتھ یعنی اس کے قبضہ و تصرف میں ہے اور وہ اس کو بڑھانا چاہتا ہے مباح چیزوں کی مدد سے جیسے کہ جانوروں کی تولید و تناسل سے افزائش مال حاصل کی جاتی ہے چراگاہوں وغیرہ میں چرا کر۔ یہ افزائش بھی اس کی ملکیت کے اسباب میں داخل ہے یا جیسے زمین کی زراعت ہے جو زمین کی اصلاح سے اور پانی کی سیرابی کی وجہ سے حاصل کی جاتی ہے اور ان تمام باتوں میں شرط یہ ہے کہ بعض بعض کے لیے تنگی اور ضرر رسانی کا باعث نہ ہوں جس کے نتیجے میں تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ مال کی افزائش جب تک کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ ہو بہت مشکل ہے۔ ملک و شہر میں اس مال کا حصول تعاون کے بغیر بہت دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً جو شخص تجارت کا مال دوسری جگہ سے ایک شہر میں لاتا ہے اور پوری کوشش کرتا ہے کہ تجارتی قافلوں سے لیا ہوا مال بر وقت حاصل ہو اور اس کو لوگوں تک پہنچایا جا سکے یا وہ آدمی دلالی کا کام کرتا ہے یا لوگوں کے لیے مال کی اصلاح کرتا ہے اچھی صفت کے ساتھ یعنی کانٹ چھانٹ رنگ روغن گلیٹ وغیرہ کے ذریعہ اس قسم کی باتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے تعاون پر موقوف ہیں، لیکن اگر یہ مالی افزائش ایسی ہے کہ اس میں تعاون کا دخل نہیں جیسا کہ جوا اور قمار میں ہوتا ہے یا رضا تو ہے، لیکن ایسی رضا جو دباؤ اور دھاندلی کے مشابہ ہو، جیسا کہ سود میں ہوتا ہے۔ کیونکہ مفلس آدمی مجبور ہوتا ہے کہ وہ ایسی شرط کا التزام کرے جس کے پورا کرنے پر وہ قادر نہیں ہوتا اور اس کی رضا حقیقت میں رضا بھی نہیں ہوتی، تو یہ ان عقود میں سے نہیں ہوگی جو پسندیدہ (عقل اور شرع کے نزدیک) ہیں اور نہ ایسی ملکیت اسباب صالحہ میں شمار ہوگی بلکہ سراسر باطل اور حرام ہے۔ اجتماعی اور تمدنی اصول کے مطابق یہ گناہ اور سخط ہے۔

اسباب معیشت کی تحصیل کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان (مَنْ اَحْیٰی اَرْضاً مَیْتَۃً فَھِیَ لَہٗ۔ کہ جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہوگی۔

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں اس میں اصل یہ ہے جس طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اصل میں تو سب اللہ تعالیٰ کا مال ہے حقیقت میں اس کے اندر کسی کا حق نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے زمین سے انتفاع اور استفادہ جائز قرار دیا ہے۔ زمین سے بھی اور جو کچھ زمین میں جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں سے بھی۔ لیکن اس سے استفادہ کرنے کے وقت ایک دوسرے کے ساتھ بخل وحرص اور خودغرضی جیسی باتیں لاحق ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس بارے میں حکم یہ ہے کہ جس شخص کا ہاتھ اس چیز تک پہلے پہنچا ہے اور وہ بھی کسی کو ضرر پہنچا کر نہیں تو ایسے شخص سے اس چیز کو نہ چھینا جائے، بلکہ اسی کو اس سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔ پس بنجر زمین آباد شہروں یا اس کے اطراف میں نہیں، بلکہ دور دراز جگہوں میں جب کوئی شخص اس کو آباد کرے گا تو اس کا ہاتھ اس کی طرف سبقت کر گیا ہے یعنی اس کا قبضہ اسے حاصل ہے بغیر کسی کو تکلیف پہنچائے۔ تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ اس شخص کو اس زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا اور زمین تو ساری کی ساری حقیقت میں بمنزلہ مسجد یا سرائے کے ہے جس کو مسافروں کے لیے وقف کیا گیا ہے اور یہ سب اس میں شریک ہیں تو اب جو پہلے اس پر قابض ہوگا اور انسان کے حق میں ملکیت کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے فائدہ حاصل کرے۔ (حجۃ اللہ ص ۲۹۵)

امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ خوب اچھی طرح جان لو کہ جب کسی جگہ دس ہزار انسان اکٹھے ہو جائیں مثلاً کسی شہر یا قصبہ میں، تو سیاست مدینہ (ملکی اور شہری سیاست و اجتماعیت) ان لوگوں کے پیشوں کے بارہ میں بحث کرے گی اور ان پیشوں میں توازن برقرار رکھنا ایک ضروری امر ہوگا۔ پس اگر ان میں اکثر لوگ صنعت و حرفت کے پیشے اختیار کریں گے یا ملکی سیاست کے پیشہ کو اختیار کریں گے اور تھوڑے لوگ ان میں سے جانوروں کی افزائش ان کا چرانا وغیرہ کا پیشہ یا زراعت کا پیشہ اختیار کریں گے تو ان

لوگوں کا حال دنیا میں بگڑ جائے گا اور فاسد ہوگا اور اگر یہ لوگ شراب وغیرہ کی کشید، خرید و فروخت کا پیشہ اختیار کریں گے یا اصنام (سٹیچو) وغیرہ کا پیشہ اختیار کریں گے تو یہ چیز عام لوگوں کے لیے ان کے استعمال کرنے کی ترغیب ہوگی جس قدر بھی ان چیزوں کی اشاعت ان کے درمیان ہوگی تو یہ چیز ان لوگوں کے لیے دین میں ہلاکت کا باعث ہوگی لیکن اگر ان پیشوں اور یہ پیشے اختیار کرنے والوں کو اس طریق پر تقسیم کیا جائے گا جس حکمت و مصلحت کا تقاضا ہے اور ان لوگوں کے ہاتھوں کو پکڑ لیا جائے گا اور روکا جائے گا جو قبیح اور مُضر پیشے اختیار کرتے ہیں تو یقینی بات ہے کہ ان کی حالت درست رہے گی اور اسی طرح شہروں اور ملکوں کا فساد اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ان ملکوں اور شہروں کے بڑے لوگ رغبت دلاتے ہیں کہ باریک اور نفیس ترین زیورات بنائے جائیں اور اسی طرح لباس بھی بہت دقت اور تکلف سے بنایا جائے اور عمارات اور مکانات میں بھی بے حد زیبائش اور آرائش اختیار کی جائے اور اسی طرح خوراک میں بھی غایت درجہ کا تکلف اور عورتوں کے سلسلہ میں بھی بہت ہی حسین و جمیل نازک اندام عورتوں کی تلاش کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں اس تقاضے سے زائد ہوتی تھیں جس کو ارتفاقات ضروریہ چاہتے ہیں جن کا ہونا لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے اور جن پر عرب و عجم کے لوگوں کا اتفاق ہے اور پھر لوگ امور طبیعہ میں ایسا تصرف کرتے ہیں تاکہ ان کی شہوات اور خواہشات پوری ہو سکیں۔ پھر کچھ لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں چھوکریوں کو گانے رقص اور متناسب حرکات لذیذہ کی تعلیم دیتے ہیں اور کچھ لوگ دل خوش کُن الوان کپڑوں میں لگاتے ہیں اور کچھ لوگ حیوانات کی تصاویر اور اشجار عجیبہ اور نادر خطوط و لکیریں وغیرہ ان کپڑوں میں ڈالتے رہتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ عجیب و غریب عمدہ و نادر صنعت۔ سونے اور گراں قدر جواہر وغیرہ میں اختیار کرتے ہیں اور کچھ لوگ بلند سے بلند عمارتیں اور مکانات تعمیر کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور ان میں حیرت انگیز

نشانات اور تصاویر بناتے ہیں جب لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان پیشوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اسی مقدار کے مطابق وہ زراعت، تجارت وغیرہ کے ضروری پیشوں کو مہمل اور بے کار چھوڑ دیتے ہیں اور جب ملک وشہر کے بڑے لوگ انہیں چیزوں میں اموال خرچ کرتے ہیں۔ اتنی ہی مقدار میں ملک کی مصلحتوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ چیز ان لوگوں کے لیے باعث ضیق وتنگی ہوتی ہے جو ضروری پیشوں کو قائم کرنے والے ہوتے ہیں جیسے کسان، تاجر، صناع اور کاری گر اور ان پر ٹیکس بھی دگنے ہو جاتے ہیں اور یہ بات ملک وتمدن کے لیے شدید نقصان کا باعث ہے اور یہ بیماری ایک عضو سے دوسرے عضو کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ سب ہی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ داء الکلب کی بیماری کی طرح اس کے مریض کے بدن کے جوڑ جوڑ میں سرایت کرتی ہے اور یہ ضرر ان لوگوں کا باعتبار دنیا کے ہے اور باعتبار کمال اخروی کی طرف خروج کے جو ضرر اور نقصان ہے۔ اس کے بیان کی حاجت نہیں، وہ خود عیاں ہے اور یہ ضرر عجم کے ملکوں اور شہروں میں پوری طرح چھا گیا تھا اور ان پر غالب آ گیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اس بیماری کا علاج کریں۔ اس کے مادہ کو بیخ وجڑ سے کاٹ دیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس غالب مظان یعنی مواقع ومحل کی طرف نظر فرمائی جیسے کہ گانے بجانے والی لونڈیاں ابریشم، قسی اور سونے کا متقاضلاً یعنی کمی بیشی سے بیچنا زیورات وغیرہ ڈھالنے کے لیے اور اس کی مختلف قسمیں تیار کرنے کے لیے تو ان سب سے آپ نے منع فرمایا اور ان چیزوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ (حجۃ اللہ ص ۲۹۵)

امام ولی اللہ کے پیش کردہ تمام اجتماعیت واقتصادیات، معاشیات یا نظام اخلاق وسیاسیات سب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شاہ صاحبؒ کے تمام فلسفہ کو پیش نظر رکھا جائے۔ صرف بعض چیزوں کو اختیار کر لینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ

نے تمام انبیاء کرام کے آسمانی شرائع کو بالعموم اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم اور حضور کی سنت ثابتہ اور اجتماعیات و سیاسیات میں خلفائے راشدین کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور اس پورے نظام کو شاہ صاحبؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب ازالۃ الخفاء۔ الخیر الکثیر۔ بدور بازغہ اور حجۃ اللہ البالغہ میں سمجھایا ہے امام ولی اللہؒ نے سب سے مکمل طریق پر تمام نظام حجۃ اللہ میں پیش کیا ہے۔ پہلے شاہ صاحبؒ اپنا فلسفہ سمجھاتے ہیں جس کو ہم فلسفہ ولی اللّٰہی یا حکمت ولی اللّٰہی سے تعبیر کر سکتے ہیں، چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کا پہلا حصہ اس پر مشتمل ہے۔ اس میں شاہ صاحبؒ نے ربط الحادث بالقدیم۔ ابداع وغیرہ سے لے کر انسانی حیات کے احکام جس میں اجتہاد و استنباط تک کے جزئی جزئی مسائل بھی آجاتے ہیں پیش کیا ہے۔ کائنات میں انسان کی حیثیت کو متعین کیا ہے اور انسانی فطرت کے اصلی تقاضے اور انسان کا مکلف ہونا اور تکلیف کے ساتھ جزائے عمل کا لازم ہونا اعمال و جزا کی حقیقت اور اعمال و اخلاق کی بنیاد۔ دار العمل اور دار الجزا دونوں جگہ مجازات کی کیفیت دار العمل برزخ اور حشر کا تسلسل، سعادت حقیقی کیا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے۔ بر و اثم کی حقیقت اور اس کی طویل ترین بحث اور انسانی حیات پر بر و اثم کے اثرات وغیرہ وغیرہ ملی سیاست اور انسانوں کا انبیاء علیہم السلام کی طرف محتاج ہونے کا فلسفہ، نبوت کی بحث۔ دین کی وحدت اور اصلیت کا بیان اور شرائع کا خاص ہونا۔ ایک خاص مبحث شاہ صاحبؒ ارتفاقات کا بیان کرتے ہیں جس میں انسان کی تمام طبعی فطری ضروریات لوازمات اور اقتصادی معاشی سیاسی اور عالمی مسائل و تدابیر کا ذکر کرتے ہیں جس میں انفرادیت سے نظام حکومت اور پھر بین الاقوامیت کی تشریح کرتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کی حکمت و فلسفہ کو سمجھنے سے پہلے ان باتوں کو پیشِ نظر رکھیں کہ انسان تمام دقیق اور لطیف چیزیں بغیر استاذ و معلم کے نہیں سیکھ سکتے۔ ہر فن میں کامل بننے کے لیے استاذ کامل کی ضرورت پڑتی ہے۔

ولما كان الحدادة والتجارة وامثالهما لا يتأتى من جمهور الناس الا بسنن مأثورة عن اسلافهم فما ظنك بهذه المطالب الشريفة التي لا يهتدى اليها الا الموفقون و من هذا الباب يعلم شدة الحاجة الى الانبياء ووجوب اتباع سننهم والاشتغال باحاديثهم (حجة الله منه)

اور جب ایک لوہار کا کام یا تجارۃ یا اس جیسے دوسرے کاروبار اور پیشے وغیرہ عام لوگ حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنے اسلاف کے بتلائے ہوئے طریقوں پر نہ چلیں کوئی شخص بھی اس کے بغیر نہ ماہر ہو سکتا ہے نہ کامل تو ایسے مطالب شریفہ (وہ باریک دقیق اور گہری باتیں جو ذات وصفات. لاہوت وجبروت ملکوت و عالم مثال کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور تمام مابعد الطبیعات (میٹا فیزکس) کا سلسلہ اس کے ساتھ وابستہ ہے) جن تک خاص وہ لوگ رسائی رکھتے ہیں جن کو توفیق ہوتی ہے تو ایسی باتیں بغیر استاد ومعلم و بغیر تربیت کرنے والے مربی کے کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ نوع انسانی انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی کے شدید محتاج ہیں، اور ان کا اتباع اور ان کی باتوں سے اشتغال رکھنے میں ہی انسانوں کی فلاح وکامیابی ہے۔

امام ولی اللہؒ کے بتلائے ہوئے پروگرام میں مندرجہ ذیل باتوں کو بطور اصول موضوعہ ملحوظ رکھنا چاہیے!

(۱) واعلم ان النفس ـــــ

اس بات کو خوب ذہن میں بٹھا لو کہ انسان

مجبولة على اتباعها الشهوات لا تزال على ذلك الا ان يقهرها نور الايمان۔
(حجة الله البالغه ص۲۹۱)

کا نفس پیدا ہی اتباعِ شہوات پر کیا گیا ہے یعنی طبعی طور پر ہی انسان کا نفس خواہشات و شہوات کی طرف میلان رکھتا اور وہ برابر اسی پر رہتا جب تک نور ایمان اس کو مقہور و مغلوب نہ کر دے۔

(۲) اعلموا ان من اعظم مقاصد التي قصدت ببعثة الانبياء عليهم السلام دفع المظالم من بين الناس فان تظالمهم يفسد حالهم و يضيق عليهم۔
(حجة الله البالغه ص۳۳)

اچھی طرح جان لو کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بڑے مقاصد میں یہ بات بھی ہے کہ لوگوں کے درمیان سے ظلم و بے انصافی کو ہٹایا جائے، کیونکہ لوگوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا ایسا ہے اس سے ان کا حال بگڑ جاتا ہے اور وہ تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

(۳) فاعلموا ان اصل بعثة الانبياء وان كان لتعليم وجوه العبادات اوّلاً و بالذات لكنه قد ينضم مع ذالك ارادة اخمال الرسوم الفاسدة والحث على وجوه الارتفاقات و ذالك قوله صلى الله عليه وسلم بعثت لمحق المعازف وقوله

اچھی طرح معلوم کر لو کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی اصلی غرض لوگوں کو عبادات کے طور طریقے بتلانا ہوتا ہے اوّلاً و بالذات یہی مقصد ہوتا ہے، لیکن کبھی اس کے ساتھ بعثت کے مقصد میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ رسومات فاسدہ کو مٹایا جائے اور ارتفاقاتِ صحیحہ کی ترغیب دلائی جائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے مبعوث

علیہ الصلوٰۃ والسلام بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۹)	فرمایا گیا ہے کہ میں گانے بجانے کے آلات کو مٹا دوں اور آپ کا یہ فرمان کہ مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

امام ولی اللہؒ نے خواب میں اپنے آپ کو قائم الزمان کی شکل میں دیکھا یعنی ایک ایسی ہستی کہ جب اللہ تعالیٰ کسی نظامِ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو اپنی مراد کے پورا کرنے کے لیے جارحہ اور آلہ بنا لیتا ہے۔ پھر شاہ صاحبؒ نے دیکھا کہ کفار کا حاکم غالب آ گیا ہے اور اہلِ اسلام سے ان کے ملک، اموال چھین لیے ہیں۔ ان کی اولادوں کو غلام بنا لیا ہے اور اجمیر جیسے شہر میں کفر کے شعائر کو ظاہر کیا ہے اور اسلام کے شعائر کو باطل کر دیا ہے۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اہلِ ارض پر ہو رہا ہے اور اس غضب کی صورت شاہ صاحبؒ کو ملاء اعلیٰ میں دکھائی جاتی ہے۔ پھر شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں بھی اس غضب سے بھر جاتا ہوں۔ میں اس وقت اپنے آپ کو مختلف لوگوں کے جمِ غفیر میں دیکھتا ہوں، جن میں عرب، رومی اور ترک سب شامل ہیں۔ ان میں بعض سوار ہیں، بعض پیدل ان میں اونٹوں والے بھی ہیں اور گھوڑوں والے جیسا کہ عرفات میں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ وہ تمام لوگ بھی غضب سے بھرے ہوئے ہیں۔ میرے غضب کی وجہ سے پھر ان لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ

(۴) ماذا حکم اللہ تعالیٰ فی ھٰذہ الساعۃ قلت فک کل نظام	کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم و فیصلہ کیا ہے تو میں نے کہا کہ تمام نظاموں کو توڑنے کا فیصلہ کیا ہے (قرآن کے نظام کے علاوہ تمام نظاموں کو توڑ کر درہم برہم کر دیا جائے)۔

پھر اس کے بعد جنگ اور لڑائی ہوئی۔ شاہ صاحبؒ اس جنگ کی قیادت کر رہے

ہیں اور وہ دوسرے لوگ آپ کی اتباع کرتے ہیں. شہروں کی بربادی ویرانی ہوتی چلی جارہی ہے. یہاں تک کہ اجمیر تک پہنچتے ہیں اور اس حاکم کفار پر غلبہ پاتے ہیں اور اس کی مکمل مغلوبیت پر رحمتِ الٰہی نازل ہوتی ہے اور سکون واطمینان پیدا ہوتا ہے!
شاہ صاحبؒ نے یہ خواب شب جمعہ ۲۱ ذلیقعدہ ۱۱۴۴ھ میں دیکھا تھا۔

(فیوض الحرمین ص ۲۷۰)

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ارتفاق ثانی وثالث کو ترک کرنے کا کسی نبی نے حکم نہیں دیا ارتفاقِ اول کا تو پہلے ذکر ہوچکا ہے. اس سے تو کوئی فردِ بشر اور نوع حیوانات کا بھی کوئی فرد خالی نہیں رہ سکتا۔ ارتفاق ثانی میں سب سے پہلے آداب معاش آتے ہیں. امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ارتفاقِ ثانی کے تمام مسائل کو ایک تجربہ صحیحہ پر اور دوسرا اخلاق فاضلہ پر پیش کیا جائے گا جو ان کے مطابق ہوں گے، ان کو اختیار کیا جائے گا اور جو اس معیار پر پورا نہیں اتریں گے. ان کو ترک کر دیا جائے گا. آدابِ معاش میں تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل آتے ہیں۔ پھر تدبیر منزل کے چاروں قوانین نکاح شادی۔ اولاد کی تربیت و پرورش. مالکیت ومملوکیت کے احکام صحبت و رفاقت کے اصول اور معاملات میں تبادلہ اشیاء اور اس کے اصول اور اکساب وپیشے صحیح پیشوں کو اختیار کرنا اور غلط پیشوں سے اجتناب یہ سب ارتفاقِ ثانی سے تعلق رکھتے ہیں. ارتفاق ثالث میں سیاستِ مدینہ یعنی اجتماعی نظام جو ملک وشہروں سے تعلق رکھتا ہے۔ نظام حکومت کا قیام اور اجتماعی خرابیوں کی اصلاح وعلاج. محکموں کی تفصیلات اور پھر حاکمِ اعلیٰ کی سیرت و کردار وشرائط وغیرہ ارکانِ حکومت کے شرائط وتربیت کی تفصیلات یہ اسی ارتفاق ثالث کا حصہ ہے ارتفاق رابع خلیفۃ الخلفاء کی ضرورت اس کے کام شرائط وغیرہ۔ ایک ایسی سوپر طاقت جو تمام ماتحت حکومتوں پر کنٹرول کرسکے اور ان کو ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی سے باز رکھ سکے۔

واللہ اعلم بالصواب

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیّدنا مولانا محمد وعلیٰ الہ

واصحابہ واتباعہ اجمعین

برحمتك یا ارحم الراحمین

احقر عبدالحمید سواتی

خادم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۲۹ رجب سنہ ۱۴۱۰ھ

۲۶ فروری سنہ ۱۹۹۰ء

احکام حج

مع زیارات مكة المكرمة ومدينة المنورة

تالیف : محمد فیاض خان سواتی

اس کتاب میں حج کی تمام اقسام، تمتع، افراد، قران اور بدل کے ضروری مسائل واحکام قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں تحریر کیے گئے ہیں، حج کی ادائیگی کا طریقہ نہایت سہل انداز میں سمجھانے کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزوں کو نقشوں کے ذریعے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں موجود زیارات کا محل وقوع اور تاریخی پس منظر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، اس لحاظ سے حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے والے خواتین وحضرات کیلئے یہ ایک بہترین علمی تحفہ ہے جو ان کیلئے سفر حج میں ایک اچھا راہنما ثابت ہوسکتا ہے۔

(صفحات ۱۲۸ / قیمت ۲۵ روپے)

ناشر O مکتبہ حمیدیہ، فاروق گنج گوجرانوالہ

اجوبہ اربعین

☆ ردروافض وتشیع ☆

(ازحضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند)

حضرت نانوتویؒ کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت کیلئے کافی ہے کہ کتاب علوم ومعارف، حقائق ودقائق کا مجموعہ ہے، اجوبہ اربعین میں حضرت نانوتویؒ کے علوم وفیوض، مناظرانہ وتنقیدانہ مضامین کا وقیع سرمایہ ہے، یہ کتاب اہل رفض وتشیع کے رد میں ہے، اس کتاب میں اہل رفض وتشیع کی طرف سے اہل السنۃ والجماعۃ پر کیے گئے چالیس اعتراضات کے عقلی ونقلی طور پر دندان شکن اور مسکت جوابات دیئے گئے ہیں، اس کتاب کے دو حصے ہیں۔

حصہ اول میں اٹھائیس اعتراضات کے جوابات ہیں جو حضرت نانوتویؒ نے ایک دن رات میں مکمل کیے، اس حصہ میں حضرت کے ساتھ حضرت کے داماد مولانا عبداللہ انصاریؒ سابق ناظم شعبہ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی بھی شریک تھے، ہر سوال کا ایک ایک جواب ان کا بھی ساتھ شامل ہے۔

حصہ دوم بارہ اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے اور یہ صرف حضرت نانوتویؒ کے قلم حق رقم کا مرہون منت ہے، اس میں دقت نظر، زیرکی، عمیق حقائق ومعارف لطائف وظرائف کا گنج گراں مایہ موجود ہے، حضرت نے اس حصہ میں متعہ کا مسئلہ، فدک، وراثت نبیؐ جیسے اہم مسائل کے علاوہ مسئلہ حیات النبیؐ پر بھی روشنی ڈالی ہے، یہ حصہ زیادہ دقیق اور مشکل اور بہت سے اہم علمی نکات پر مشتمل ہے۔

الحمد للہ ادارہ نے اس کتاب کو نہایت محنت کے ساتھ کتاب میں سرخیاں، حوالہ جات کے ماخذ، پیرے اور متعدد جگہ حواشی، عمدہ کتابت، اعلیٰ طباعت ومعیاری جلد بندی کے ساتھ طبع کرایا ہے، کتاب کے شروع میں فہرست مضامین اور مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ فاضل دارالعلوم دیوبند و بانی مدرسہ نصرت العلوم جامع مسجد نور گوجرانوالہ کا ۲۶ صفحات پر مشتمل مفید مقدمہ بھی لگا دیا گیا ہے، طبع دوم کی قیمت ۹۰ روپے ہے۔

ناشر ○ ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرت العلوم، فاروق گنج گوجرانوالہ

اَلطافُ القُدس فی معرفتہ لطائِف النفس (فارسی)

مولف : حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ

مترجم : حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ

یہ کتاب حکیم الامت امام ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فلسفہ (حکمت ولی اللّٰہی) کی اہم ترین کتاب ہے، فلسفہ ولی اللّٰہی کو سمجھنے کیلئے خود امام ولی اللہؒ نے بعض بنیادی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ان میں سے الطاف القدس بھی ہے اس میں امام موصوف نے علم حقائق اور سلوک کی اہم اور بنیادی اصطلاحات کو بہترین طریق پر ذہن نشین کرایا ہے، روح، عقل، نفس، سر خفی، اخفی، انا، حجر بہت اور سینکڑوں ضمنی اصطلاحات ومباحث بیان کئے ہیں۔ یہ وہ اصطلاحات ہیں کہ حقائق ومعارف سے بحث کرنے والے ان کے معلوم کرنے کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں رکھ سکتے اور انکے جان لینے کے بعد انکی تہذیب اور شائستگی کے طریق کو ایسے انداز میں شاہ صاحبؒ نے پیش کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے الغرض یہ کتاب بالعموم سلوک وتصوف اور حقائق ومعارف کو سمجھنے والوں کیلئے ہے اور بالخصوص فلسفہ ولی اللّٰہی سے لگاؤ اور دلچسپی رکھنے والے لوگوں کیلئے گرانقدر اور بیش بہا تحفہ ہے۔ اصل کتاب فارسی زبان میں ہے، عوام اہل علم کے استفادہ کیلئے اصل کتاب کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی بانی مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ نے عام فہم ترجمہ بھی کر دیا ہے، کتاب کی خوبی اور ترجمہ کا فائدہ مطالعہ کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

ضخامت ۲۶۸ صفحات، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت اعلیٰ، قیمت/۴۵ روپے

ناشر ○ ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرت العلوم، فاروق گنج گوجرانوالہ